اور لائن کٹ گئی!

کوثر نیازی

....اور لائن کٹ گئی!

کوثر نیازی

احمد پبلی کیشنز، لاہور

پہلا ایڈیشن: فروری 1987ء
احمد پبلی کیشنز سے باردوم: اپریل 2007ء
ٹائٹل ڈیزائن: سید سلمان حسن
پرنٹرز: حاجی حنیف پرنٹرز
قیمت: =/250 روپے

احمد پبلی کیشنز کی کتب دستیاب ہیں

مشتاق بک کارنر، اُردو بازار لاہور۔فون:7230350
علم و عرفان، اُردو بازار لاہور۔فون:7352332
نگارشات، مزنگ روڈ لاہور۔فون:7322892
ویلکم بک پورٹ، اُردو بازار کراچی۔فون:2633151
اشرف بک ایجنسی، کمیٹی چوک راولپنڈی۔فون:5531610

AHMAD PUBLICATIONS
35-Royal Park, Lahore-Pakistan
Ph: (042) 6363009, 6363452
E-mail: ghalibooks@yahoo.com

ترتیب

پہلا باب

وہ خوفناک رات

"اباجی ..... اباجان"

میرا بیٹا رؤف جسے پیار سے سب گھر والے روفی کہتے ہیں' میرے کندھے پر ہاتھ رکھے مجھے ہلا رہا تھا' ابھی اس نے دوسری مرتبہ ہی پکارا تھا کہ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کے چہرے پر کچھ پریشان سی لکیریں تھیں۔ آنکھ کھلتے ہی پہلی نظر انہی پر پڑی اور پل بھر میں میرے ذہن اور جسم سے نیند اڑ گئی اور مسلسل بیدار نہ جانے کتنے ہی لمحوں کی تھکن دور ہو گئی۔

یہ ۴ اور ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کی درمیانی رات تھی میں سات ۔ساڑھے سات بجے رات کابینہ کے اجلاس سے فارغ ہو کر پرائم منسٹر ہاؤس سے گھر واپس پہنچا تھا۔ ملک کے سیاسی حالات اس قدر ابتر ہو چکے تھے کہ اب یاد نہیں آتا اگر ان دنوں ذہن کو ایک لمحہ بھی فراغت کا نصیب ہوا ہو' گزرتا ہوا ہر پل اور ہر لمحہ چاروں طرف پھیلی ہوئی ابتری میں اضافہ ہی کر رہا تھا۔ ہنگامے' ہڑتالیں' جلوس' جلسے .... لاقانونیت اور تشدد کی جو لہر اٹھ کھڑی ہوئی تھی اسے روکنے کی ہر کوشش ناکامی سے ہم کنار ہو رہی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے جو کچھ ہو رہا ہے' کسی فطری قانون کے تحت ہو رہا ہے اب اسے روکنا ہم میں سے کسی کے بس میں نہ رہا ہو۔

اس وقت کابینہ کی اہم میٹنگ تقریباً سات ساڑھے سات بجے ختم ہوئی! اس میں اہم قومی نوعیت کے بہت سے مسائل زیر بحث آئے تھے۔ چیف آف آرمی سٹاف جنرل محمد ضیاء الحق نے بھی اس میں شرکت کی تھی اور اجلاس ختم ہونے کے بعد وہ وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھ ہی ان کے کمرے میں تشریف لے گئے تھے ہم کابینہ کے کچھ اراکین کمرہ اجلاس سے باہر کھڑے آپس میں گپ شپ کرنے لگے' اچانک جنرل صاحب مسٹر بھٹو کے کمرے سے بڑی تیزی میں باہر آئے' آج وہ معمول سے زیادہ عجلت میں تھے۔ عام دنوں میں تو ان کے ہاتھ ملانے کا انداز ایسا ہوتا تھا جیسے ان کے ہاتھوں کی گرفت شاید ہی چھوڑنے پائے مگر آج میں نے ان سے ہاتھ ملایا تو وہ بمشکل انگلیاں ہی ملا پائے! ان کے چہرے سے ان کی مخصوص مسکراہٹ بھی غائب تھی۔ میرا ماتھا ٹھنکا ایسا لگا جیسے کچھ ہونے والا ہے۔ ابھی میں اس پر غور ہی کر رہا تھا کہ میر افضل خان نے آواز دی "چلنا نہیں ..... چلئے" "او ضرور" اور پھر ہم دونوں اکٹھے ایک ہی کار

میں پرائم منسٹر ہاؤس سے باہر نکلے۔ گاڑی کے شیشوں سے باہر میں روشنیوں پر یوں نظر ڈال رہا تھا جیسے آج انہیں آخری مرتبہ دیکھ رہا ہوں جیسے کوئی میرے اندر سے پکار پکار کر کہہ رہا تھا وقت ختم ہو چکا ہے۔ آج کے بعد یہ ماحول یہ عہد' یہ دور سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ اس پر الوداعی نظریں ڈال لو۔"

مجھے معلوم نہیں کہ بقیہ سفر کس طرح گزرا۔ میر افضل مجھے میری رہائش گاہ پر ڈراپ کر کے چلے گئے۔ وہ مجھ سے ذرا ہی آگے قیام پذیر تھے میں گھر میں داخل ہوا میرے تینوں بیٹے طارق' رؤف اور رضوان ابھی تک جاگ رہے تھے۔ بیوی اور بیٹی عمرہ کرنے سعودی عرب گئے ہوئے تھے۔ میں نے تینوں بچوں کو اپنے کمرے میں بلایا اور پھر طارق کو چند خصوصی ہدایات دیں چیک بک اس کے حوالے کی اور اسے بتایا کہ بوقت ضرورت میری عدم موجودگی میں اسے گھر کس طرح چلانا ہو گا۔ مجھے خوشی ہے کہ میرے تینوں بچوں نے میری باتوں کو اس طرح سمجھا جس طرح سمجھنا چاہئے تھا۔ انہوں نے نہ تو کسی غیر معمولی تردد کا مظاہرہ کیا نہ پریشانی کا۔ روز بروز بگڑتے ہوئے حالات کا اندازہ انہیں خود بھی تھا۔ میں نے انہیں سمجھایا کہ اگر میری عدم موجودگی میں انہیں موجودہ رہائش گاہ چھوڑنی پڑے تو وہ کوئی دوسرا مکان تلاش کر لیں' فوری طور پر دستیاب نہ ہو تو لاہور چلے جائیں۔

اسی دوران راولپنڈی سے راجہ عبدالعزیز بھٹی ایم این اے کا فون آیا میں نے ان سے بھی یہ کہا:۔
"وقت تیزی سے گزر رہا ہے' کسی لمحہ فوج قبضہ کر سکتی ہے۔ معلوم نہیں آج کی رات بھی خیریت سے گزرتی ہے کہ نہیں۔" بچوں کو سونے کی تلقین کرنے کے بعد میں نے کراچی میں اپنے معالج اور دوست ڈاکٹر اجمیری کو فون کیا۔ وہ مجھ سے ملنے کے لئے تشریف لانے والے تھے میں نے ان سے کہا "آپ نے بہت دیر کر دی ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کل آئیں اور ہم سے مل ہی نہ پائیں۔"

رات کو تقریباً ڈیڑھ' پونے دو بجے کے قریب میں سونے کے لئے لیٹا۔ جب میری پلکیں نیند کے دباؤ سے خود بخود بند ہوتی چلی جا رہی تھیں۔ .... اور .... اب .... جب روفی کی آواز سے آنکھ کھلی تو رات کے تقریباً پونے تین بجے کا عمل تھا۔

"کیا بات ہے بیٹے؟" میں نے بستر سے اٹھتے ہوئے دریافت کیا: "خیریت تو ہے؟"

"باجان! کچھ آدمی چھت پر چڑھ آئے ہیں اور ان کے ہاتھوں میں بندوقیں ہیں"

"بندوقیں" .... میں نے اٹھ کر کمرے سے باہر آتے ہوئے کہا "جی ہاں .... یہ آپ اپنا پستول ساتھ لے لیں" اس نے تکیئے کے نیچے سے پستول نکال کر میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔ مجھے فوری طور پر کچھ اندازہ نہ ہو سکا کہ یہ کون لوگ ہوں گے جو بندوقیں لئے ہوئے چھت پر چڑھ آئے ہیں۔ روفی کا کمرہ باہر کے رخ پر تھا اس نے اچانک دیکھا کہ دو آدمی دیوار کے ساتھ لگے ہوئے پانی کے پائپ کے ذریعے بالکنی پر چڑھے اور پھر ان کے فوراً بعد دو آدمی مزید اوپر آ گئے' چاروں کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں۔ روفی یہ دیکھتے ہی بھاگتا ہوا میرے کمرے میں پہنچا اور مجھے جگا کر یہ اطلاع دی اتنی دیر میں

میں اپنے کمرے سے باہر آ چکا تھا۔ پستول میرے ہاتھ میں تھا میں نے بیرونی ہال کے دروازے پر پڑے ہوئے پردے سرکائے تو باہر بالکنی میں لگے ہوئے بلبوں کی روشنی میں عین جالی سے متصل دو فوجی کھڑے تھے ان کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں جو سیدھی میری جانب تنی ہوئی تھیں یہ ایک لمحے کے اندر میرے ذہن میں بنگلہ دیش کے شیخ مجیب الرحمٰن کے خلاف آنے والے فوجی انقلاب کا پورا نقشہ گھوم گیا مجھے اپنے پورے بدن میں سنسنی اور تناؤ کی ایک ایسی لہر دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی جو صرف موت کو اپنے مقابل کھڑے دیکھ کر ہی محسوس ہو سکتی ہے میرے ذہن میں جھماکے سے ہو رہے تھے پل بھر میں سینکڑوں مناظر میری آنکھوں کے سامنے سے گزر گئے کہیں شیخ مجیب کی لاش خاک و خون میں پڑی تڑپ رہی تھی اور ان کے اہل خانہ کے بے جان لاشے پڑے تھے۔ مجھے بالکل یہی محسوس ہوا جیسے اب سے چند لمحوں بعد ہی قیامت ایک مرتبہ پھر گزرنے والی ہو۔

میں نے دونوں فوجیوں سے کسی بھی تاثر سے خالی آواز میں پوچھا "شوٹ کرنا ہے یا گرفتار کرو گے؟"

"سر .... گرفتاری چاہئے" ایک نے جواب دیا۔ میرے اندر کہیں دور سے جیسے اطمینان کی سانس کسی ان جانے سفر پر نکلی اور میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

میں نے فوجیوں سے پوچھا۔
"کپڑے تبدیل کر سکتا ہوں یا اسی طرح چلنا ہو گا۔"

"آپ کپڑے تبدیل کر لیجئے" اسی فوجی نے جواب دیا۔ اسی اثنا میں ایک میجر اور مزید چار فوجی جوان میرے کمرے کے اندر داخل ہو چکے تھے۔ روفی حیران پریشان کھڑا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا میں نے اسے کہا وہ طارق اور رضوان کو نہ جگائے اور خود بھی جا کر سو جائے۔

میں نے کپڑے تبدیل کئے اور یہ جاننے کے لئے کہ وزیر اعظم کس حال میں ہیں انہیں ٹیلی فون کرنا چاہا۔ سب سے پہلے میں نے گرین ٹیلیفون اٹھایا لیکن وہ ڈیڈ تھا۔ باقی فون بھی اسی طرح ملے۔ کیپٹن نے میری یہ کوشش بیکار دیکھ کر مجھے بتایا کہ ٹیلیفون کٹ چکے ہیں۔ مجھے بعد میں پتہ چلا کہ ملٹری کے جوان جب میری رہائش گاہ پہنچے تو انہوں نے سب پہلے ایکسچینج پر ہی قبضہ کیا آپریٹر اس وقت اونگھ رہا تھا جب اس نے اچانک ہی خود کو ملٹری کے جوانوں کے نرغے میں پایا تو وہ گھبرا گیا اس نے سمجھا شاید اس سے ڈیوٹی کی حالت میں اونگھنے کی جو کوتاہی سرزد ہوئی ہے ملٹری کے جوان اس سے اس کی باز پرس کرنے والے ہیں اس نے بوکھلاہٹ کا مظاہرہ کیا اور چند الٹی سیدھی حرکتیں کر بیٹھا جس پر ملٹری کے جوانوں نے دو چار تھپڑ رسید کر کے اسے نیند سے نجات دلائی اور پھر فوراً ہی ٹیلیفون کی تاریں کاٹ ڈالیں۔

ان کے رویئے میں اس ابتدائی جارحیت کے بارے میں مجھے بعد میں علم ہوا کہ اس کا سبب وہ بدمزگی تھی جو حفیظ پیرزادہ اور نکا خان کی رہائش گاہوں پر رونما ہوئی۔ ممتاز بھٹو جنہیں اعلیٰ نسل کے کتے

پالنے کا بے حد شوق ہے اور پورے سندھ میں جن کے پاس بہترین قسم کے بعض نہایت خونخوار کتے ہیں ان کے ہاں بھی ملٹری کے جوانوں کو خاصی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا تھا جس سے وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ شاید میرے ہاں بھی انہیں کسی ایسی ہی صورت حال کا سامنا کرنا پڑے گا لیکن جب میرے ہاں انہیں مکمل طور پر پرامن فضا ملی تو ان کی جھنجھلاہٹ ختم ہو گئی میں نے ان کے رویئے میں دوستانہ تبدیلی محسوس کی میں نے پوچھا کیا میں قرآن مجید ' جائے نماز اور چند جوڑے کپڑوں کے ہمراہ لے سکتا ہوں؟ جواب ملا " کوئی چیز ہمراہ لینے کا حکم نہیں " " کیا آرمی انقلاب لے آئی ہے " میں نے میجر سے پوچھا " سر ...... ہمیں اس قسم کے کسی سوال کا جواب دینے کا اختیار نہیں " میجر نے اپنے مخصوص فوجی انداز میں جواب دیا۔

ابھی ہم اوپر سے نیچے اترنے کے لئے سیڑھیاں طے کر رہے تھے کہ نیچے سے ایک آواز آئی " میرے لئے چپل ساتھ لیتے آنا " یہ عبدالحفیظ پیرزادہ کی آواز تھی۔ میں نے میجر کی طرف دیکھا وہ بولا " لے لیجئے " دوبارہ اپنے کمرے میں آ کر میں نے چپل اٹھائے اور نیچے اترا نیچے کا پورا صحن فوجی وردیوں میں ملبوس سپاہیوں سے بھرا ہوا تھا۔

میں نے چپل حفیظ پیرزادہ کو دیئے جو شب خوابی کے لباس میں ننگے پاؤں ہی فوجی دستے کے ہمراہ چلے آئے تھے ہم دونوں کو الگ الگ جیپوں میں بٹھا دیا گیا۔ گاڑی صدر دروازے کے باہر نکلی تو میں نے دیکھا یہاں فوجی وردیوں میں ملبوس بے شمار سپاہی ایستادہ تھے جو کئی ٹرکوں اور گاڑیوں میں اس " آپریشن ' کے لئے مقرر کئے گئے تھے۔ اس وقت رات کے تقریباً سوا تین بجے ہوں گے جب یہ قافلہ زیرو پوائنٹ کے قریب پہنچا اور رک گیا ہر طرف خاموشی اور سناٹے کا راج تھا چوک میں چند فوجی جیپیں کھڑی تھیں۔ میں نے اپنے ہم سفر فوجی افسر سے دریافت کیا " ہم یہاں کیوں رکے ہیں؟ " اس نے بتایا کہ " ممتاز بھٹو صاحب بھی آنے والے ہیں وہ آ جائیں تو قافلہ ایک ساتھ آگے روانہ ہو گا " اس کے بعد پھر خاموشی چھا گئی۔

تھوڑی دیر بعد ہی رات کا سناٹا ایک مرتبہ پھر فوجی گاڑیوں کے شور سے گونج اٹھا معلوم ہوا ممتاز بھٹو صاحب آ پہنچے ہیں ان کے آتے ہی ہمارا ٹھہرا ہوا کانوائے بھی حرکت میں آ گیا اردگرد حد نظر تک تاریکیوں کا راج تھا۔ کہیں کہیں سٹریٹ لائٹیں روشن تھیں۔ شہر سے گزرتے ہوئے ہم نے دیکھا کہ بعض اہم ناکوں پر فوج کی تعیناتی عمل میں آ چکی تھی۔

اب ہم جس راستے سے گزر رہے تھے اسے پہچاننے میں مجھے ذرا بھی دیر نہ لگی یہ راستہ چک لالہ کو جاتا تھا جہاں وزیر اطلاعات و نشریات ہونے کی حیثیت میں کبھی میرا دفتر ہوا کرتا تھا بالآخر تمام فوجی گاڑیاں خاردار تاروں سے گھرے ہوئے ایک دفتر کے احاطے میں جا کر رک گئیں ہمیں ایک کمرے میں پہنچا دیا گیا جہاں پہلے ہی سے اچھی خاصی محفل جمی ہوئی تھی۔ صوفوں پر ریٹائرڈ جنرل ٹکا خان مفتی محمود اور پروفیسر غفور وغیرہ براجمان تھے اور چائے کا دور چل رہا تھا اب یہ تو صاف ظاہر تھا کہ فوج انقلاب لے آئی ہے لیکن اس انقلاب کا رہبر کون ہے اس کے بارے میں کسی کو کچھ پتا نہ تھا ' نہ ہی کسی کو خبر تھی کہ مسٹر بھٹو کہاں ہیں؟

ہم آپس میں بیٹھے ایک دوسرے کو اپنی اسیری کا حال سنا رہے تھے۔ ممتاز بھٹو کہنے لگے " جب گاڑیاں زیرو پوائنٹ کے قریب رکیں تو میں نے تو دل ہی دل میں کلمہ شہادت پڑھ لیا تھا میرا خیال تھا کہ اب اس ویرانے میں ہمیں شوٹ کر کے لاشیں ادھر ہی کہیں کھیتوں میں دبا دی جائیں گی پھر جب گاڑیاں چل پڑیں اور ویران علاقے سے گزریں تو میں نے خیال کیا شاید شہری آبادی سے باہر نکال کر ہمیں فائرنگ اسکواڈ کے حوالے کیا جائے گا کیونکہ رات کے سناٹے میں فائرنگ کی آواز زیادہ گونجتی جس سے شہریوں کے آرام میں خلل پڑ سکتا تھا ان کے پر مزاح انداز پر محفل میں بے اختیار قہقہے گونج اٹھے۔

کچھ دیر کے بعد ہمیں اسی آفس سے ملحقہ بیرکس میں ایک ایک کمرہ دے دیا گیا سامنے کی بیرکس میں پی۔ این اے کے رہنماؤں کو ٹھہرایا گیا ان میں پیر صاحب پگارا ' اصغر خان ' نواب زادہ نصر اللہ خان ' مولانا نورانی ' مولانا مفتی محمود اور پروفیسر غفور شامل تھے اور مقابل کی بیرکس میں ہم لوگوں کو............

(" ہم لوگوں " میں میرے علاوہ ممتاز بھٹو ' حفیظ پیر زادہ ' ٹکا خاں ، ڈاکٹر غلام حسین اور غلام مصطفیٰ کھر شامل تھے) اب قریب قریب نماز فجر کا وقت ہو چلا تھا میں نے اپنے کمرے میں آ کر وضو کیا اور اپنا سر نیاز و عبودیت اپنے مالک کے سامنے جھکا دیا اس میں یہ تشکر بھی شامل تھا کہ یہاں فوجی انقلاب تو آیا لیکن دوسرے ملکوں کی طرح یہ خونی نہ تھا ' پرامن تھا یہ بعد میں معلوم ہوا کہ ہم لوگوں کو گرفتار کرنے والے دستوں کو خصوصی ہدایات تھیں کہ گرفتار شدگان کا مکمل ادب و احترام ملحوظ رکھا جائے ہاں اگر تم پر گولی چلے تو تم جوابی فائر کر سکتے ہو ورنہ خون کا ایک قطرہ بھی نہ گرنے پائے اور نہ آپریشن ایسے انداز میں انجام کو پہنچے کہ کوئی ہنگامہ اٹھ کھڑا ہو۔

نماز کے بعد میں بستر پر لیٹ گیا کچھ دیر گزرے ہوئے واقعات ایک فلم کی مانند نگاہوں کے سامنے گھومتے رہے پھر نہ جانے کب نیند کے بوجھ سے میری پلکیں خود بخود بند ہو گئیں میں اٹھا تو سورج اچھا خاصا نکل آیا تھا اور کمرے کی میز پر ناشتے کی ٹرے میرا انتظار کر رہی تھی۔

یہ تھا جرنیلوں کی اس طویل رات کا انداز جو ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کو شروع ہو کر یکم جنوری ۱۹۸۶ء تک پھیلی ہوئی تھی ' گو صبح صادق اب بھی نہیں ہوئی ارباب شعور کی زبان پر اب بھی رہ رہ کر یہی بات آ رہی ہے کہ ؎

وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

تاہم ۴ اور ۵ جولائی کی درمیانی رات کو جو کچھ ہوا وہ مارشل لاء کا نقطہ آغاز ہرگز نہ تھا ' خشت اول میں کجی تو بہت عرصہ پہلے آ چکی تھی ' بقول شاعر؎

وقت کرتا ہے پرورش برسوں
حادثہ ایک دم نہیں ہوتا

○ ...... ○ ...... ○ ...... ○

انتخابات' وقت سے پہلے کیوں؟

یہ ۱۵ ستمبر ۱۹۷۴ء کی خنک رات تھی وزیر اعظم بھٹو نے فرائض منصبی نمٹانے کے بعد عبدالحفیظ پیر زادہ رفیع رضا اور مجھے ڈنر کے لئے اپنی قیام گاہ پر روکا ہوا تھا۔ وہ حسب معمول تھوڑا سا بھنا ہوا قیمہ پلیٹ میں رکھے بیٹھے تھے بے تاثر چہرے کے ساتھ ہم تینوں کی طرف دیکھتے ہوئے نہایت سنجیدگی سے بولے۔

"یوم تشکر جس انداز میں منایا گیا' اس کا حکومت کو کیا فائدہ ہوا؟"

وہ احمدیوں سے متعلق آئینی ترمیم کا حوالہ دے رہے تھے جس کی خوشی میں پاکستان بھر میں یوم تشکر منایا گیا تھا بھٹو صاحب کا خیال تھا کہ آئین میں اس ترمیم کا جو کریڈٹ حکومت کو ملنا چاہیئے تھا وہ نہیں ملا' ان کو شکایت تھی کہ .... "مولوی لوگ زبردستی اس کا سہرا اپنے سر باندھ رہے ہیں جس کے لئے ہمیں لوگوں کو اصل صورت حال بتانا چاہیئے۔"

"لوگ اصل صورت حال جانتے ہیں جناب" حفیظ نے اپنی روایتی اکڑفوں کا مظاہرہ کیا۔ "مولویوں کے کتنے آدمی اسمبلیوں میں ہیں؟ عوام انہیں خوب جانتے ہیں' وہ ان کے کھوکھلے دعوؤں کے فریب میں نہیں آئیں گے۔ میرے خیال میں تو حکومت کو پورا کریڈٹ ملا ہے۔"

"آپ کا کیا خیال ہے مولانا" وزیر اعظم بھٹو نے نیم وا آنکھوں اور دبی دبی مسکراہٹ کے ساتھ مجھ سے سوال کیا۔ یہ ان کا ایک مخصوص انداز تھا۔ کبھی کبھی جب خوشگوار موڈ میں ہوتے تو تفنن طبع کی خاطر اپنے قریبی رفقا سے گفتگو کرتے ہوئے وہ یہی انداز اختیار کرتے تھے۔ ایسے مواقع پر وہ مختلف الخیال لوگوں کو اظہار رائے کا موقع دیتے۔ وقتاً فوقتاً خود بھی "لقمے" دیتے رہتے جس کا مقصد گفتگو میں چمک پیدا کرنا ہوتا تھا جو عموماً آ جاتی تھی۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ گفتگو کے بجائے خود "گفتگو کرنے والا" چمک اٹھتا تھا۔ وزیر اعظم ایسے مواقع پر ہمارے دوست خورشید حسن میر کی حرکات و سکنات اور باتوں سے بہت محظوظ ہوتے تھے۔ کچھ افراد اچھے خاصے ذہین و فطین ہوتے ہیں لیکن ان کی حس مزاح کند ہوتی ہے وہ ازراہ تفنن کی گئی بات پر بھی فلسفیانہ موشگافیاں کرنے لگتے ہیں اور سنجیدگی کی شدت سے چہرے پر تشنج کی سی کیفیت طاری کر لیتے ہیں ایسے لوگ بھٹو صاحب کی تفریح طبع کا بہترین ذریعہ ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے مجھے بتایا: "میں نے کئی بار جے۔ اے۔ رحیم کو بے محل اور بے معنی

موضوع دے کر اس کی طویل تقریریں بڑی سنجیدگی سے سنی ہیں۔"

جب انہوں نے مجھ سے میرا خیال پوچھا تو ان کے ذہن میں درحقیقت صرف کریڈٹ کی بات نہ تھی معاملہ حقیقتاً کچھ اور تھا۔ ان کی ذہنی کیفیت کا اندازہ لگا کر میں نے محتاط انداز میں بولنا شروع کیا۔

"یہ درست ہے کہ علما اس کا سہرا اپنے سر باندھ رہے ہیں کیونکہ وہ ایک مدت سے یہ مہم چلا رہے تھے۔ ان کی طرف سے قربانیاں بھی دی گئیں لیکن فیصلہ تو بہرحال آپ کی حکومت نے کیا ہے۔ اب جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں آپ انتخابات کے نقطہ نظر سے سوچ رہے ہیں" میں نے ایک لمحہ تامل کیا اور ان کے چہرے کے تاثرات دیکھے انہوں نے اثبات میں سر ہلا کر پیرزادہ کی طرف دیکھا اور مجھے بولنے کا اشارہ کیا۔ میں نے کہا۔

"اس اقدام سے مذہبی حلقوں میں آپ کی مقبولیت یقیناً بڑھی ہے لیکن انتخابات کے نتائج ان حلقوں میں مرتب نہیں ہوتے۔ سیاسی فیصلہ ہمیشہ سواد اعظم کا ہوتا ہے اور سیاسی میدان میں اس وقت آپ کا گراف ۱۹۷۳ء سے نیچے ہے" اس موقع پر میں نے ایک پرانی گفتگو کا حوالہ بھی دیا۔

لاہور کی اسلامی سربراہ کانفرنس کے دوران ایک رات ہم تھکے ہارے بیٹھے کافی پی رہے تھے کہ مسٹر بھٹو نے اچانک سوال کیا۔ "مولانا! آپ کا کیا خیال ہے، معزز مہمانوں کو الوداع کہنے کے بعد میں پہلا کام کون سا کروں گا؟"

"مجھے آپ کی رمز شناسی کا دعویٰ تو نہیں تاہم میرا خیال ہے کہ فنڈز کے مسائل حل ہو چکے ہیں اور اب آپ اپنے ایک دیرینہ خواب کی تکمیل پر توجہ دے سکیں گے" میں نے جواب دیا تھا۔

"ہاں! مگر بعد میں" .... بھٹو صاحب نے کہا تھا" پہلا کام تو میں یہ کروں گا کہ اسمبلیاں توڑ دوں اور ساٹھ دن کے اندر اندر انتخابات کرا دوں۔"

"یہ بہترین موقع ہے" میں نے بلا تامل تائید کی تھی اور میں آج تک اس رائے پر قائم ہوں کہ میں نے اس وقت انتہائی درست مشورہ دیا تھا اور وزیر اعظم بھٹو کا فیصلہ دانش مندانہ تھا۔

مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد باقیماندہ پاکستان میں اکثریتی پارٹی کے لیڈر کی حیثیت سے مسٹر بھٹو نے حکومت تو بنالی تھی اور وہ اپنے اس اقدام کے حق میں دلائل بھی دیا کرتے تھے۔ لیکن ان کے ذہن کے کسی نہ کسی گوشے میں یہ بات ضرور بیٹھی ہوئی تھی کہ انتخابات پورے پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کے لئے ہوئے تھے۔ اے۱۹ء کی جغرافیائی تبدیلی کے بعد عوام سے نیا اختیار نامہ لینا ضروری تھا جو وہ نہ لے سکے تھے۔ اقتدار سنبھالنے کے فوراً بعد سے وہ از سر نو انتخابات کے بارے میں غور کرتے رہے تھے لیکن ملکی اور بین الاقوامی حالات نے انہیں اس کی مہلت نہ دی تھی۔ ان کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ ۱۹۷۱ء کی شکست کے اثرات سے قوم کو نجات دلانے اور نوے ہزار جنگی قیدیوں کو بھارت سے وطن واپس لانے کا تھا جس کے لئے انہوں نے شملہ معاہدہ کیا۔ پھر فوراً بعد وہ اسلامی سربراہ کانفرنس کے انعقاد میں مصروف ہو

گئے اتحاد عالم اسلام در حقیقت ہمارا ایک مشترکہ خواب تھا اور اس خواب کو حقیقت بنانے کے لئے سب سے زیادہ کوششیں بھی ہم نے ہی کیں۔ اس وقت بھٹو صاحب کے بعد اسلامی دنیا میں تھوڑی بہت جان پہچان وزرائے کرام میں سے صرف میری ہی تھی اس لئے ہم دونوں کے سوا کوئی چاہتا بھی تو موثر کردار ادا نہ کر سکتا تھا۔ اس کانفرنس کے وسیع' ہمہ گیر' علاقائی اور عالمی مقاصد کے علاوہ ہمارے پیش نظر دو مقاصد اور بھی تھے اول انتخابات کا از سرنو انعقاد اور دوم بنگلہ دیش کو تسلیم کرنا یہ راز کابینہ کے بہت سے وزرا کو بھی معلوم نہ تھا کہ اسلامی کانفرنس میں شیخ مجیب الرحمٰن کی شرکت اور بنگلہ دیش کو تسلیم کرنا پہلے سے طے پاچکا تھا۔ لاہور کی ایک تقریب میں کانفرنس میں شریک تمام سربراہوں کی تصاویر لگائی گئی تھیں شیخ مجیب الرحمٰن کی تصویر بنا کر الگ رکھ لی گئی تھی۔ جو خود میری تحویل میں تھی اور اسے ان کی آمد کے اعلان کے بعد منظر عام پر لایا جاتا تھا۔

کانفرنس توقعات سے کہیں زیادہ کامیاب رہی تھی میری تجویز پر بادشاہی مسجد لاہور میں تمام سربراہوں کا اجتماع اور نماز کی ادائیگی کے عمل نے قوم کے ان صدیوں پرانے خوابوں کو حیات نو بخشی جو اس خطے کے مسلمانوں کے اذہان کی گہرائیوں میں رچے بسے ہوئے تھے۔ وہ ایک منظر بڑے بڑے مذہبی خطبوں سے زیادہ موثر تھا۔ دوسری طرف شیخ مجیب الرحمٰن کی آمد اور شالامار باغ میں پاکستانی شہریوں سے کھل مل جانے کے اثرات بڑے جذباتی نتائج کے حامل تھے۔ پاکستان کے مقبوضہ علاقے مسٹر بھٹو واگزار کرا چکے تھے۔ جنگی قیدیوں کی واپسی کا عمل شروع ہو چکا تھا اور یہ سب بڑے خوش گوار لمحات تھے۔ قوم پر طاری ندامت' خوف' ناامیدی اور کم ہمتی کی کیفیت چھٹ چکی تھی۔ دو سال کے عرصہ میں اس صورت حال نے جنم لیا تھا اور اسلامی کانفرنس اس کا نقطہ کمال تھا جب شکست خوردہ پاکستانی قوم نے پورے عالم اسلام کو اپنے شانہ بشانہ محسوس کیا اس وقت اگر انتخابات کرا دیئے جاتے تو پیپلز پارٹی نئے پاکستان میں حکومت بنانے کا مستند اختیار بھی حاصل کر لیتی اور ان خرابیوں سے بھی نجات مل جاتی جو آگے چل کر حکومت کی تباہی اور رسوائی کا باعث بنیں۔

۱۵ ستمبر کی اس رات جب بھٹو صاحب نے مجھ سے میرا خیال پوچھا تو میں نے اس وقت کی ملکی جذباتی فضا کو مد نظر رکھتے ہوئے ہی انہیں پھر انتخابات کے انعقاد کا مشورہ دیا تھا۔ مسٹر بھٹو احمدی مسئلے پر قومی اسمبلی کا فیصلہ کرانے کے بعد انتخابات کے نقطہ نظر ہی سے سوچ رہے تھے۔ لیکن میرے خیال میں انتخابات کا سب سے بہترین وقت وہی تھا جب مسٹر بھٹو اسلامی سربراہ کانفرنس سے فارغ ہو چکے تھے اور اپنی شخصی مقبولیت کے نقطہ معروج پر تھے۔ کانفرنس کے کامیاب اختتام کے بعد اسلام آباد واپسی کے فوراً بعد میں نے انتخابات کے سلسلے میں غور و فکر شروع کر دیا تھا۔ ذرائع ابلاغ کی ذمہ داریاں اس وقت میرے پاس تھیں۔ مجھے معلوم تھا کہ سب سے زیادہ بوجھ ادھر ہی پڑے گا وزیراعظم بھٹو دو ہی وزارتوں میں گہری دلچسپی لیتے تھے۔ ایک وزارت خارجہ اور دوسری وزارت اطلاعات و نشریات۔ اطلاعات و نشریات کی

وزارت ابتدا میں انہوں نے حفیظ پیرزادہ کے حوالے کی تھی۔ لیکن سارا کام وہ بذات خود ہی کرتے تھے۔ وہ بڑا عجیب دور تھا۔ پے در پے بحران پیدا ہو رہے تھے۔ چنانچہ جب وزیراعظم نے یہ وزارت میرے حوالے کی اور واضح طور پر اپنے مقاصد بتائے تو مجھے یاد ہے کہ میں نے انہیں جواب دیا تھا کہ............ "میں ضابطہ کار اور سرکاری طور طریقوں سے بالکل واقف نہیں مقاصد کے حصول کے لئے راہ عمل کا تعین تو کر سکتا ہوں لیکن افسر شاہی کو شاید میں کنٹرول نہ کر سکوں اس پر مسٹر بھٹو نے جواباً کہا تھا۔............ "اس کی فکر نہ کریں، اصل ضرورت سیاسی سطح پر راستے تلاش کرنے کی ہے اور آپ میں اس کی صلاحیت موجود ہے رہا دفتری طریق کار اور افسر شاہی سو میں ہر قدم پر آپ کے ساتھ ہوں" ان کی اس ہمت افزائی نے میرا حوصلہ بڑھایا اور در حقیقت انہوں نے اپنا یہ وعدہ نبھایا بھی۔ ہر قدم پر میری بھرپور اعانت اور رہنمائی کی جس کے نتیجے میں کچھ عرصے بعد ہی میرا شمار ان وزرا میں ہونے لگا جو اپنے محکموں پر پوری گرفت رکھتے تھے۔ یہ بات اب تاریخ کا حصہ بن چکی ہے کہ میرے زمانہ وزارت میں جنگی قیدیوں سے متعلق عالمی رائے عامہ کو کس طرح منظم کیا گیا اور کتنی موثر مہم چلائی گئی۔ یہ مسٹر بھٹو ہی کی رہنمائی اور اعانت کا نتیجہ تھا۔ پھر بنگلہ دیش کی حقیقت کو تسلیم کرانے میں جذباتی رکاوٹوں کو دور کرنا اور شملہ معاہدہ کو قوم سے قبول کرانا کوئی آسان کام نہ تھا یہاں میں ایک انکشاف بھی کرتا چلوں کہ شیخ مجیب الرحمٰن کی حکومت کے ساتھ پہلا براہ راست خفیہ رابطہ وزارت خارجہ کے توسط سے نہیں ہوا تھا بلکہ یہ فرض بھی میری وزارت نے نبھایا تھا۔ اس قسم کی حساس اور نازک کامیابیاں حاصل کرنے کے بعد مجھ میں اعتماد پیدا ہوا جس کے بعد مسٹر بھٹو نے تمام معاملات میرے اوپر چھوڑ دیئے تھے۔ یہی سبب تھا کہ جب مسٹر بھٹو نے اس رات پھر انتخابات کی طرف اشارہ کیا تو میں نے اپنی وزارت کے فرائض کی ادائیگی کے سلسلے میں راہ عمل کا تعین خود کر لیا تھا اور ایک ابتدائی خاکہ مرتب کرنے کے بعد............ ایک شام چائے کی میز پر وزیراعظم کے سامنے اس بات کو اٹھایا۔

"جناب اسمبلیاں توڑنے کا اعلان کب کرنا چاہیئے؟" میں نے ان سے پوچھا۔

"نہیں مولانا! ابھی ایسا نہیں ہو رہا" مسٹر بھٹو نے جواب دیا۔ ان کے لہجے میں کچھ مایوسی کی جھلک تھی۔

"لیکن آپ تو تہیہ کیئے ہوئے تھے۔" میں نے قدرے استعجاب کے ساتھ پوچھا۔ "آپ تو بے حد پر اعتماد تھے۔"

"اعتماد تو آج بھی ہے" وزیراعظم نے سوچ میں ڈوبے ہوئے کہا۔ "لیکن کیا کروں؟ دانشوروں کی ٹیم نہیں مانتی!" دانشوروں کی وہ ٹیم اب ڈھکی چھپی نہیں رہی۔ ۱۹۷۷ء کے انتخابات میں اس ٹیم کے دو افراد نے تو حصہ ہی نہ لیا تھا اور تیسرے نے جس طرح کامیابی حاصل کی وہ بھی ایک کھلا راز ہے اگر یہ لوگ اس وقت وزیراعظم کے فیصلے کی حمایت کرتے تو انتخابات یقینی تھے اور کانفرنس کے بعد جو فضا مسٹر بھٹو کے

حق میں بن چکی تھی اسے دیکھتے ہوئے انتخابات کے حق میں ان کا فیصلہ ایک بروقت صحیح اور درست ترین فیصلہ تھا۔ حفیظ اس وقت اس خیال کے سب سے زیادہ مخالف تھے۔ بعدازاں جب ایک طویل عرصہ بعد قادیانیوں کے بارے میں آئینی ترمیم سے فارغ ہو کر مسٹر بھٹو انتخابات کے امکانات کا جائزہ لے رہے تھے تو حفیظ پیرزادہ انتخابات کے حق میں سب سے زیادہ دلائل دے رہے تھے۔ وہ خود بھی خوش فہمی میں مبتلا تھے اور مسٹر بھٹو کو بھی یہ باور کرا رہے تھے کہ آئینی ترمیم نے مذہبی حلقوں میں ان کی مقبولیت کو انتہائے کمال تک پہنچا دیا ہے۔ میں جانتا تھا کہ مذہبی حلقوں کے بارے میں حفیظ کی معلومات خام ہیں اور جن بنیادوں پر وہ اس موقع پر مسٹر بھٹو کے ذہن میں انتخابات کے مرحلے سے نمٹ لینے کا خیال ڈال رہے تھے۔ وہ بنیادیں درست معلومات پر مبنی نہ تھیں۔ لیکن وزیراعظم بھٹو حفیظ کے خیال سے متفق نظر آتے تھے۔ انہیں بھی اپنی مقبولیت کے بارے میں میری رائے سے اتفاق نہ تھا۔ وہ کہہ رہے تھے۔

"اب دو ہی راستے واضح ہیں۔ اول یہ کہ موجودہ فضا سے فائدہ اٹھا کر فوراً انتخابات کرا دیئے جائیں، ورنہ ایک سال تک معیاد بڑھانے کی آئینی رعایت سے فائدہ اٹھایا جائے ۱۹۷۸ء تک انتخابات کے لئے تیاریاں کی جائیں۔"

جہاں تک میرا تعلق ہے، میں ذاتی طور پر دوسرے خیال سے متفق تھا۔ جب میں نے دوسرے پہلو سے اتفاق رائے ظاہر کیا تو مسٹر بھٹو نے مجھ پر طنز کیا............ "آپ کو اپنے منتخب ہونے پر شک ہے؟"

"نہیں جناب!" .... میں نے جواب دیا۔ "میرے ذہن میں اپنا خیال تک نہ تھا۔ اس طرف تو توجہ بھی آپ نے دلائی ہے میں نے تو دو سال پیشتر انتخابات کے انعقاد کی حمایت کی تھی۔ اگر اپنی نشست کا خیال ہوتا تو اس وقت بھی سوچتا"۔

نہیں! نہیں!! مسٹر بھٹو بولے۔ "یہ تو مذاق تھا۔ آپ یہ بتائیں کہ اگر اس وقت اسمبلیاں توڑ کر انتخابات کا اعلان کر دیا جائے تو کتنے امکانات ہیں؟"

"جہاں تک اپوزیشن کا تعلق ہے، وہ اس وقت منتشر ہے، عوام کے ساتھ اس کے رابطے محدود ہیں مخالفین کی کمزوری پر انحصار کیا جائے تو بلاشبہ موزوں وقت ہے لیکن ان کی کمزوری کو اپنی طاقت کیسے سمجھا جاسکتا ہے؟ ہماری اپنی پارٹی کی حالت قابل رشک نہیں ہمارے کارکنوں اور رہنماؤں نے باہمی رقابتوں اور تنازعات میں پڑ کر عوام کو مایوس کیا ہے۔ اگر آپ نے انتخابات کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو آپ کو ایک بار پھر خود ہی میدان میں اترنا ہو گا۔ ۱۹۷۰ء کا دور سامنے رکھ کر انتخابی مہم خود چلانا ہو گی۔ رابطہ عوام کے لئے آپ کو کم از کم پانچ چھ ماہ تک دورے کر کے ملک کے کونے کونے میں جانا ہو گا۔ آپ رابطے بحال کریں لوگوں کی باتیں اور آراء سن کر ان کی روشنی میں پارٹی کی تنظیم نو کریں۔ اس طرح کامیابی کی امید کی جا

سکتی ہے۔"

وزیراعظم نے بڑے انہماک سے میری باتیں سنیں اور پھر کچھ عرصہ بعد ہی انہوں نے کھلی کچہریوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ شاید یہ رابطہ عوام کا طریقہ تھا۔ پتہ نہیں یہ وزیراعظم کا اپنا خیال تھا کہ کسی "دانش ور" کا آئیڈیا تاہم چند ہی کچہریوں کے بعد وزیراعظم بیزار ہو گئے اور ایک محفل میں پنجاب کے وزیر اعلیٰ کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے بتایا کہ .... "اس شخص نے تو فلمی شوٹنگ کرا دی ہے، اداکاروں کا انتخاب بھی خود کرتا تھا اور انہیں مکالمے بھی خود دیتا تھا۔"

اس وقت تک حالت یہ ہو چکی تھی کہ وزیراعظم خواہش کے باوجود عوام میں نہیں جا سکتے تھے۔ وہ گھیرے میں آ چکے تھے اور یہ بات میں آج نہیں لکھ رہا۔ "دیدہ ور" میں کھلی کچہریوں کا واقعہ پہلے بھی لکھ چکا ہوں۔ اس کتاب کے مسودے کا مطالعہ مسٹر بھٹو اور بیگم بھٹو نے اشاعت سے قبل کیا تھا۔

۱۹۷۶ء میں دفعتاً دفتری کارروائیوں کا آغاز ہو گیا۔ وزیراعظم کے ہاں سے ایک حکم موصول ہوا کہ میں اپنی وزارت کی کارکردگی کے بارے میں پورے ایک ہفتہ کی پروپیگنڈہ مہم تیار کرواؤں اسی طرح کا حکم دوسری تمام وزارتوں کو بھی جاری کیا گیا تھا۔ میں نے اس حکم کا مقصد جاننے کے لئے وزیراعظم کو فون کیا تو انہوں نے اگلے روز مجھے ایوان وزیراعظم میں بلوالیا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی انہوں نے پوچھا۔

"آپ کو مقصد کا پتہ نہیں چل سکا؟ حیرت ہے!" "اندازہ تو ہو رہا ہے" .... میں نے دھیمے لہجے میں کہنا شروع کیا .... "لیکن اگر ہم واقعی انتخابات کی طرف بڑھ رہے ہیں تو دفتری انداز میں کارکردگی کا ڈھنڈورہ پیٹ کر ہم کیا حاصل کریں گے۔"

"آپ کا خیال ہے ہماری حکومت نے کچھ نہیں کیا" وزیراعظم کے تیور بگڑ گئے اور مجھے ان کا موڈ درست کرنے کے لئے کافی دیر تک اپنی بات کی وضاحت کرنا پڑی تاہم اس روز مجھے یقین ہو گیا کہ "قائد عوام" ایوان اقتدار میں اتنا عرصہ گزارنے کے بعد خود اپنے طور طریقے فراموش کر بیٹھے ہیں۔ میں یہ بات آج بھی سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ایوب خان کے دس سالہ جشن کا مذاق اڑانے والے بھٹو نے آخر خود کیوں سرکاری ذرائع ابلاغ اور سرکاری ملازمین کے مرتب کردہ پروگراموں پر مشتمل "ہفتوں" کو عوامی رابطے کا ذریعہ مان لیا تھا۔

ملاقات کے اختتام تک ان کا موڈ قدرے بہتر ہو چکا تھا مجھے رخصت کرتے وقت انہوں نے کہا۔

"انتخابات کا فیصلہ میں کر چکا ہوں۔ جو پہلا موزوں وقت ملا اس میں اعلان کر دیا جائے گا اور مولانا آپ کو بہت کام کرنا ہے۔ میں جلد ہی سارے انتخابی معاملات آپ کے حوالے کرنے والا ہوں تیاری کر لیجئے۔" وزیراعظم نے مسکراتے ہوئے ہاتھ ملایا۔ "میں ہمہ وقت مستعد رہوں گا" .... میں نے جواب دیا۔

چونکہ میں انتخابی مہم کے دفتری انداز پر اعتراض کر چکا تھا اور بھٹو صاحب نے اسے اپنی طرف منسوب کر لیا تھا' اس لئے اب مجھ پر لازم تھا کہ میں اپنی طرف سے سیاسی انداز کی مہم کی تیاریاں کرتا میں نے ایک لمحہ بھی ضائع کئے بغیر بیک وقت کئی محاذوں پر کام شروع کر دیا اور زیادہ زور اس چیز پر دیا کہ وزیر اعظم خود اسمبلی کے ہر حلقے میں کم از کم ایک مرتبہ ضرور جائیں۔ اس سلسلہ میں ہر جگہ کے حالات سے وزیر اعظم کو باخبر رکھنے کے لئے میں نے ایک سوالنامہ تیار کرایا جو میں پارٹی کارکنوں کو بھیجنا چاہتا تھا۔ تاکہ موصول ہونے والے جوابات کی روشنی میں وزیر اعظم کی جانب سے اظہار خیال کے دو پیراگراف تیار کرا لئے جائیں اور دوسرے انہیں ہر علاقے کے معاملات مسائل سے بھی براہ راست واقفیت ہو جائے۔ میرا منصوبہ یہ تھا کہ وزیر اعظم کے دورے کا تمام تر انتظام پارٹی کے کارکنوں کے سپرد کر دیا جائے' اور یہ ذرا سی بات وزیر اعظم اور عوام کے درمیان موجود افسر شاہی کے پردے کو بیچ سے ہٹا کر ٹوٹنے ہوئے تمام رابطے بحال کر دیتی۔ اس بات کی اہمیت کا اندازہ یوں کیا جا سکتا ہے کہ وزارت عظمیٰ سے علیحدگی کے بعد جب وزیر اعظم افسروں کے جھرمٹ سے باہر آئے تو کارکنوں نے انہیں سر آنکھوں پر بٹھایا' حالانکہ چند ہفتے قبل استقبال کے لئے اتنا بھی ہجوم اکٹھا نہیں ہوتا تھا جتنا مثال کے طور پر اگست ۷۷ ۱۹ء میں لاہور میں ہوا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ افسر شاہی کو انتخابات سے علیحدہ رکھ کر عوام کے ساتھ مسٹر بھٹو کے جذباتی رشتوں کا پرجوش اظہار کر سکوں اور ایک مرتبہ ایسا ہو جاتا تو ۵ جولائی ۷۷ ۱۹ء کی رات مارشل لاء نافذ کرنے والوں کو بھی شاید اس اقدام کی جرأت نہ ہوتی میں سیاسی انداز میں انتخابی مہم چلانے کے منصوبے بنانے میں مصروف تھا کہ ۱۳ جولائی ۷۶ ۱۹ء کو وزیر اعظم کے سپیشل سیکرٹری راؤ عبدالرشید کا ایک مراسلہ "ٹاپ سیکرٹ" کی مہر کے ساتھ موصول ہوا۔ جو پس منظر میں نے ابھی بیان کیا ہے اسے پوری طرح سمجھنے کے لئے مناسب ہو گا کہ اس مراسلے کا مطالعہ کر لیا جائے اصل مراسلہ انگریزی میں ہے اور اسے آپ کتاب کے آخر میں دیئے گئے ضمیمہ جات میں ملاحظہ کر سکتے ہیں۔

○ .... ○ .... ○

۱۳ جولائی ۷۶ ۱۹ء

ڈیئر مولانا صاحب!

وزیر اعظم نے مسرت کے ساتھ آپ کو آنے والے انتخابات میں پاکستان پیپلز پارٹی کی پریس پبلسٹی مہم کا سربراہ مقرر کیا ہے۔ آپ ازراہ کرم مقصد ہذا کے لئے ایک چھوٹی سی کمیٹی بنائیں جس میں ایسے تجربہ کار افراد شامل ہوں جو پارٹی کے اصولوں اور نظریات پر پختہ یقین رکھتے ہوں اور ان کے ساتھ پوری طرح وابستہ ہوں۔ ایسے افراد جو فنی مہارت کے حامل تو ہوں لیکن ان کی وفاداریاں کہیں اور ہوں انہیں شامل نہ کیا جائے۔ اسے ایک متوازن ٹیم ہونا چاہئے جس کا جھکاؤ نہ تو بائیں بازو کی طرف ہو اور نہ دائیں بازو کی طرف۔ آپ ان افراد کو یاد کریں جنہوں نے ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں پارٹی کی مدد کی تھی۔ جب آپ کمیٹی تشکیل دیں تو جغرافیائی نمائندگی کا خیال رکھیں تاکہ پارٹی کی اپیل کائناتی (یونیورسل) ہو۔ براہ کرم ٹیم کے اراکین کی فہرست سے مطلع کریں تاکہ جس قدر جلد ممکن ہو سکے وزیر اعظم سے منظوری حاصل کی جائے۔

ایک ٹیم وزیر اعظم کی ذاتی تشہیر اور پروجیکشن کے لئے قائم کی گئی ہے۔ یہ کمیٹی مسٹر یوسف بچ کے ماتحت کام کرے گی۔ لیکن دونوں ٹیموں کے درمیان رابطہ رہنا چاہئے اور وزیر اعظم نے مسرت کے ساتھ کو آرڈی نیشن کی ذمہ داری بھی آپ کو سونپی ہے۔

آپ کا مخلص

راؤ رشید

اصل متن کیلئے ملاحظہ ہو ضمیمہ جات

وزیراعظم کا حق تھا کہ اپنی ضرورت کے تحت جسے چاہیں اپنا معاون بنائیں اور جسے جو فرائض مناسب سمجھیں سونپ دیں لیکن اپنی جماعت کے ساتھیوں سے کم از کم پارٹی معاملات کی حد تک ان کا تعلق سیاسی ہونا چاہئے تھا۔ راؤ رشید پولیس سروس کے آدمی تھے' ان کی جانب سے پارٹی کے مرکزی سیکرٹری اطلاعات کو پبلسٹی مہم کے سلسلے میں ہدایات جاری کی جارہی ہیں نتیجہ آپ کے سامنے ہے جس لیڈر نے ایک نئی پارٹی کی بنیاد رکھ کر اسے منظم کیا جس کی ذاتی مقبولیت نے ملک کے کروڑوں ووٹروں کے دل جیتے۔

جس کی ذاتی کارکردگی کے بارے میں گذشتہ ۵ سال سے ریڈیو ٹیلیویژن اور اخبارات عوام کو آگاہ رکھ رہے تھے۔ اس کی "ذاتی تشہیر اور پروجیکشن" کے لئے "کمیٹی" قائم کی گئی۔ یہ "ترکیب" کسی انتہائی غیر سیاسی ذہن کی پیداوار ہو سکتی تھی۔ ہم لوگ وزیراعظم کی ذاتی مقبولیت کو پارٹی کا سرمایہ تصور کرتے تھے اور مشیران کرام ان کی "پروجیکشن" کے لئے "کمیٹی" بنا رہے تھے۔ انتخابی مہم کو "یونیورسل" بنانے کا نادر اور اچھوتا خیال بھی کسی پولیس مین کے ذہن میں آسکتا ہے کوئی سیاسی آدمی تو بھٹو صاحب کو "یونیورسل" میں لے جا کر الیکشن نہیں لڑا سکتا تھا۔ پولیس کا زیر ملازمت افسر مجھے نظریاتی ہدایات بھی جاری کر رہا تھا۔ دائیں اور بائیں بازو میں توازن کا درس دے رہا تھا۔ فطری بات تھی یہ خط پڑھ کر طبیعت مکدر ہوئی۔ میں نے ایک ملاقات میں وزیراعظم سے پھر گذارش کی کہ ہمیں پارٹی کی انتخابی مہم کو سیاسی ذرائع سے چلانا چاہئے' افسر سب کچھ کر سکتے ہیں لیکن دو کام ان کے بس میں نہیں ہوتے' ایک ووٹر کو پولنگ بوتھ تک لانا اور دوسرے انتخابی فضا پیدا کر کے اس میں سے سرخرو نکلنا۔ میری بات کی تصدیق بعد کے دو واقعات بھی کرتے ہیں۔ ریفرنڈم سرکاری ملازمین کا شو تھا اور انتخابات ۱۹۸۵ء سیاسی کارکنوں کے مابین تھے۔ دونوں کا فرق صاف ظاہر ہے۔

وزیراعظم نے میری معروضات کو "ذاتی خواہشات" کا نتیجہ سمجھا۔ چنانچہ وضاحت کرنے لگے کہ مجھے مکمل انتخابی مہم کا سربراہ کیوں نہیں بنایا گیا۔ اس وقت تک مسٹر بھٹو ہر مشورے کے پس پشت مفاد کا شک کرنے لگے تھے۔ مجھے اصرار عبث نظر آیا' چنانچہ میں نے خود ہی کہہ دیا.......... "بہرحال آپ نے جو انتظامات کئے ہیں بہتر ہوں گے' اس سلسلے میں میرے سپرد جو خدمت کی گئی ہے' خلوص سے سر انجام دوں گا' میں آج ہی راؤ صاحب کے حکم کی تعمیل کر دیتا ہوں۔"

"مولانا وہ راؤ کا نہیں میرا حکم ہے.......... اس نے تو میری جانب سے آپ کو مراسلہ لکھا ہے"

وزیراعظم نے گویا مجھے تنبیہ کی۔

بیورو کریسی کے نرغے میں

۱۹۷۰ء کے صوبائی اور قومی اسمبلیوں کے انتخابات جن حالات میں ہوئے' وہ کم از کم ہمارے لئے نارمل نہیں تھے۔ پارٹی ابھی تشکیل کے مراحل سے گزر رہی تھی۔ انتخابی سیاست کا اسے کوئی تجربہ نہ تھا۔ انتخابات آئے تو حالت یہ تھی کہ عوامی سطح پر تو پارٹی کی مقبولیت ہمہ گیر تھی لیکن قیادت کی صفیں غیر منظم تھیں۔ ایک چیئرمین کی ذات تھی۔ .... یا ان کے چند قریبی احباب نام کے لئے مجلس عاملہ اور کمیٹیاں تھیں لیکن انہیں سیاسی فیصلے کے اختیارات نہیں تھے۔ انتخابات کے لئے میدان میں اترتے وقت یہ سوال درپیش تھا کہ ایسے امیدوار کہاں سے لائیں جو ووٹوں کے اس سرمائے کو جو پورے ملک میں بکھرا ہوا ہے سمیٹ سکیں۔ جو افراد میسر آئے انہیں ٹکٹ دے دیئے گئے۔ انتخابی میدان کے نووارد کامیابی کے بعد بوکھلا گئے اور ان کی حالت ایسی تھی جیسے "شیدا" "جینیٹری" میں آن پھنسا ہو۔ روایتی انتخابی گھرانوں کے جو افراد پیپلز پارٹی کے ٹکٹ لینے آئے ان کا تعلق اپنے خاندانوں کی صف اول سے نہیں تھا۔ چند ایک نمایاں لیڈروں کو چھوڑ کر اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جو پارٹی پر ایک بوجھ تھے' جن کے سامنے "پلاٹ اور پرمٹ" سے بڑھ کر عظیم مقاصد تھے ہی نہیں یہ توقع تھا کہ ۱۹۷۴ء میں انتخابات کرا کے یہ بوجھ اتار دیا جاتا۔ ۱۹۷۷ء میں یہی بوجھ تھا جو درحقیقت پارٹی کو لے ڈوبا۔ ایک اہم بات یہ تھی کہ پنجاب اسمبلی میں مختلف گروپوں کے تنازعات منظر عام پر آچکے تھے۔ گروہ بندی شدید ہو چکی تھی۔ نئے انتخابات کے ذریعے اس گروہ بندی سے بھی چھٹکارا پایا جا سکتا تھا۔ اس طرح وہ صورت حال پیدا نہ ہوتی جس کے نتیجے میں بعد ازاں لاہور کے حلقہ نمبر ۶ ایسے واقعات رونما ہوئے اور ایک مضبوط حکومت کی فصیل میں درحقیقت پہلی دراڑ پڑی۔ یہ انتخابات ۱۹۷۴ء ہی میں اس وقت ہو جاتے جب اسلامی سربراہ کانفرنس ختم ہوئی تھی تو بھٹو صاحب کو ۱۹۷۹ء تک حکومت کرنے کا مینڈیٹ مل جاتا اور وہ اسمبلیوں کی تطہیر بھی کر سکتے تھے۔ مجھے یاد ہے وزیراعظم کو اپنی صفوں میں جوہر قابل کی کمی کا شدت سے احساس تھا اور انتخابات کے فیصلے کے پس منظر میں ان کا یہی احساس کارفرما تھا۔ سربراہی کانفرنس کے فوراً بعد انتخابات پر میرے اصرار کی وجہ یہ تھی کہ بھٹو صاحب کے پورے دور میں میرے نزدیک وہ ان کی مقبولیت کا نقطہ عروج تھا۔ اگر اس وقت انتخابات ہو جاتے تو مسٹر بھٹو اور پیپلز پارٹی دو تہائی سے بھی زیادہ اکثریت سے جیتتے۔

اگست ۱۹۷۶ء میں ہنری کسنجر نے وزیراعظم کو جو دھمکی دی تھی، وہ اپنی جگہ کتنی ہی سنجیدہ کیوں نہ ہوتی مطلوبہ نتائج پیدا نہیں کر سکتی تھی۔ یہ صرف **اس** لئے ہوا کہ فرانس کے ساتھ معاہدہ کے اگلے ہی سال انتخابی مہم آگئی۔ میرا یقین ہے کہ کوئی بیرونی قوت کتنی ہی بااثر کیوں نہ ہو حالات پیدا کرنے کی اہل نہیں ہوتی حالات ہم خود پیدا کرتے ہیں۔ بیرونی قوتیں اپنے اپنے مفادات کے ماتحت ان سے فائدے اٹھاتی ہیں۔ ری پراسیسنگ پلانٹ کی خریداری کا معاہدہ اور انتخابات کے انعقاد کے سلسلے میں وقت کا تعین بڑا اہم ہے یہ معاہدہ انتخابات کے فوراً بعد کرنا چاہئے تھا۔ چاہے ۱۹۷۴ء میں انتخابات کرانے کے بعد یا پھر ۱۹۷۷ء کے انتخابات کے بعد اس طرح حکومت کو نتائج کا سامنا کرنے کے لئے چار سال کا محفوظ عرصہ مل جاتا۔ یہ واضح کر دوں کہ میں یہ تبصرہ آج کر رہا ہوں اس وقت جب میں نے ۱۹۷۴ء میں انتخابات کرانے کا مشورہ دیا تھا یہ باتیں میرے پیش نظر نہیں تھیں بلکہ میرے پیش نظر تو صرف مسٹر بھٹو کی ذاتی مقبولیت کا گراف تھا۔ جس کی حالت اب یہ ہو چکی تھی کہ اس کی "پروجیکشن" کے لئے "کمیٹیاں" تشکیل دی جارہی تھیں۔ یہ "راز" تو مجھ پر بھی بہت بعد میں کھلا کہ راؤ عبدالرشید اور ان کی قبیل کے دیگر مشیران کرام پر مشتمل درحقیقت کتنی "کمیٹیاں" تھیں جو ۱۹۷۷ء کی انتخابی مہم کے لئے اپریل ۱۹۷۶ء سے کام کر رہی تھیں۔ انتخابات کے لئے "نمونے کا جو منصوبہ" خود وزیراعظم نے تیار کیا تھا، اس کی بنیاد ہی نوکر شاہی پر تھی۔ جس کے اہم ستون راؤ عبدالرشید کے علاوہ افضل سعید خان، وقار احمد، سعید احمد خان، مسعود محمود، محمد حیات ٹمن (مشیر برائے عوامی امور) مسٹر اکرم شیخ (ڈائرکٹر انٹیلی جینس بیوریو) مسٹر سعید احمد قریشی چیف سیکرٹری سندھ، مسٹر محمد خان جونیجو ہوم سیکرٹری سندھ، بریگیڈیر (ریٹائرڈ) ملک مظفر خان چیف سیکرٹری پنجاب، مسٹر منیر حسین چیف سیکرٹری صوبہ سرحد، مسٹر نصرمن اللہ چیف سیکرٹری بلوچستان، میجر جنرل امتیاز علی ملٹری سیکرٹری برائے وزیراعظم، مسٹر حامد جلال ایڈیشنل سیکرٹری برائے وزیراعظم تھے۔ یہ گویا وزیراعظم بھٹو کی "منی کیبنٹ" تھی جو ۱۹۷۷ء کے انتخابات کے منصوبے "آپریشن وکٹری" کی اصل خالق تھی۔ وفاقی وزیر پیداوار مسٹر رفیع رضا پوری انتخابی مہم کے انچارج تھے لیکن وزیراعظم کے منصوبے کے مطابق درجہ بہ درجہ پارٹی کی انتخابی مہم ڈپٹی کمشنروں، ایس۔ پی صاحبان اور تحصیل داروں سے لے کر پٹواری تک کے کاندھوں پر تھی۔ پیپلز پارٹی کے کارکنوں یا رہنماؤں کو انتخابات کی ذمہ داریوں سے یکسر علیحدہ کر دیا گیا تھا اور پوری پارٹی افسر شاہی کے کنٹرول میں تھی۔ جس کی ایک مثال میں نے گذشتہ باب میں اپنے نام راؤ عبدالرشید کے خط کی صورت میں پیش کی ہے۔ یہ ستم ظریفی کی انتہا تھی کہ جو پیپلز پارٹی انتہائی ناتجربہ کاری اور کسمپرسی کے عالم میں بھٹو صاحب کو ایوان اقتدار میں لے کر آئی، اسی پر دوسری مرتبہ چیئرمین کو اعتماد نہ تھا بلکہ وہ بیورو کریسی ان کے نزدیک زیادہ لائق اعتبار تھی جسے ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں چاروں شانے چت کر کے وہ برسر اقتدار آئے تھے۔ بیورو کریسی نے اس عرصے کے دوران نہایت خاموشی اور صفائی سے ایک طرف تو مسٹر بھٹو کا عوام سے

رابطہ کاٹ دیا تھا اور انہیں اپنے گھیرے میں لے لیا تھا جبکہ دوسری طرف اس نے پیپلز پارٹی اور اس کے پرجوش کارکنوں کا چیئرمین کے سامنے بھرم اور وقار ختم کر دیا تھا۔ ایک طرف بیورو کریٹ پارٹی کے کارکن کو کوئی پرمٹ، لائسنس، یا پلاٹ دیتا تھا اور دوسری طرف اس کی فائل کھول کر چیئرمین تک پہنچا دیتا تھا جس سے پارٹی کارکنوں کی بدعنوانیاں ثابت ہوتی ہوں۔ پارٹی کے جیالے کارکن تو بیورو کریسی کے اس کھیل کو کیا سمجھتے خود چیئرمین اس چال سے مات کھا گئے اور رفتہ رفتہ اس قدر افسر شاہی کے حصار میں چلے گئے کہ ان کے نزدیک پارٹی کا وجود اور عدم ایک برابر ہو گیا۔ پارٹی سے متعلق ہر فرد پر انہیں مفاد پرست ہونے کا شک ہوتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ انتخابات کے مرحلے پر انہوں نے سیدھے سبھاؤ پارٹی کی قوت اور عوام پر اعتماد کر کے انتخابات میں حصہ لینے کے بجائے، ان "خفیہ اقدامات" کا سہارا لیا، جو راؤ عبدالرشید اینڈ کمپنی کی پیشکش تھے۔ اس سلسلے میں درحقیقت کیا کچھ ہوا، مجھے اس کی تفصیلات کا علم اس لئے بھی نہیں کہ میں اس سارے خفیہ کھیل ہی سے الگ تھلگ تھا اور میں نے پوری دیانت داری کے ساتھ پیپلز پارٹی کی انتخابی مہم کو سیاسی انداز ہی میں چلایا تھا۔

اس سلسلے میں میں نے ملک بھر میں بڑے بڑے جلسے کئے، جلوسوں کی قیادت کی اور پیپلز پارٹی کی انتخابی مہم جو پی۔ این۔ اے کی جماعتوں کے مقابل قدرے دبی دبی سی تھی۔ اسے پیپلز پارٹی کا مخصوص جارحانہ رنگ روپ دیا۔ پیپلز پارٹی کے کارکنوں کی دفاعی پوزیشن کو ختم کیا۔ ایک ایک دن میں کئی کئی شہروں میں مختلف جلسوں سے خطاب کے ساتھ میں وزارت کی فائلوں کو بھی بھگتا رہا تھا اور مجھے فخر ہے کہ پرائم منسٹر سیکریٹریٹ کے بعد میری وزارت کا یہ ریکارڈ تھا کہ وہاں کوئی فائل ایک دن سے زیادہ کبھی نہ رکی تھی۔ میں نے یہ ہنر بھی وزیراعظم بھٹو سے سیکھا تھا۔ ان کی عادت تھی کہ رات گئے تک فائلوں کے مطالعہ میں ڈوبے رہتے اور بہت ہی کم ایسا ہوتا کہ کوئی فائل ان کے آفس میں ایک دن تک رکی ہو۔ ورنہ عموماً وہ اسی روز فائل پر اپنے ریمارکس یا احکامات لکھ کر متعلقہ محکمے کو واپس بھجوا دیتے تھے۔ میں نے اس معاملے میں ان سے زیادہ آہنی اعصاب کا مالک آدمی کم ہی دیکھا ہے۔

پریس پبلسٹی کمیٹیوں کی تشکیل کے سلسلے میں میں نے راؤ عبدالرشید کے مراسلہ کا جواب دیا جس میں ان افراد کے نام تجویز کر دیئے جو مجھ سے مانگے گئے تھے۔ کمیٹی کے کام کے دائرہ کار اور اس کے عرصہ کار کے علاوہ میں نے کمیٹی کے ارکان کو ادائیگیوں کے بارے میں بھی دریافت کیا تھا کہ ان کا معاوضہ کس طرح دیا جائے گا۔ اس کمیٹی میں چند معروف صحافی بھی شامل تھے۔ وزیراعظم بھٹو پارٹی کے ترجمان اخبار مساوات کے بارے میں بہت زیادہ حساس تھے اور ان کی خواہش تھی کہ میں اس اخبار کے سلسلے میں ذاتی دلچسپی لوں، اس سلسلے میں انہوں نے ۱۴ جون ۱۹۷۶ء کو مجھے جو مکتوب تحریر کیا، وہ ملاحظہ فرمایئے۔

ISLAM IS OUR FAITH
DEMOCRACY IS OUR POLITY
SOCIALISM IS OUR ECONOMY
ALL POWERS TO THE PEOPLE

ڈیئر مسٹر نیازی!

آپ جانتے ہیں کہ اردو روزنامہ مساوات کراچی، لاہور اور لائل پور سے میر جمیل الرحمٰن کی ادارت میں شائع ہوتا ہے۔ میں نے آپ سے کئی مرتبہ کہا ہے کہ یہ پرچہ ہماری ذمہ دار شخصیات کی مدد اور عدم توجہی کی وجہ سے بہت سے مصائب کا شکار رہتا ہے اور اب بھی ہے۔ اب اس کا وہ مقام بھی نہیں رہا جو ماضی میں ہوتا تھا۔ مساوات ہمارا اپنا اخبار ہے اور یہ آپ کی بھرپور مدد اور توجہ کا مستحق ہے صرف آپ کی ذاتی اور گہری توجہ اور دلچسپی ہی اسے ملک کے دیگر بڑے اخبارات کے مقابل لا کر اس کی پوزیشن بحال کر سکتی ہے۔ مساوات کو اب تک آپ کی وزارت اور آپ کی جانب سے جو مدد مل رہی ہے یہ اس سے کہیں زیادہ کا مستحق ہے۔ میں ایک مرتبہ پھر اس کے لئے آپ کی ذاتی دلچسپی کے حصول کا خواہاں ہوں اور چاہتا ہوں کہ وفاقی دارالحکومت اور صوبائی ہیڈ کوارٹرز میں آپ اس کے نمائندوں کی بھرپور مدد کریں جن کا تعین خود میں نے کیا ہے۔ یہ سب بڑے تجربہ کار صحافی ہیں۔ دوسرے اخبارات کے صحافیوں کی نسبت یہ آپ کی زیادہ توجہ کے متمنی ہیں حکومت اور پارٹی کی پالیسیوں اور پروگراموں کے سلسلے میں ان کے ساتھ آپ کا تعاون بہت ضروری ہے۔ اس کے بغیر اخبار کا دوسرے اخبارات کے معیار تک آنا ممکن نہیں ہے مجھے بھرپور یقین ہے کہ آپ اسے دوسرے بڑے اشاعتی اداروں کے اخبارات کے مقابل لانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کریں گے۔ میں نے مساوات کے نمائندوں کو ہدایت کر دی ہے کہ وہ آپ سے قریبی روابط رکھیں وہ آپ کے اشارے کے منتظر رہیں گے۔ براہ کرم اپنے قیمتی وقت میں سے حکومت اور پارٹی کی خاطر کچھ وقت مساوات کو دیں۔ اگر آپ ضرورت محسوس کریں تو مساوات کے مسئلہ پر جب چاہیں مجھ سے گفتگو کر لیں اور اس سلسلے میں کوئی جھجک محسوس نہ کریں۔

آپ کا مخلص
ذوالفقار علی بھٹو

اصل متن کیلئے ملاحظہ ہو ضمیمہ جات

وزیر اعظم کی خواہش در حقیقت یہ تھی کہ انتخابی مہم کے باقاعدہ آغاز سے پہلے پارٹی کی پبلسٹی کو مؤثر بنانے کے لئے مساوات کو ایک مرتبہ پھر ۱۹۷۰ء جیسی پوزیشن پر لے آیا جائے۔ لیکن بدقسمتی سے یہ ممکن ہی نہ تھا۔ کیونکہ گذشتہ چند سالوں میں مساوات کے پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر چکا تھا اور اخبار بوجوہ اپنی اس کریڈیبلٹی سے محروم ہو چکا تھا جو ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں اسے حاصل تھی۔

وزیر اعظم انتخابات سے قبل پارٹی اور حکومت کی پبلسٹی مہم کے بارے میں کس درجہ حساس تھے، اس کا اندازہ ایک اور مراسلہ سے کیا جا سکتا ہے جو انہوں نے لاہور میں اپنے قیام کے دوران ۲۲ دسمبر ۱۹۷۶ء کو نمبر ۷۶ (پی۔ایم) پی۔ایس۔بی۔۱۲۰۳۔ ڈی کے تحت مسٹر رفیع رضا، مجھے، وزیر اطلاعات حنیف خان اور چاروں صوبوں کے وزرائے اعلیٰ کو بھجوایا تھا۔ مکتوب کے مطابق کسی نامعلوم مبصر نے ان کی توجہ اس جانب مبذول کرائی تو انہیں بھی احساس ہوا کہ پارٹی کی پروپیگنڈہ مہم میں بھانڈوں کو بھی منظم کیا جانا چاہئے اس مکتوب کا مکمل انگریزی متن بھی آپ ضمیمہ جات میں ملاحظہ کر سکتے ہیں۔

○..........○..........○

" ایک بیرونی مبصر نے جو بلاشبہ اشیاء کو سمجھنے کی تیز صلاحیت رکھتے ہیں لکھا ہے۔

اطلاعات کی وفاقی اور صوبائی وزارتیں مہم کی ضروریات پر شاید ہی پوری اتر سکیں بہت سے باورچیوں کی طرح وفاقی وزارت اطلاعات اس قدر غبی اور کند ذہن واقع ہوئی ہے کہ ہو سکتا ہے کہ وہ سارے کام کا ستیاناس کر دے۔ صوبائی سیکریٹریٹ خصوصاً طاقت کے منبع صوبہ پنجاب کی حالت موزوں افراد کے لحاظ سے نہایت قابل رحم ہے اب تک مجھے یقین ہو چکا ہے کہ کسی نے بھی عام انتخابات اور پیپلز پارٹی کی حکومت کے ثمرات کے بارے میں کچھ سوچنے کی زحمت تک نہیں کی۔ بیچارے بیچارے۔ وزیراعظم کو تن تنہا لوگوں کو یہ بتانا پڑ رہا ہے کہ گزشتہ حکومتوں کے دور میں صوبوں کی کیا حالت تھی اور اب انہیں کیا کچھ حاصل ہو رہا ہے۔ ملک میں کس قدر منصوبے زیر عمل ہیں۔ پیپلز پارٹی کے دور حکومت میں کھولے جانے والے سکولوں، کالجوں اور ہسپتالوں کی تعداد کیا ہے۔ اساتذہ اور ڈاکٹروں وغیرہ کو کس قدر فائدہ پہنچا ہے۔ مزدوروں اور کسانوں کو کیا کچھ حاصل ہوا ہے۔ ان چیزوں کے بارے میں اعداد و شمار اور نشستوں کے حامل پوسٹر کہاں ہیں؟ اس ضمن میں کس قسم کے مضامین لکھے جانے چاہئیں، کارٹون کیسے ہونے چاہئیں اور تشہیری مہم کیسے منظم کی جانی چاہئے اور حزب اختلاف کا خاکہ کیسے اڑانا چاہئے، یہ سب کچھ اور اس کے علاوہ حزب اختلاف کے خلاف ہر قصبے اور ضلع میں افواہیں پھیلانے کے سیل اور سراغرسانی کے مرکز کھولے اور چلائے جانے چاہئیں۔ اس وقت تک انتخابی مہم کے موضوع کے بارے میں غور و فکر اور ہر ضلع کے انفرادی سروے مکمل ہو جانا چاہئے تھا۔ یہ سب کچھ کیوں نہیں کیا گیا؟"۔

۲۔ اس تحریر کے مصنف کو بلاشبہ آئندہ انتخابات کے بارے میں کی جانے والی ہماری تیاریوں کا علم نہیں، تاہم ہم جو اقدامات کر رہے ہیں اگر ان کے نتائج ظاہر ہوئے تو کوئی اندرونی اور بیرونی مبصر اس طرح محسوس نہیں کرے گا جس طرح وہ کرتا ہے بلکہ آپ کی طرح اس کی پیش کردہ تجاویز پر غور و فکر کرنا اور جہاں تک آپ کی ذمہ داریوں کا تعلق ہے ان پر عمل کرنا چاہوں گا۔ ہمیں اطلاعات اور ذرائع ابلاغ کے ذریعے عوام کو عوامی حکومت کے ثمرات کے بارے میں بتا کر کوئی مؤثر راستہ اپنانا چاہئے۔ اس سلسلہ میں تمام وفاقی اور صوبائی وزراء کی طرف سے اپنی اپنی دلچسپیوں اور ذمہ داریوں کے سلسلہ میں ذاتی سطح پر بات چیت اور وضاحت کرنا بھی شامل ہے۔ اس مبصر نے جن خامیوں کی نشاندہی کی ہے عام لوگ ان سے بخوبی واقف ہیں اور مجھے یقین ہے کہ وہ تمام مسائل کے بارے میں فراہم کی جانے والی معلومات کا اپنے فہم و ادراک سے بھی بڑھ کر خیر مقدم کریں گے۔ ہماری کوشش یہ ہونی چاہئے کہ عوام کو مطلوبہ معلومات اس انداز سے فراہم کریں جس سے ان کی دلچسپی اور توجہ کو انگیخت ملے۔ کامرانیوں اور مسائل کے

حقیقی تجزیہ و تشریح سے ہم وہ مقاصد حاصل نہیں کر سکتے جو ہم حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اصل مقصد عوامی حکومت کی کامرانیاں اور کوششیں عوام کے سامنے متاثر کن انداز سے پیش کی جائیں تاکہ حزب اختلاف کی طرف سے کی جانے والی تنقید عوام کو مضحکہ خیز نظر آنے لگے۔ اس طرح مخالفت کرنے والے عناصر خود بخود ننگے ہو جائیں گے اور عوام ہماری کسی ارادی کوشش کے بغیر انہیں ان کے اصلی رنگ میں دیکھنے لگیں گے۔

۳۔ مجھے توقع ہے کہ اس مختصری تحریر کے ذریعے میں نے آپ تک جو کچھ پہنچانے کی کوشش کی ہے وہ آپ کی سمجھ میں آگیا ہو گا اور اب یہ میں آپ پر چھوڑتا ہوں کہ آپ خود فیصلہ کریں کہ آپ کو اپنے مخصوص حلقہ کار میں کیسے کام کرنا ہے۔

دستخط (وزیراعظم)
کیمپ لاہور

وزیر پیداوار (مسٹر رفیع رضا)
وزیر برائے مذہبی امور (مولانا کوثر نیازی)
وزیر اطلاعات و نشریات (مسٹر محمد حنیف خان)
وزیر اعلیٰ پنجاب (مسٹر صادق حسین قریشی)
وزیر اعلیٰ سندھ (مسٹر غلام مصطفےٰ جتوئی)
وزیر اعلیٰ سرحد (مسٹر نصر اللہ خان خٹک)
وزیر اعلیٰ بلوچستان (مسٹر محمد خان باروزئی)

انہی روز و شب کے ہنگاموں میں ۱۹۷۷ء سر پر آ پہنچا اور جنوری ۱۹۷۷ء کو وزیر اعظم کی جانب سے مجھے اپنی رہائش گاہ پر ایک مکتوب موصول ہوا جس میں اطلاع دی گئی تھی کہ ہمارا عرصہ اقتدار پورا ہو رہا ہے اور اب ہمیں انتخابات میں اُترنا ہے۔ یہ مکتوب بغیر کسی ڈائری نمبر کے تھا اور دستی بھجوایا گیا تھا۔ مکتوب کے آخر میں میری رہائش گاہ کا پتہ اور وزیر کی جگہ صرف ایم۔ این۔ اے تحریر تھا۔ گویا ہمارے لئے اطلاع تھی کہ اب ہم لنگر لنگوٹ کس کر انتخابات کے میدان میں اتر آئیں۔ پہلے آپ یہ مکتوب مطالعہ کر لیں۔

○ .... ○ .... ○

خفیہ

وزیر اعظم ہاؤس
راولپنڈی
۸ جنوری ۱۹۷۷ء

مائی ڈیئر مولانا صاحب!

اب جبکہ ہماری پاکستان کے عوام کے منتخب نمائندوں کی معیاد جس کے دوران مجھے ملک کے چیف ایگزیکٹو کے طور پر اپنے وطن کی خدمت کرنے کا موقع نصیب ہوا، ختم ہونے والی ہے، میں ان اہم سالوں کے دوران آپ کے تعاون اور اعانت کیلئے اپنی گرمجوش اور مخلصانہ تعریف کا اظہار کرتا ہوں۔

اللہ تعالیٰ نے ایک ٹوٹے پھوٹے، شکست خوردہ اور بے حوصلہ ملک کی عنان حکومت میرے ہاتھوں میں سونپ دی اور اس کی تعمیر نو کی رہنمائی کرنے کے عظیم کام کا بوجھ میرے کندھوں پر ڈال دیا۔ یہ ایک نہایت ہمت شکن چیلنج تھا، لیکن میں نے اللہ پر اعتماد، اپنے ہم وطنوں کی دعاؤں اور اپنے ساتھیوں کی مدد و اعانت کے بھروسہ پر اسے قبول کر لیا۔ کوئی فرد غلطیوں اور خامیوں سے مبرا نہیں ہوتا۔ میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ مجھ سے کوئی غلطی نہیں ہوئی ہوگی، تاہم میں یہ ضرور محسوس کرتا ہوں کہ میں اس سے زیادہ بہتر طور پر کچھ کر سکتا تھا، لیکن جو بھی خامیاں رہی ہوں وہ اس لئے نہیں تھیں کہ میری کوششوں میں کوئی کمی رہی ہو۔ میرے وقت کا ہر لمحہ اور میری توانائی کا ہر قطرہ خدمت وطن کیلئے صرف ہوا۔ بعض اوقات رکاوٹیں بظاہر ناقابل تسخیر نظر آتی تھیں، لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہم نے ان پر قابو پا لیا اور دنیا نے ہماری قوم میں اوپر اٹھنے کی جو قوت پائی جاتی ہے اس کا نظارہ اپنی آنکھوں سے کیا۔ میں بڑے اعتماد سے کہہ سکتا ہوں کہ محب وطن قوتوں کے تعاون سے قومی وقار پوری طرح سے بحال کیا جا چکا ہے اور میرے وطن کے عوام نفسیاتی طور پر پوری طرح سے بحال ہو چکے ہیں۔

گزشتہ پانچ سالوں کے دوران میں جو دور رس تبدیلیاں وقوع پذیر ہوئی ہیں ان کی مثال ہمارے ملک کی کسی سابقہ حکومت کے دور حکومت اور نہایت ترقی یافتہ ممالک میں بھی نہیں ملتی۔ یہ تبدیلیاں ہماری قومی زندگی میں پوری طرح سرایت کر چکی ہیں اور یہ تبدیلیاں ان مفاد پرست عناصر کی کٹر مخالفت کے باوجود لائی گئیں جو پاکستان کو اپنے چنگل میں لئے ہوئے تھے۔ اب تبدیلی کی ہوا ہماری حسین سرزمین کے آر پار محو خرام ہے۔ ابھی ہمیں پاکستان کو اپنے تصور کے مطابق ترقی اور خوشحالی کے ڈھانچے میں ڈھالنے کیلئے طویل سفر درپیش ہے۔ ابھی ہمیں عام شہری کو یہ محسوس کرانا ہے کہ وہ معاشرے کا اٹوٹ اور ہم پایہ حصہ ہے۔

چنانچہ اسی ریکارڈ کی بنیاد پر میں اپنے رائے دہندگان کے پاس دوسری معیاد کیلئے اعتماد کا ووٹ حاصل کرنے کیلئے جا رہا ہوں تاکہ ہم نے معاشرے میں جس معاشرتی و معاشی انصاف کی بنیاد رکھی ہے اور جو ابھی تک اپنی جڑیں مضبوط بنانے کے عمل سے گزر رہا ہے اسے کامیابی سے مستحکم کیا جا سکے۔ اگرچہ مجھے پوری

طرح سے اعتماد ہے کہ میرے اہل قوم فیصلہ کریں گے اور پوری دانائی سے فیصلہ کریں گے تاہم اپنے حکمران منتخب کرنے کا انہیں حق ہے۔ اگر وہ کوئی مختلف فیصلہ کرتے ہیں، مجھے کوئی تاسف نہیں ہو گا اس پر بھی میرے محسوسات میں یہ فخر شامل ہو گا کہ مجھے شدید ضرورت کے وقت قومی خدمت کیلئے پکارا گیا اور میں نے قوم کو مایوس نہیں کیا۔ پاکستان پیپلز پارٹی دوبارہ برسر اقتدار آتی ہے یا نہیں اور ہمیں دوبارہ مل کر اپنے عوام کی خدمت کرنے کا موقع ملتا ہے یا نہیں ملکی تاریخ کے آزمائشی دور میں آپ نے میرا جو ساتھ دیا اس کیلئے میں اس موقع پر آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

پاکستان پائندہ باد

آپ کا مخلص

دستخط (ذوالفقار علی بھٹو)

مولانا کوثر نیازی

رکن قومی اسمبلی

۲۹۳/ایف۔ ۶/۳ اسلام آباد

اصل متن کیلئے ملاحظہ ہو ضمیمہ جات

اس مکتوب کے ملنے کے بعد میں نے پبلسٹی سیل کا قائم مقام انچارج شیخ حامد محمود مرحوم کو بنایا اور خود اپنے دوروں اور جلسوں کے پروگرام وضع کرنے شروع کر دیئے اس سلسلے میں اپنے شیڈول سے وزیر اعظم کو میں نے پوری طرح آگاہ رکھا۔

۲۷ جنوری ۱۹۷۷ء کو میں نے اس سلسلے میں وزیر اعظم کو جو نوٹ لکھا اس پر وزیر اعظم نے جواباً تحریر فرمایا۔ "یہ کام جاری رکھیں میں آپ کی کامیابی کا خواہش مند ہوں"۔

قصہ دراصل یہ تھا کہ وزیر اعظم کو وزیر داخلہ خان عبدالقیوم خان مرحوم نے کافی خوفزدہ کر رکھا تھا کہ صوبہ سرحد میں علما کی سرگرمیاں حکومت کے بہت خلاف ہیں۔ علما بہت بگڑے ہوئے ہیں وزیر اعظم نے مجھے حکم دیا کہ میں فوری طور پر صوبہ سرحد جاؤں اور علما کی سرگرمیوں کا تدارک کر دوں۔ میں نے اس سلسلے میں ۲۳ دسمبر ۱۹۷۶ء کو وزیر اعظم کو ایک رپورٹ بھیجی جس کا ترجمہ یہ ہے۔

O .... O .... O .

حکومت پاکستان
وزارت مذہبی امور، اقلیتی امور و سمندر پار پاکستان

یادداشت برائے وزیراعظم

موضوع = صوبہ سرحد میں علماء کی خلاف عوام سرگرمیاں

....

حال ہی میں وزیراعظم نے مجھے حکم دیا تھا کہ مجھے صوبہ سرحد میں عوام اور حکومت کے مخالفانہ مصروفیات میں ملوث علماء کی سرگرمیوں کے سدباب کیلئے مناسب اقدامات کرنے چاہئیں۔ یہ بھی بتایا گیا تھا کہ بہت سے علماء وقتاً فوقتاً قابل اعتراض اور حکومت مخالف تقاریر کر رہے ہیں۔

۲۔ وزیراعظم کے حکم کی تعمیل میں، میں پشاور گیا اور ایک اجلاس بلایا جس میں درج ذیل حضرات نے شرکت کی۔

(۱)۔ عبدالرزاق خان، صوبائی وزیر صوبہ سرحد
(۲)۔ سیکرٹری اوقاف، حکومت صوبہ سرحد
(۳)۔ سنٹرل انٹیلی جنس ایجنسی کا ایک نمائندہ
(۴)۔ ڈپٹی انسپکٹر جنرل (سپیشل پولیس) صوبہ سرحد

۳۔ اس اجلاس میں فیصلہ کیا گیا کہ پہلے مرحلہ میں تین حصوں پر مشتمل صوبہ سرحد کے علماء کی ایک مفصل فہرست فوری طور پر تیار کی جائے۔

(۱)۔ ان علماء کی فہرست جو حکومت کے مخالف ہیں۔ اس فہرست کے دو حصے ہوں گے۔

(الف) ان علماء کی فہرست جن کی وابستگی عوام مخالف عناصر اور حزب اختلاف کی جماعتوں کے ساتھ ہے۔

(ب)۔ ان علماء کی فہرست جو حکومت کی مخالفت کسی غلط فہمی کی بنا پر کرتے ہیں لیکن ان کا عوام مخالف اور حزب اختلاف کی جماعتوں سے کوئی تعلق نہیں۔

(۲)۔ ان علماء کی فہرست جو غیر جانبدار ہیں اور جن کی کوئی سیاسی وابستگی نہیں۔
(۳)۔ محکمہ اوقاف کے علماء کی فہرست۔

۴۔ اجلاس میں مزید فیصلہ کیا گیا کہ میں جلد از جلد صوبہ سرحد کا دورہ کروں۔ چنانچہ میں نے پشاور ڈویژن

کے علماء سے خطاب کرنے کیلئے ۴ جنوری ۱۹۷۷ء کو پشاور جانے کا پروگرام بنایا ہے۔ اس اجتماع میں محکمہ اوقاف کے علماء کے علاوہ وہ علماء شرکت کریں گے جن کی حزب اختلاف کی جماعتوں اور عوام مخالف عناصر سے کسی قسم کی وابستگی نہیں ہے۔ یہ اجلاس سوال جواب کی طرز پر منعقد کیا جائے گا تاکہ علماء کے ذہن میں کوئی غلط فہمی ہو تو اسے رفع کیا جا سکے۔ ان اجلاسوں کی کسی قسم کی تشہیر نہ کرنے کی تجویز ہے۔ میں معروف علماء سے ذاتی طور پر بھی ملوں گا اور محکمہ اوقاف کے خطیبوں اور آئمہ سمیت ان کو سمجھانے کی کوشش کروں گا تاکہ ان کے ذریعے حزب اختلاف سے متعلق علماء کے پروپیگنڈا کا توڑ کیا جا سکے۔ پشاور اور صوبہ سرحد کے دوسرے مقامات پر علماء کے ساتھ اپنی ملاقاتوں کے دوران میں ان کے مسائل حل کرنے کیلئے مالی اور ہر قسم کی دوسری ممکن امداد کی پیشکش کروں گا لیکن اگر اس کے باوجود حکومت کے بارے میں ان کا رویہ معاندانہ رہتا ہے تو پھر ان سے نمٹنے کیلئے ان کو انتظامیہ کے حوالے کر دیا جائے گا۔

۵۔ ۵ جنوری کو میں مردان ڈویژن کے علماء سے خطاب کرنے مردان جاؤں گا۔ ۹ اور ۱۰ جنوری کو میں ڈیرہ اسماعیل خان کے علماء کو جن میں بنوں کے علماء بھی شامل ہوں گے خطاب کرنے کی تجویز پیش کرتا ہوں مجھے پارٹی کے کارکنوں کی طرف سے ڈیرہ اسماعیل خان میں ایک جلسہ عام سے خطاب کی دعوت بھی مل چکی ہے یہ کام وزیراعظم کی منظوری سے کیا جائے گا۔

۶۔ صوبائی حکومت کی رپورٹوں کے مطابق ہزارہ ڈویژن میں کسی قسم کی شرانگیزی نہیں ہے، لہٰذا میں فوری طور پر اس ڈویژن کا دورہ کرنے کا مشورہ نہیں دیتا، تاہم اگر اس ڈویژن میں کسی قسم کی مشکل کے بارے میں وزیراعظم کو علم ہو تو میں یقیناً ہزارہ کا دورہ بھی کروں گا اور صورتحال سے نمٹنے کیلئے تمام مناسب اقدامات کروں گا۔

۷۔ صوبہ سرحد کے دورہ سے واپسی پر میں اس دورہ کے نتائج کے بارے میں وزیراعظمؒ کی خدمت میں رپورٹ پیش کروں گا۔

دستخط (کوثر نیازی)
۲۳-۱۲-۱۹۷۶

وزیراعظم نے اس پر مجھے لکھا۔

مجھے یقین ہے یہ ایک نہایت کامیاب کام ہو گا۔

دستخط (وزیراعظم)

وزیر برائے مذہبی امور (بائی نیم)

اصل متن کیلئے ملاحظہ ہو ضمیمہ جات

مجھے وزیر اعظم نے جنوری ۱۹۷۷ء میں ہدایت دے دی تھی کہ میں بڑے جلسوں کا آغاز کر دوں۔ طریقہ کار یہ تجویز ہوا تھا کہ پہلے پاکستان کے تمام بڑے بڑے شہروں میں جلسے کر کے میں پی۔ این۔ اے کو جس حد تک ممکن ہو دفاعی پوزیشن پر لے آؤں اس کے بعد خود وزیر اعظم اس کے سیاسی قلعوں پر حملوں کا آغاز کریں۔ اگرچہ انتخابی مہم کے مکمل انچارج رفیع رضا تھے۔ جو بلاشبہ مسٹر بھٹو کے لئے بے حد مخلص تھے اور انہیں صحیح مشورے دیتے تھے۔ وہ بے حد شریف انسان بھی تھے اور بھٹو صاحب کے کافی قریب بھی۔ بے حد ذہین تھے مگر غیر سیاسی آدمی ہونے کی وجہ سے ایک اعتبار سے بیورو کریٹ بھی تھے۔ بڑے دیانت دار اور با اصول تھے لیکن سیاسی جھمیلوں سے خود کو الگ رکھ کر ڈرائنگ روم سیاست تک محدود رکھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ کسی بھی حلقہ سے خود کھڑے نہ ہوئے تھے۔ میں نے اپنی خطابت کے ذریعے پی۔ این۔ اے کی انتخابی مہم جوئی کو پسپائی پر مجبور کر دیا اور ان کی بعض کمزور رگوں پر ہاتھ رکھا تو عوام نے بھی دیکھا اور خود وزیر اعظم نے بھی کہ ایک طرف پی۔ این۔ اے کے نو ستارے تھے اور دوسری جانب پیپلز پارٹی کی طرف سے میں اکیلا ان سے کہیں زیادہ بڑے جلسے کر کے انہیں میدان سے پسپائی اختیار کرنے پہ مجبور کر رہا تھا اس طرح بھٹو صاحب کے لئے میدان میں اترنے کا راستہ ہموار ہوتا جا رہا تھا۔

ایک دفعہ پی۔ این۔ اے کے تضادات کو زیادہ سے زیادہ نمایاں کرنے کی غرض سے میں نے ایک جلسہ عام میں چیلنج دیا کہ اگر یہ لوگ نظام مصطفٰی کے نفاذ میں اتنے ہی مخلص ہیں اور ان کا اتحاد بھی خلوص نیت پر مبنی ہے تو مولانا شاہ احمد نورانی مفتی محمود کے پیچھے نماز ادا کر کے دکھائیں اور پھر اس کی قضا بھی ادا نہ کریں۔ اگر ایسا ہو گا تو میں پیپلز پارٹی کی طرف سے اعلان کرتا ہوں کہ ہم پی۔ این۔ اے کے امیدواروں کے مقابلے میں اپنے تمام امیدوار بٹھا دیں گے۔

میرے اس چیلنج کا ہر دو جانب بڑا گہرا اثر مرتب ہوا پی۔ این۔ اے والے بھی جانتے تھے اور میں بھی کہ حضرت مولانا شاہ احمد نورانی کی گردن پر اگر تلوار بھی رکھ دی جائے تو وہ مفتی محمود کی امامت میں کبھی نماز نہیں پڑھیں گے۔ لیکن وزیر اعظم بھٹو کو چونکہ ان علما کے اختلافات سے آگہی ذرا کم تھی اس لئے وہ گھبرا گئے اور مجھے اس رات فون کر کے کہنے لگے کہ "یہ تم نے کیا چیلنج کر دیا۔ تم ان لوگوں کو نہیں جانتے' یہ لوگ ایسا کر گزریں گے" پھر اسی شام ایک جلسے سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ "کوثر نیازی نے ان لوگوں کو اپنے امیدوار دو ذرا کرنے کا چیلنج تو دے دیا ہے لیکن وہ نہیں جانتا کہ اگر الیکشن جیتنے کے لئے ان لوگوں کو مرزا غلام احمد قادیانی کی قبر پر بھی جانا پڑا تو یہ دریغ نہیں کریں گے" میں نے بھٹو صاحب کو فون پر تسلی دی کہ وہ پریشان نہ ہوں ایسا کبھی نہ ہو گا' میں ان کے مسلک اور مسائل سے اچھی طرح واقف ہوں پھر بھی مسٹر بھٹو کو اصرار رہا کہ میں ایسا چیلنج نہ دوں لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا اور اب عوام پی۔ این۔ اے کی جماعتوں کے دعوئ اتحاد کو آزمانے پر تل گئے تھے چنانچہ ملتان کے ابن قاسم

باغ میں جلسہ عام کے دوران مغرب کی نماز مولانا مفتی محمود نے مولانا شاہ احمد نورانی کی اقتدا میں ادا کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ انہوں نے میرا چیلنج قبول کر لیا ہے۔ میں نے اسی شام ایک جلسے میں اپنا چیلنج دہرایا اور کہا کہ ...... "میں نے چیلنج یہ دیا تھا کہ شاہ احمد نورانی مفتی محمود کی امامت میں نماز ادا کریں یہ نہیں کہا تھا کہ مفتی محمود شاہ احمد نورانی کی امامت میں نماز ادا کر کے دکھائیں" اس پر پی۔ این۔ اے کو سانپ سونگھ گیا۔

اگلے روز لاہور ایئرپورٹ پر حضرت شاہ احمد نورانی سے اتفاقاً میری ملاقات ہو گئی۔ انہوں نے مجھ سے مشفقانہ گلہ کیا اور بولے۔ "تم نے ہماری دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا ہے"

انتخابی مہم اپنے پورے عروج پر تھی اور میں لوگوں کا جوش و خروش دیکھ کر اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ پیپلز پارٹی بھاری اکثریت سے الیکشن جیت لے گی اگرچہ مجھے اس کا بھی علم تھا کہ بعض انتخابی نتائج میں امیدواروں کی فتح و شکست کا فیصلہ صرف چند سو یا چند ہزار ووٹوں کے فرق سے ہو گا۔ تاہم مجھے اس امر کا پورا یقین تھا کہ جیت پیپلز پارٹی ہی کی ہو گی۔

اس وقت تک مسٹر بھٹو کا "آپریشن وکٹری" نامی منصوبہ میرے علم میں نہ تھا۔ یہ تو میں جانتا تھا کہ وہ بسا اوقات کسی بھی ضلع کے ڈپٹی کمشنرز اور ایس پی تک سے براہ راست معلومات حاصل کرتے تھے۔ لیکن مجھے اس کا کوئی علم نہ تھا کہ انتخابات میں رگنگ (دھاندلی) کا کوئی طے شدہ منصوبہ بھی راؤ رشید اینڈ کمپنی وضع کر چکی تھی۔ یہ پس منظر کے لوگ تھے اور ہم پیش منظر میں سیاسی جنگ سیاسی طور طریقوں کے مطابق لڑ رہے تھے۔

انتخابات میں رگنگ کا سب سے پہلا انکشاف مجھ پر مارچ کے دو ہی روز بعد اس وقت ہوا جب پی۔ این۔ اے اپنا ایجی ٹیشن شروع کر چکی تھی' اس نے انتخابی نتائج کو مسترد کر دیا تھا ایک شام پی۔ ایم ہاؤس میں وزیر اعظم بھٹو' میں' حفیظ پیرزادہ' رفیع رضا اور ایک دو اور احباب موجود تھے کہ وزیر اعظم نے پیرزادہ کی طرف دیکھا اور گویا ہوئے۔ "حفیظ کتنی سیٹوں پر گڑبڑ ہوئی ہو گی؟"

"سر........ ۳۰ سے ۴۰ تک" حفیظ نے مختصر جواب دیا"

"کیا ہم پی۔ این۔ اے والوں سے یہ بات نہیں کر سکتے کہ وہ اتنی سیٹوں پر اپنے نمائندے کامیاب کرا لیں ہم ضمنی انتخابات میں حصہ نہیں لیں گے؟"

وزیر اعظم کی بات سن کر میرا کیا حال تھا؟ بس اتنا جان لیں کہ میں ان کے چہرے کی طرف دیکھتے کا دیکھتا ہی رہ گیا تھا اور اپنے آپ کو اچانک ہی بہت بے خبر اور احمق سا محسوس کرنے لگا تھا کیونکہ میں نے تو اپنی دانست میں پیپلز پارٹی کو بالکل صاف ستھرے انتخابات میں فتح دلانے کے لئے شبانہ روز محنت کی تھی۔ انتخابی مہم کے دوران اپنی تقاریر کے ذریعے وہ "ٹیمپو" بنایا تھا جو ووٹرز کو پولنگ کے دن پیپلز پارٹی کے حق میں ووٹ ڈالنے کے لئے گھروں سے نکالنے کے لئے کافی تھا.......... پھر یہ میں کیا سن رہا تھا؟ کیا وزیر

اعظم جانتے تھے کہ انتخابات میں رگنگ ہوگی۔ رگنگ کرائی جارہی ہے۔ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ مجھے اپنی ساری محنت کارلا حاصل نظر آرہی تھی۔

○......○......○......○

چوتھا باب

نجومیوں اور دست شناسوں سے مشورے

۷ جنوری ۱۹۷۷ء کو قومی اسمبلی میں وزیر اعظم بھٹو نے جب ۷ مارچ کے الیکشن کا اعلان کیا تو پیپلز پارٹی کی سیاسی حکمت عملی جس پر انہوں نے ہم سے مشورہ لیا تھا ، یہ طے پائی کہ اپوزیشن کی تمام جماعتیں باہمی انتشار اور خلفشار کی شکار ہیں۔ ان میں اتنے تضادات ہیں کہ یہ جماعتیں شاید ہی انتخابی اتحاد قائم کر کے پیپلز پارٹی کے امیدواروں کے مقابل متفقہ امیدوار کھڑے کر سکیں۔ اس وقت تک بعض سیاسی جماعتوں کا ایک اتحاد ملک میں یو۔ ڈی۔ الیف کے نام سے موجود تھا جس میں جمعیت العلمائے پاکستان اور تحریک استقلال شامل نہیں تھیں ۔جماعت اسلامی یو۔ ڈی۔ الیف کی سب سے قابل ذکر اور منظم جماعت تھی اور دوسری جماعت این۔ ڈی۔ پی تھی۔ جس کے سربراہ سردار شیرباز مزاری تھے۔ یہ درحقیقت انہی افراد پر مشتمل تھی جن کی سیاسی سرگرمیاں نیپ پر پابندی کے بعد تقریباً ختم ہو کر رہ گئی تھیں۔ بہرحال شیرباز مزاری اور بیگم نسیم ولی خان اس کالعدم پارٹی کے تن مردہ میں روح پھونکنے کے لئے کوشاں رہے اور انہیں اپنے مقصد میں کامیابی بھی حاصل ہوئی۔

جونہی وزیر اعظم نے انتخابات کے پروگرام کا اعلان کیا' اپوزیشن کی صفوں میں حیرت انگیز سرگرمیاں دیکھنے میں آئیں۔ انٹیلی جنس کی رپورٹوں کے مطابق ایک نیا سیاسی انتخابی اتحاد کسی بھی وقت وجود میں آنے والا تھا۔ جے۔ یو۔ پی 'یونائیٹڈ ڈیموکریٹک فرنٹ میں شامل تو تھی لیکن جماعت اسلامی کے غلبہ کی وجہ سے اسے فرنٹ میں کوئی خاص حیثیت حاصل نہ تھی بلکہ اس کی سیاسی قربت ایئر مارشل اصغر خان کی تحریک استقلال کے ساتھ زیادہ تھی۔ انتخابات کا اعلان ہوتے ہی سردار شیرباز مزاری اور پروفیسر غفور احمد ایبٹ آباد پہنچے اور انہوں نے اصغر خان سے ملاقات کی اور انہیں یو۔ ڈی۔ الیف میں شمولیت کی دعوت دی۔ اصغر خان نے ان کی دعوت کا جواب سرد مہری سے دیا کیونکہ وہ اس قسم کے سیاسی اتحاد کے پہلے ہی بہت ڈسے ہوئے تھے پروفیسر غفور اور مزاری صاحب نے انہیں بہت اونچ نیچ سمجھائی اور بتایا کہ پیپلز پارٹی کا مقابلہ کرنے کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ عوام کا اعتماد حاصل کیا جائے اور عوام کا اعتماد انتخابی اتحاد کے بغیر حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ بہرحال اس ملاقات کا نتیجہ اس حد تک نکلا کہ اصغر خان اور حضرت مولانا شاہ احمد نورانی نے ایک مرتبہ یو۔ ڈی۔ الیف کے تمام رہنماؤں کے ساتھ مل بیٹھنے پر آمادگی ظاہر کر

دی۔ جب اپوزیشن کے تمام سربراہوں کا اجلاس ہوا تو سیاسی یا انتخابی اتحاد سے نالاں ہر دو حضرات نے کسی
بھی انتخابی اتحاد میں شرکت کے لئے اپنی بے لچک شرائط پیش کر دیں' ان شرائط کا تعلق نہ تو سیاسی اتحاد کے
منشور یا پروگرام سے تھا اور نہ ہی کسی اور نظریاتی وابستگی سے اس کا کوئی علاقہ تھا۔ بنیادی طور پر یہ شرائط
نشستوں کی تقسیم سے متعلق تھیں اور دوسری شرط جو جے۔ یو۔ پی نے پیش کی وہ یہ تھی کہ نئے سیاسی اتحاد
کا جنرل سیکرٹری ان کا اپنا آدمی ہو گا۔ جماعت اسلامی ہر قیمت پر اتحاد کے قیام کی خواہاں تھی اور پھر
جب جے۔ یو۔ پی نے رفیق باجوہ کا نام نئے سیاسی اتحاد کے سیکرٹری جنرل کی حیثیت سے پیش کیا تو جماعت
اسلامی نے اس پر بخوشی صاد کر دیا۔ جماعت اسلامی نے پی۔ این۔ اے کی تشکیل میں سب سے نمایاں
کردار ادا کیا تھا اور جے۔ یو۔ پی سے اپنی پرانی مخاصمت کو بھی وقتی طور پر فراموش کر دیا تھا۔ رفیق باجوہ
جماعت اسلامی کے نزدیک شروع ہی سے ایک مشکوک کردار کے آدمی تھے۔ اور جماعت کو توقع تھی کہ
ان سے کسی بھی وقت کوئی ایسی غلطی ہو سکتی ہے جسے بہانہ بنا کر جماعت اسلامی پی۔ این۔ اے کی
سیکرٹری شپ جے۔ یو۔ پی سے چھین لے گی۔ چنانچہ جماعت اسلامی کی "سیکرٹ سروس" چوبیس گھنٹے
مسٹر باجوہ کی نگرانی کرتی تھی۔ بعد کی اطلاعات کے مطابق راؤ رشید اور محمد حیات ٹمن کے آدمی جے۔ یو۔
پی میں بہت مؤثر مقامات پر موجود تھے اور پی۔ این۔ اے کی سیکرٹری شپ جے۔ یو۔ پی کو دلانے میں
انہوں نے اہم کردار ادا کیا۔ ادھر وزیر اعظم بھٹو کی صرف ایک ہی خواہش تھی کہ مخالف جماعتوں کے
اتحاد کی جو بھی صورت بنے اصغر خان کوئی نمایاں عہدہ حاصل نہ کر سکیں —— خصوصاً انہیں پی۔ این۔
اے کی قیادت نہ سونپ دی جائے۔ مغربی تعلیم یافتہ اور روشن خیال اصغر خان' وزیر اعظم کے نزدیک
"متبادل قیادت" کا سیاسی تصور پیدا کر سکتے تھے اور عوام کے لئے اپنے اندر خاصی کشش رکھتے تھے۔ ان
کی اور راؤ رشید کے علاوہ ٹمن کی بھرپور کوشش یہ تھی کہ مولانا مفتی محمود کو پی۔ این۔ اے کا سربراہ بنوایا
جائے جو مسٹر بھٹو کی پرکشش شخصیت کے مقابل با آسانی مار کھا جائیں گے چنانچہ اس سلسلے میں تمام
انٹیلی جنس ایجنسیوں کو متحرک کر دیا گیا۔ مخالف سیاسی جماعتوں خصوصاً جے۔ یو۔ پی اور جماعت
اسلامی میں اپنے رابطوں کو استعمال کیا گیا۔ صحافیوں کو بھی خریدا گیا یہاں میں اس راز سے پردہ اٹھانا نہیں
چاہتا کہ کون کون کتنے ارزاں داموں بکا۔ بہرحال کوششیں رنگ لائیں اور اصغر خان کو پی۔ این۔ اے کی
سربراہی نہ مل سکی۔ ان کی سربراہی کی راہ میں پہلا پتھر تو خود ان کی حلیف جماعت جے۔ یو۔ پی سیکرٹری
جنرل کا عہدہ لے کر بن گئی۔ اب باقی جماعتوں کو اعتراض کا موقع ملا کہ کیا دونوں مرکزی عہدے ہم یو۔
ڈی۔ ایف سے باہر کی جماعتوں ہی کو دے دیں یہ اور اس جیسے دوسرے بہت سے اعتراضات اصغر خان کی
ذات کے حوالے سے پی۔ این۔ اے کی صفوں میں انجیکٹ کر دیئے گئے۔ میں اس اندرون خانہ
سیاسی جنگ سے آگاہ تھا اور میری رائے اس کے بالکل برعکس تھی میرا وزیر اعظم بھٹو کو یہی مشورہ تھا کہ اگر
انہیں اپنے خفیہ ذرائع سے کچھ کرانا ہی ہے تو یہ کرائیں کہ اپوزیشن کی جماعتیں انتخابی اتحاد قائم نہ کر سکیں

بلکہ علیحدہ علیحدہ اپنے امیدوار کھڑے کر کے پیپلز پارٹی کے امیدواروں کا مقابلہ کریں۔ لیکن مسٹر بھٹو
اور ان کے مشیر بزعم خویش اتنے پر اعتماد تھے کہ انہیں اس طرح کے کسی اتحاد سے کوئی خطرہ محسوس نہیں ہو
رہا تھا ان کا خیال تھا کہ اگر اس طرح کے کسی اتحاد کی سربراہی اصغر خان کے ہاتھ میں نہ ہو تو پھر ایسا اتحاد
کسی طور پر پیپلز پارٹی کا مقابلہ نہیں کر سکے گا۔

مولانا مفتی محمود مرحوم کو نو (۹) جماعتوں کے انتخابی اتحاد پی۔ این۔ اے کی سربراہی دلائی
گئی۔ تو اس کامیابی کا باقاعدہ جشن بھی منایا گیا کہ آدھا انتخاب گویا جیت لیا گیا ہے۔ مسٹر بھٹو کو یقین دلایا
گیا کہ اب جب لوگ مفتی محمود کے مقابل ان کی شخصیت کو رکھیں گے تو لامحالہ وزیر اعظم کی حیثیت میں
مفتی محمود کا تصور کر کے ہی گھبرائیں گے۔ ان کا کوئی عالمی امیج بھی نہیں ہے وزیر اعظم مطمئن تھے کہ اب
پی۔ این۔ اے ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی اور اس خوش فہمی کے عالم میں ان سے انتخابی مہم کا سب سے بڑا
"بلنڈر" سرزد ہوا کہ انہوں نے پی۔ این۔ اے کی نو جماعتوں کو ایک انتخابی نشان الیکشن کمیشن کی
جانب سے الاٹ ہو جانے دیا اور باوجود اس کا حق رکھنے کے کہ نو جماعتیں جو آپس میں ضم نہیں ہوئی تھیں
بلکہ اپنا علیحدہ تشخص رکھتی تھیں اور اس مسئلہ پر الیکشن کمیشن انہیں ایک انتخابی نشان الاٹ کرنے کے
خلاف فیصلہ دے سکتا تھا۔ مسٹر بھٹو نے بحیثیت چیف ایگزیکٹو اپنے خصوصی اختیارات کے تحت نو جماعتوں
کو ایک انتخابی نشان الاٹ کرنے کی اجازت دے دی۔ "ہل" کے انتخابی نشان کے سلسلے میں بھی

وزیر اعظم کے قریبی مکینوکریٹ کا مشورہ یہی تھا۔
کہ تلوار کے مقابل یہ نشان عوامی جاذبیت سے یکسر محروم ہے بلکہ مفتی محمود اور پی۔ این۔ اے کے دیگر سر
براہوں کے امیج بگاڑنے کے کام آئے گا۔ میرے نزدیک یہ پیپلز پارٹی کی سیاسی حکمت عملی کی سب سے
بڑی غلطی تھی لیکن نقار خانے میں طوطی کی صدا کون سنتا؟ وہ لوگ آج انتخابات کے ماہر اور مسٹر بھٹو کے
نفس ناطقہ بنے ہوئے تھے۔ جنہیں سیاسی عمل کی مبادیات سے بھی آگہی نہ تھی۔ ان کے تجربات ڈھاکہ
اور بلوچستان میں قتل عام تک محدود تھے اور یا پھر پولیس ملازمت کے دوران اوپر والوں کی جوتیاں سیدھی
کرنے اور عوام کو جوتے لگانے تک، پولیس کی ملازمت آدمی کو کچھ اور سکھاتی ہو یا نہ سکھاتی ہو'
اپنے "باس" کو ہر جائز و ناجائز طریقے سے خوش کرنے اور اپنی ملازمت پکی کرنے کے آداب ضرور سکھا
دیتی ہے۔ "رانجھا راضی" کرنے کے لئے اس سروس کے بعض لوگ ہر حد سے آگے گزر جاتے ہیں۔
یہ اتنے ہنرمند ضرور ہوتے ہیں کہ اس کرسی کو جو اختیارات کا منبع و ماخذ ہو بڑی کامیابی کے ساتھ یہ یقین
دلا سکیں کہ اس کی مضبوطی کا اصل ذریعہ اور سبب یہی لوگ ہیں۔ یہی کچھ مسٹر بھٹو کے ساتھ ہوا اور اب وہ
بری طرح ان مشیران کرام کے نرغے میں آ گئے۔
جہاں تک مسٹر بھٹو کی اپنی ذات اور شخصیت کا تعلق ہے' وہ بے پناہ ذہین' حقیقت پسند اور روشن

خیال انسان تھے۔ وہ درحقیقت ایک بڑے انسان تھے اور ہر بڑے انسان کی طرح ان میں بھی چند کمزوریاں تھیں۔ انہیں وہ لوگ اچھے لگتے تھے جو خود کو "شاہ سے زیادہ شاہ کا وفادار" ثابت کرنے میں معروف رہتے۔ اس لئے یہ مشیر صاحبان ان کے پسندیدہ ترین افراد تھے ہی............ لیکن سندھ کے ایک صوبائی وزیر بھی، جنہیں پراسرار علوم خصوصاً نجوم اور دست شناسی کا بہت شوق تھا اس ناطے ان کے قریب آ گئے تھے۔ سری لنکا کے ایک بڑے دست شناس اور ستارہ شناس سے ان کے گہرے تعلقات تھے۔ وزیر اعظم نے جب ۷ مارچ ۱۹۷۷ء کو انتخابات کے انعقاد کی تاریخ قرار دیا تو یہ صاحب اس تاریخ کے سعد ہونے کی سند سری لنکا کے ستارہ شناس سے لے کے آئے تھے خود مسٹر بھٹو بھی کسی نہ کسی حد تک اس قسم کے پراسرار علوم میں یقین رکھتے تھے۔ جب سری لنکا کے نجومی نے ۷ مارچ کے بابرکت ہونے کی تصدیق کر دی تو مسٹر بھٹو نے اپنے ہاتھ کے نشانات ایک دوست کے ذریعے پاکستان کے معروف دست شناس ایم۔ اے۔ ملک صاحب کو بھجوائے۔ بلاشبہ ایم۔ اے۔ ملک اپنے فن میں یکتا ہیں اور اس علوم پر انہوں نے بڑی سائنسی بنیادوں پر محنت کی ہے۔ ایم۔ اے۔ ملک صاحب نے مسٹر بھٹو کے ہاتھوں کے نشانات دیکھ کر بہت کچھ سمجھ لیا تھا۔ لیکن ان کی خفگی کے خوف سے انہوں نے اس دوست کو کوئی واضح بات نہ بتائی بعد ازاں جن دنوں مسٹر بھٹو کوٹ لکھپت جیل میں تھے اور ان پر احمد رضا قصوری کے والد کے قتل کی سازش میں شریک ہونے کے الزام میں مقدمہ زیر سماعت تھا تو ایم۔ اے ملک صاحب نے مجھے ان کے ہاتھوں کے یہ نشانات دکھائے تھے انہوں نے ایک خاص لائن پر انگلی رکھی " دماغی لکیر کے اختتام پر ایک لکیر گزر رہی تھی۔ جس پر گول دائرہ تھا۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا.......... "آپ ان لکیر کو دیکھ کر کس نتیجے پر پہنچے ہیں" میں خاموش رہ گیا۔.......... پھر وہ خود ہی بولے.......... "اس آدمی کا دماغ اسے پھانسی کے تختے تک پہنچائے گا" مسٹر ملک کی بات سو فی صد درست تھی، جسے وقت نے بعد ازاں ثابت بھی کر دیا۔ میں خود بھی ہاتھ کے پرنٹ دیکھنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا تھا۔

وزیر اعظم جب سری لنکا کے دورے پر گئے تو انہوں نے مسز بندرا نائیکے سے خواہش ظاہر کی کہ وہ ان کے درباری نجومیوں سے ملنا چاہتے ہیں۔ مسز بندرانائیکے نے اس کا اہتمام کر دیا۔ وزیر اعظم بھٹو نے نجومیوں کو ۷ مارچ کی تاریخ سے آگاہ کیا، اور انہیں حساب لگانے کو کہا.......... کہ اس تاریخ کو ہونے والے انتخابات کا نتیجہ کیا نکلے گا۔.......... لیکن ایک بھی نجومی نے ان کی بات کا جواب نہ دیا۔ سب کے ہونٹوں پر گویا مہر لگ گئی تھی مسٹر بھٹو کے بے حد اصرار پر سب سے بزرگ نجومی نے صرف اتنا کہنے پر اکتفا کیا.......... "اب تو آپ تاریخ کا اعلان کر چکے ہیں ہم اس میں کیا رائے دے سکتے ہیں؟"

انتخابی مہم کا آغاز

اس سارے پس منظر میں ۷ مارچ ۱۹۷۷ء کو پاکستان کے عوام عام انتخابات کے لئے اپنے ووٹ کا استعمال کرنے والے تھے۔ مجھے بھٹو صاحب کی ایک شدید خواہش کا علم تھا۔ جس کا اظہار انہوں نے بیشتر مواقع پر میرے سامنے کیا تھا اور وہ یہ کہ.......... وہ انتخابات میں دو تہائی کی اکثریت سے کامیابی چاہتے تھے۔ وہ آئین میں تبدیلی کے لئے دو تہائی اکثریت سے جیتنے کے خواہش مند تھے۔ ممکن ہے پی۔ این۔ اے کے جلسوں اور جلوسوں کی رپورٹوں سے وہ اس نتیجے پر پہنچے ہوں یا مشیران کرام نے انہیں یہ باور کرا دیا ہو کہ دو تہائی اکثریت حاصل نہ ہو سکے گی۔ اس لئے ہمیں اپنے "جوہر دکھانے" کے مواقع دیئے جائیں۔ صورت حال یہ تھی کہ قومی اسمبلی کے لئے کل ۲۰۰ نشستیں تھیں۔ پیپلز پارٹی نے تمام نشستوں پر اپنے امیدوار کھڑے کئے تھے۔ ۱۹ نشستوں پر پیپلز پارٹی کے امیدوار بلا مقابلہ کامیاب ہو چکے تھے۔ ان میں سے سندھ میں ۱۵ اور بلوچستان میں ۴ نشستوں پر بلا مقابلہ کامیابی کا اعلان کیا جا چکا تھا۔ قبائلی علاقے سے ۸ نشستیں بھی جیتنے والی پارٹی کو مل جائیں جن نشستوں پر مقابلہ تھا، ان میں بلوچستان سے ۳، پنجاب سے ۱۱۵، سرحد سے ۲۶ اور سندھ سے ۲۸ نشستیں تھیں سادہ اکثریت حاصل کرنے کے لئے تو ۱۰۱ سیٹیں جیتنا تھیں لیکن دو تہائی اکثریت حاصل کرنے کے لئے بقیہ ۱۷۲ میں سے ۱۰۵ سیٹیں حاصل کرنا ضروری تھیں۔ قومی اتحاد نے بلوچستان سے کسی نشست پر مقابلہ نہیں کیا تھا۔ باقی تین صوبوں سے اسے سادہ اکثریت کے لئے ۱۰۱ اور دو تہائی اکثریت کے لئے ۱۳۲ سیٹیں حاصل کرنا تھیں۔ جو ویسے ہی بہت مشکل نظر آتا تھا۔ کیونکہ پی۔ این۔ اے فقط ۱۶۹ نشستوں پر انتخابات لڑ رہا تھا۔ ان حالات میں پیپلز پارٹی کے لئے دو تہائی اکثریت حاصل کرنا اتنا بڑا اور مشکل کام نہ تھا، کئی سیٹیں ایسی بھی تھیں جہاں سے پی۔ این۔ اے کا ایک ہی امیدوار کھڑا ہوا تھا اور اگر وہ تمام نشستیں بھی جیت لی جاتیں تب بھی ایک کے سوا باقی نشستیں چھوڑنا پڑتیں اور ان میں سے کئی ضمنی انتخابات میں اس کے ہاتھ سے نکل سکتی تھیں۔ پی۔ این۔ اے میں شریک نو جماعتوں میں سے مسلم لیگ کو ۳۶ ٹکٹ ملے تھے، جبکہ تحریک استقلال کو ۳۰، جماعت اسلامی کو ۳۱، جمعیت العلمائے پاکستان کو ۲۳، جمعیت العلمائے اسلام کو ۲۴، پاکستان ڈیموکریٹیک پارٹی کو ۱۳، خاکسار تحریک کو ۲ اور مسلم کانفرنس کو کوئی ٹکٹ نہ ملا تھا، اس طرح کل ۱۶۹

نشستوں پر پی۔ این۔ اے مقابلہ کر رہی تھی۔ اگر انتخابات میں خدانخواستہ پی۔ این۔ اے سادہ اکثریت حاصل کر کے حکومت بنا بھی لیتی تو باہم دست و گریباں ان تمام پارٹیوں کی حکومت ۳ ماہ سے زیادہ نہ نکال سکتی تھی۔ اول تو ان جماعتوں کے لئے سادہ اکثریت کا حصول بھی ناممکن تھا کیونکہ انتخابی مہم کے عین نقطہ عروج پر پی۔ این۔ اے کی جانب سے بعض ایسے بیانات اور اقدامات سامنے آئے کہ ان کی پوری انتخابی مہم سبوتاژ ہو کر رہ گئی۔

مثال کے طور پر خواتین کے بارے میں رفیق باجوہ جنرل سیکرٹری پی۔ این۔ اے کے بعض بیانات نے خواتین کے ووٹ مکمل طور پر پی۔ این۔ اے کے ہاتھ سے نکال دیئے تھے۔

ایک ایسی صورت حال میں، میں نہیں سمجھتا کہ انتخابات میں کسی قسم کی دھاندلی کی ضرورت باقی رہ جاتی تھی۔ لیکن بدقسمتی سے خشت اول کج تو خود وزیر اعظم بھٹو نے بلا مقابلہ منتخب ہو کر رکھ دی تھی۔ جس کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ ان کی شان تو یہ تھی کہ وہ باقاعدہ الیکشن لڑ کر قومی اتحاد کے امیدوار مولانا جان محمد عباسی کی ضمانت ضبط کرا دیتے۔ مولانا جان محمد عباسی لاکھ محب الوطن اور معتدل مزاج رہنما سہی لیکن وہ کسی صورت بھی وزیر اعظم بھٹو کی ہر دل عزیزی کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے۔ صرف چند سو ووٹ حاصل کرتے اور ضمانت ضبط کرا لیتے'

جبکہ ان کے
مقابلے میں ذوالفقار علی بھٹو ایسا عالمی شہرت یافتہ سیاستدان نہیں' شاہ محمد پاشا کھوڑو تھے۔ ایسے بے ضرر امیدوار کو اغوا کرانا اور کاغذات نامزدگی داخل کرنے کے وقت تک پولیس کسٹڈی میں رکھوانا بیورو کریسی کا وہ کارنامہ تھا' جس نے وزیر اعظم بھٹو کی انتخابی دیانت اور انتخابات کے فیئر ہونے کے تصور کو بری طرح مجروح کیا۔ پیپلز پارٹی کی جانب سے سب سے پہلے بلا مقابلہ کامیاب امیدوار لاڑکانہ کے حلقہ ۱۶۴ سے سلطان احمد چانڈیو تھے۔ - ———— یہ گویا نمونے کی کارروائی تھی۔

جو مسٹر محمد خان جونیجو ہوم سیکرٹری سندھ اور مسٹر خالد ملک ڈپٹی کمشنر لاڑکانہ نے اپنی اعلیٰ کارکردگی سے مسٹر بھٹو کو خوش کرنے کے لئے ان کے سامنے پیش کی تھی اور انہیں بتایا تھا کہ کس قدر آسانی سے الیکشن جیت کر ان کی جھولی میں ڈالا جا سکتا ہے۔ ۱۹ جنوری کو قومی اسمبلی کے کاغذات نامزدگی داخل کرنے کی آخری تاریخ تھی۔ اس روز شام کو وزیر اعظم بھٹو اور پارٹی کے چند اور رہنماؤں کے بلا مقابلہ منتخب ہونے کی خبر ریڈیو اور ٹیلیویژن سے نشر کر دی گئی اور اگلے روز کے تمام اخبارات نے مسٹر بھٹو کی ایک ہی تصویر ایک ہی سائز میں تین کالمی ۹ انچ ایک ہی کیپشن اور ایک ہی جیسی خبر کے ساتھ شائع کی۔ مولانا جان محمد عباسی کو بعض بعد کی اطلاعات کے مطابق ۱۸ جنوری کی شام ہی پولیس نے اپنی حراست میں لے لیا تھا اور کاغذات نامزدگی جمع کرانے کا وقت ختم ہونے کے بعد اگلے روز انہیں رہا کیا گیا ان کے بیانات کو پی۔ این۔ اے نے اپنی انتخابی مہم کی بنیاد بنا لیا اور یوں ابتداء ہی میں بیورو کریسی نے پارٹی کی انتخابی مہم کو ناقابل بیان حد تک نقصان پہنچایا۔ پہلے ہی مرحلے میں بلا مقابلہ کامیاب ہونے والے ۱۹ امیدواروں میں سے سندھ کے ۱۵

امیدوار یہ تھے۔

نور محمد لنڈ' سکھر ۴' میر مہران خان بجرانی' جیکب آباد ا' عبدالفتح میمن نواب شاہ ا' غلام مجتبیٰ خان جتوئی نواب شاہ ۲' شبیر احمد شاہ' نواب شاہ ۳' ذوالفقار علی بھٹو لاڑکانہ ا سلطان احمد چانڈیو' لاڑکانہ ' ممتاز علی بھٹو' لاڑکانہ ۳' مخدوم محمد زمان طالب المولیٰ حیدر آباد ا' حاجی نجم الدین لغاری' بدین ا' نیاز محمد وسان تھرپارکر ۳' ملک سکندر خان دادو ا' الٰہی خان لغاری' دادو ۲' لیاقت علی جتوئی' دادو ۳' عطا محمد مری سانگھڑ ۲' بلوچستان سے جو ۴ امیدوار بلا مقابلہ کامیاب قرار پائے ان میں تاج محمد جمالی' سبی ' عبدالنبی جمالی سبی ۲' پرنس محی الدین قلات ا' اور امان اللہ گچکی' قلات ۲ شامل تھے۔

مذکورہ بالا ۱۹ کامیاب امیدواروں میں سے صرف دو چار اصحاب کے بارے میں یقین سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ واقعی بلا مقابلہ منتخب ہو سکتے تھے۔ ان میں سے ایک تو مسٹر غلام مجتبیٰ خان جتوئی تھے اور دوسرے مخدوم محمد زمان طالب المولیٰ۔ باقی تمام بلا مقابلہ کامیابیاں پرائم منسٹر سیکریٹریٹ کے خصوصی انتخابی سیل کے انتظامی سربراہ مسٹر ٹمن اور سیاسی معاملات کے انچارج مسٹر راؤ عبدالرشید کے حسن کرشمہ ساز کی کارفرمائیاں تھیں۔

بلا مقابلہ انتخاب کی یہ روایت صوبائی اسمبلی کے لئے کاغذات نامزدگی داخل کرانے والے چاروں صوبائی وزراء اعلیٰ نے بھی نبھائی اور بلا شرکت غیرے لیڈر نظر آنے کی کوشش میں رسوائی کی رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ حالانکہ سوائے غلام مصطفیٰ جتوئی اور نواب رئیسانی کے کوئی بھی اس قابل نہ تھا کہ بلا مقابلہ تو کیا انتخاب میں حصہ لے کر ویسے بھی جیت سکتا۔ جس کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ جب نصر اللہ خٹک کا قومی اسمبلی کے لئے بلا مقابلہ انتخاب الیکشن کمیشن نے کالعدم قرار دیا تو بعد میں وہ مولانا عبدالحق کے مقابلے میں پشاور سے بری طرح شکست کھا گئے۔

انتخابی مہم کے لئے ملک میں نافذ دفعہ ۱۴۴ اٹھالی گئی تھی تاہم ہنگامی حالت ڈیفنس آف پاکستان رولز سمیت برقرار رکھی گئی تھی۔ "جھرلو" کے ذریعے انتخابات جیتنے کا عملی مظاہرہ ۱۹۷۵ء کے موسم گرما میں آزاد کشمیر میں ہونے والے انتخابات میں بڑی کامیابیاں سے کر کے بعض لوگ وزیر اعظم کے منظور نظر بن چکے تھے۔ سردار عبدالقیوم اور مسلم کانفرنس کو شکست دینے کے لئے انہوں نے انتخابی عمل کے نگران کی حیثیت سے اپنی آہنی گرفت کا جو شاندار مظاہرہ کیا تھا اس کے بعد وہ مسٹر بھٹو کے لئے ناگزیر بن چکے تھے۔ ان کے درمیان گویا ایک دوسرے سے بڑھ کر خود کو جھرلو کا ماہر ثابت کرنے کی دوڑ لگی ہوئی تھی۔ اگرچہ رفیع رضا نے انتخابی مہم کے انچارج کی حیثیت سے ان کی بیشتر انتخابی مضحکہ خیز تجاویز کو بڑی جرأت مندی کے ساتھ رد کیا' لیکن بعض معاملات میں وہ شریف انسان بھی بے حد بے بس نظر آتا مگر ان مشیروں پر سب سے برا وقت اس وقت آیا' جب ملک سے دفعہ ۱۴۴ ہٹتے ہی پی۔ این۔ اے کے جلسوں اور

جلوسوں کا گویا ایک سیلاب سامنڈ آیا۔ فروری ۱۹۷۷ء میں جب انتخابی مہم زوروں پر تھی اس وقت ان کی بوکھلاہٹیں قابل دید تھیں۔ ان تمام خوش فہمیوں کا خاتمہ ہو چکا تھا' جو انہوں نے وزیر اعظم کے گرد تار عنکبوت کی صورت قائم کی تھیں۔ بلا مقابلہ انتخاب جیتنے کے ذریعے جو ڈرامہ ان لوگوں نے شروع میں رچایا تھا اس کے تار و پود بکھر چکے تھے۔ یہ وقت تھا جب وزیر اعظم کو پوری شدت سے اس امر کا احساس ہوا کہ انہیں اپنے نام نہاد مشیروں پر انحصار کم کر کے سیاسی میدان میں پی۔ این۔ اے کا مقابلہ کرنا ہو گا۔ پیپلز پارٹی کی صفوں میں خود ان کے علاوہ دو چار ہی مقرر ایسے تھے جو پی۔ این۔ اے کے نو وس رہنماؤں کی جوشیلی اور جذباتی تقریروں کے سیلاب میں بہنے والے عوام کے بڑے بڑے اجتماعات کے سامنے مزاحمت کی دیوار کھڑی کر سکتے تھے۔ اس وقت مسٹر بھٹو نے مجھے حکم دیا کہ میں پورے ملک میں پیپلز پارٹی کے زیر اہتمام جلسہ ہائے عام سے خطاب کروں اگرچہ اس وقت بھی راؤ عبدالرشید وزیر اعظم کو اس قسم کے نوٹ بھجوا رہے تھے کہ سوائے وزیر اعظم کے اور کسی کو بڑے جلسوں سے خطاب نہیں کرنا چاہئے کیونکہ اس طرح وزیر اعظم کی طلسماتی شخصیت کا امیج مجروح ہوتا ہے' لیکن وزیر اعظم بھٹو نے گویا اس وقت انہیں ان کے "اصل فرائض" تک محدود کر کے سیاسی میدان سے خارج کر دیا تھا۔ وزیر اعظم کو اس سلسلے میں مجھ سے بہت زیادہ توقعات تھیں اور خدا کا شکر ہے کہ میں نے پی۔ این۔ اے کے تمام رہنماؤں کا مقابلہ خود انہیں کے "ہتھیاروں" کو لے کر انہیں پسپائی پر مجبور کر دیا ۲۸ جنوری کو میں نے سرگودھا میں پارٹی کی انتخابی مہم کے ایک بڑے جلسے سے خطاب کر کے پارٹی کمپین کا آغاز کیا اور اس سلسلے میں ایک باقاعدہ نوٹ کے ذریعے وزیر اعظم کو اپنے شیڈول سے آگاہ کیا۔

اس نوٹ کا اردو ترجمہ حسب ذیل ہے۔

○ .... ○ .... ○

یادداشت برائے وزیر اعظم

میں وزیر اعظم کے علم میں یہ بات لانا چاہتا ہوں کہ میں پنجاب میں پارٹی کی انتخابی مہم کے سلسلہ میں ۲۸ جنوری کو سرگودھا میں پہلے جلسہ عام سے خطاب کر رہا ہوں۔

مجھے پنجاب پارٹی کے کارکنوں اور پارٹی کے مقامی دفاتر کی طرف سے خطوط' تاروں اور وفود کی صورت میں ایسی درخواستیں متواتر موصول ہو رہی ہیں کہ میں ان کے علاقوں میں جلسوں سے خطاب کروں۔ میں یہ درخواستیں براہ راست قبول نہیں کر رہا ہوں' اس کے بجائے میں نے وزیر اعلیٰ سے کہا ہے کہ وہ اپنی صوابدید کے مطابق مقامی ضروریات کو مد نظر رکھتے ہوئے میرے لئے پروگرام بنائیں جس پر عمل کروں تاہم اگر وزیر اعلیٰ میرے دورہ کا پروگرام نہ بنا پائیں تو پھر میں اپنا پروگرام خود بناؤں گا جس میں موصولہ درخواستوں کے مطابق ہر علاقہ کو برابری کی سطح پر حصہ دینے کی کوشش کی جائے گی۔ میں جن جلسوں سے خطاب کرنا چاہتا ہوں ان کے بارے میں وزیر اعظم کو بہر حال مطلع کروں گا۔

سندھ کیلئے وزیر اعلیٰ کے مشورہ سے تیار کردہ جلسہ ہائے عام کا پروگرام درج ذیل ہے۔

۳ فروری	جیکب لائنز' کراچی
۵ فروری	حیدر آباد
۶ فروری	لانڈھی اور کورنگی (کراچی)
۱۸ فروری	علاقہ بلدیہ کراچی
۱۹ فروری	سکھر
۲۰ فروری	کراچی
۲۵ فروری	اورنگی کراچی

مجھے توقع ہے کہ وزیر اعظم اس پروگرام کو منظور فرمائیں گے۔

جہاں تک صوبہ سرحد کا تعلق ہے۔ میں پہلے ہی اس صوبہ کے بیشتر علاقے کے دورہ کے دوران مالاکنڈ' سوات' ایبٹ آباد' ہری پور' مانسہرہ' کوہاٹ اور بنوں میں عام جلسوں سے خطاب کر چکا ہوں۔ مجھے ابھی پشاور اور مردان جانا ہے اور مجھے امید ہے کہ وہاں وزیر اعلیٰ کے مشورہ سے عوامی اجتماعات سے خطاب کروں گا۔ میرا ان سے رابطہ قائم ہے اور میں ان سے کہہ چکا ہوں کہ جب بھی میری ضرورت ہو وہ مجھے اس سے مطلع کر دیں۔

وزیر اعظم کو یہ بتاتے ہوئے مجھے مسرت محسوس ہوتی ہے کہ صوبہ سرحد کے علماء سے میری ملاقاتیں نہایت کامیاب رہی ہیں۔ صوبائی حکومت کی طرف سے موصول ہونے والی رپورٹوں کے مطابق علماء سے میرے بے تکلفانہ اور آزادانہ تبادلہ خیال کے بعد ان کے بے بنیاد شکوک و شبہات دور کرنے میں بہت مدد ملی ہے اور ان کی سوچ اور رویہ میں واضح تبدیلی پیدا ہوئی ہے۔

دوسرے مقامات سے موصول ہونے والی دعوتوں کے طوفان میں میں اپنے حلقہ انتخاب کو فراموش نہیں کر رہا ہوں۔ مجھے نظر آ رہا ہے کہ وہاں مجھے باقاعدہ جنگ لڑنی ہوگی، لیکن انشاء اللہ وہاں فتح ہماری پارٹی کی ہوگی۔ میں اپنے حلقہ میں آٹھ، نو دن گزارنے کی تجویز پیش کرتا ہوں، لیکن میں یہ عرصہ ایک ساتھ نہیں بلکہ ایک ایک، دو دو دن کرکے وہاں گزاروں گا۔ اس کے علاوہ میرا باقی ماندہ وقت وزیر اعظم کیلئے وقف ہو گا۔ وہ جہاں چاہیں گے میں وہاں جاؤں گا۔

برائے اطلاع پیش خدمت ہے

دستخط (کوثر نیازی)
۲۷-۱-۷۷

وزیر اعظم نے اس پر لکھا۔

جاری رکھیں، میں آپ کی کامیابی کا متمنی ہوں۔

دستخط (وزیر اعظم)

وزیر برائے مذہبی امور

اصل متن کیلئے ملاحظہ ہو ضمیہ جات

شیڈول کے مطابق ۳۱ جنوری کو میں نے سیالکوٹ میں ایک بڑا جلسہ عام کر کے پی این۔ اے کے تضادات سے بھرپور پروپیگنڈہ کے قلعہ پر بھرپور وار کیا۔ یکم فروری کو پھر سیالکوٹ ہی میں، میں نے تقریر کی، ۲ فروری کو میں صوبہ سرحد پہنچا اور مانسہرہ کے مقام پر ایک بڑے جلسے سے خطاب کیا۔ ۴ فروری کو جیکب لائنز کراچی میں اور ۵ فروری کو حیدر آباد میں ایک تاریخی جلسے سے خطاب کیا۔ ۶ فروری کو میں واپس کراچی آیا اور جماعت اسلامی کے مضبوط ترین گڑھ پر حملہ کیا۔ ۱۲ فروری کو پنجاب میں گوجرانوالہ میں، میں نے ایک عظیم الشان جلسے سے خطاب کیا۔ ۱۸ فروری کو میں پھر سندھ پہنچا اور کراچی میں جلسہ کیا۔ ۱۹ فروری کو سکھر میں ۲۰ فروری کو پھر کراچی میں اور ۲۵ فروری کو بھی کراچی میں ہی ایک دوسرے حلقے اورنگی میں جلسہ عام کیا۔ وزیر اعظم نے بطور خاص میرے جلسوں کا پروگرام کچھ اس طرح ترتیب دلایا تھا کہ جس شہر میں میں پہلے جلسے کر کے آگے بڑھتا تھا، اسی میں میرے بعد وزیر اعظم بھٹو اس سے کہیں زیادہ بڑے جلسے سے خطاب کرتے تھے۔ مجھے اب اس سلسلے میں تمام تاریخیں اور مقامات تو یاد نہیں رہے تاہم اتنا مجھے یاد ہے کہ میرے ہر جلسے کی رپورٹ وزیر اعظم اسی شام مختلف ایجنسیوں سے طلب کر کے مجھے فون پر مبارک باد دیتے۔

ہم نے پے در پے جلسے کر کے نہ صرف پی۔ این۔ اے کی جماعتوں کے تضادات واضح کیے بلکہ انہیں دفاعی پوزیشن پر گھسیٹ کر لے گئے ان تمام جلسوں میں بھٹو صاحب کی تقریر کے خاص نکات پیپلز پارٹی کی حکومت کے وہ اقدامات ہوتے تھے جو میری وزارت کے تحت اسلام کی ترویج و اشاعت اور نفاذ کے ضمن میں کیے جاتے رہے تھے۔ کسی بھی جلسے میں بھٹو صاحب نے سوشلزم کا نام تک نہ لیا تھا بلکہ سرکاری طور پر بھی پارٹی کا نعرہ "سوشلزم ہماری معیشت ہے" "مساوات محمدی ہماری معیشت ہے" میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔

○ ○ ○ ○

جرنیلوں سے مشورے

انتخابات کے نتائج سات مارچ ۱۹۷۷ء کی رات تقریباً آٹھ بجے ریڈیو اور ٹیلیویژن سے نشر ہونا شروع ہوئے۔ میں سارا دن اپنے حلقہ انتخاب پسرور میں مصروف رہا تھا۔ میرے مقابل پی۔ این۔ اے کے حریف امیدوار ایک مقامی وکیل تھے۔ اپنے انتخابی جلسوں میں عوام کا جوش و خروش دیکھ کر اپنی کامیابی سے متعلق میرے ذہن میں کوئی شک نہ تھا۔ ریڈیو، ٹیلی ویژن پر سب سے پہلا انتخابی نتیجہ اسلام آباد کے حلقہ نمبر ۳۵ سے پیپلز پارٹی کے امیدوار راجہ ظہور احمد کی کامیابی کا نشر ہوا۔ جن کا مقابلہ پی۔ این۔ اے کے امیدوار پروفیسر غفور احمد سے تھا۔ خود میرے حلقہ انتخاب این۔ اے۔ ۱۰۷ کا نتیجہ ۸ مارچ کی صبح تقریباً تین ساڑھے تین بجے نشر ہوا۔ کامیابی کی اطلاع پاتے ہی میں اسلام آباد روانہ ہو گیا۔ میرا ارادہ تھا کہ ایک دو روز بعد دوبارہ اپنے حلقہ انتخاب میں آ کر اپنے ووٹروں کا شکریہ ادا کروں گا۔ ۱۰ مارچ کو صوبائی اسمبلی کے انتخابات ہونا تھے۔ میں اسلام آباد پہنچا تو چند حلقوں کے سوا بیشتر نتائج آ چکے تھے اور پیپلز پارٹی نے دو تہائی اکثریت حاصل کر لی تھی۔ اسی شام پی۔ این۔ اے نے انتخابی نتائج کو دھاندلیوں کا شاہکار اور فراڈ قرار دے کر مسترد کر دیا۔ - - پی۔ این اے نے اپنے کامیاب ہونے والے ۳۶ امیدواروں سے بھی کہا تھا کہ وہ قومی اسمبلی کی اپنی نشستوں سے استعفے پی۔ این۔ اے کے سربراہ مولانا مفتی محمود کے حوالے کر دیں پی۔ این۔ اے نے ۱۰ مارچ کے صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات کے بائیکاٹ کا بھی اعلان کر دیا تھا اور ۱۴ مارچ سے انتخابات میں دھاندلیوں کے خلاف ملک گیر تحریک چلانے کا اعلان کیا تھا۔ پی۔ این اے دوبارہ فوج کی نگرانی میں انتخابات کے انعقاد اور وزیر اعظم بھٹو سے فوری طور پر مستعفی ہونے کا مطالبہ کر رہی تھی۔

انتخابات کے حیران کن نتائج سے قطع نظر یہ صورت حال میرے لئے بے حد تشویش ناک تھی۔ عالمی پریس خصوصاً بی بی سی ' پی۔ این۔ اے کے نقطہ نظر کو شرح و بسط کے ساتھ پوری دنیا کے سامنے لا رہا تھا۔ ——— ۱۰ مارچ کو صوبائی اسمبلی کے انتخابات نے پی۔ این۔ اے کی عوامی طاقت کو پوری طرح ثابت کر دیا جب ملک بھر کے پولنگ بوتھ ویران پڑے تھے اور صرف پیپلز

پارٹی کے امیدوار میدان میں رہ گئے تھے۔ صوبائی انتخابات کا بائیکاٹ اس درجہ مکمل تھا کہ مجھے یہ شک ہونے لگا کہ پی۔ این۔ اے نے انتخابی نتائج کے خلاف ۱۴ مارچ سے جو تحریک چلانے کی دھمکی دی ہے وہ رائیگاں نہیں جائے گی۔ ۱۱ مارچ کو پی۔ این۔ اے نے ملک بھر میں ہڑتال کی اپیل کی اور بلاشبہ ملک کے بیشتر شہروں خصوصاً کراچی میں عوام نے پی۔ این۔ اے کی اپیل کا مثبت جواب دیا۔ ۱۴ مارچ کو احتجاجی مظاہروں کا سلسلہ شروع ہو گیا اور ملک بھر کی سڑکیں آنسو گیس 'لاٹھی چارج' ہائے ہائے کے نعروں سے گونجنے لگیں۔ ۱۸ مارچ کو قومی اتحاد کے کئی اہم رہنما جن میں اصغر خان' شاہ احمد نورانی' شیرباز مزاری وغیرہ شامل تھے گرفتار کر لئے گئے۔ پی۔ این۔ اے اپنی مختلف اپیلوں کا عوام کی جانب سے مثبت جواب پا کر خاصا اعتماد حاصل کر چکی تھی۔ اگرچہ گرفتاریوں کی خبریں اخبارات میں کم ہی آتی تھیں، لیکن خصوصاً کراچی آتش فشاں بن چکا تھا۔ ہنگامے اس قدر بڑھے کہ کراچی کے بعض علاقوں میں کرفیو نافذ کرنا پڑا۔ پولیس کی مدد کے لئے ایف۔ ایس۔ ایف اور فوج کے دستے طلب کر لئے گئے تھے۔ نئی کراچی' لیاقت آباد ناظم آباد اور فیڈرل بی ایریا کے علاقوں میں فوج نے مکمل کنٹرول سنبھال لیا تھا۔ اس کے باوجود پٹھان کالونی میں ایک نہایت ہولناک سانحہ نے جنم لیا جب عوام کے مشتعل ہجوم نے پیپلز پارٹی کی وارڈ کمیٹی کے صدر حبیب الرحمن کے گھر کو آگ لگا دی اور ۱۴ افراد کو زندہ جلا دیا۔ گھر کے اندر سے ہونے والی فائرنگ کے نتیجے میں ۲ حملہ آوروں کی ہلاکت کی بھی اطلاعات ملیں۔ پیپلز پارٹی کے دفاتر کو آگ لگائی جا رہی تھی اور اس کے ساتھ سرکاری اور نجی املاک بھی نشانہ بن رہی تھیں، سب سے ہولناک مالی نقصان رزی پبلک موٹرز کی آگ سے ہوا۔ جس کے نتیجے میں ۲۵ کروڑ روپے کا سامان اور گاڑیاں نذر آتش ہوئیں۔ کراچی سے بھڑکنے والی یہ آگ رفتہ رفتہ پورے ملک میں پھیل گئی اور تمام نمایاں قائدین کی گرفتاری کے بعد تحریک پوری طرح عوام کے ہاتھ میں چلی گئی۔ مساجد نے تحریک کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا اور لاہور کی مسجد شہداء نے تو اس سلسلے میں عالمی شہرت حاصل کی۔ اول' دوم' اور سوم صف کے تمام قائدین کی گرفتاری کے بعد مساجد کے آئمہ حضرات نے عملاً حکومت کے خلاف تحریک کی قیادت سنبھال لی تھی اور انتخابی دھاندلیوں کے خلاف شروع ہونے والی تحریک اب "نظام مصطفیٰ کے نفاذ" کی تحریک میں تبدیل ہو چکی تھی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ حکومت کے خلاف ایجی ٹیشن کو نظام مصطفیٰ کے نفاذ کی تحریک میں تبدیل کرنے میں مرکزی کردار جمعیت العلمائے پاکستان نے ادا کیا۔ ۲۱ مارچ کو پاکستان الیکشن کمیشن نے سرکاری طور پر انتخابی نتائج کا اعلان کر دیا۔ نو منتخب قومی اسمبلی کا پہلا اجلاس ۲۶ مارچ کو طلب کر لیا گیا تھا۔ جس میں اراکین کو حلف اٹھانا تھا اور آئندہ پانچ سال کے لئے حکومت تشکیل دینا تھی۔ ادھر قومی اتحاد ۲۶ مارچ سے پہلے احتجاجی تحریک کو مزید سنگین اور شدید کرنا چاہتا تھا اور مولانا شاہ احمد نورانی نے کراچی میں ایک پریس کانفرنس کے ذریعے دھمکی دے دی تھی کہ ۲۶ مارچ کو قومی اسمبلی کے "غیر آئینی اور غیر قانونی" اجلاس میں شرکت کے لئے ارکان اسمبلی اپنی ذمہ داری پر

جائیں۔ تین چار ہفتے کی تحریک میں تقریباً ۲۵ کروڑ روپے کی املاک تباہ و برباد کی جا چکی تھیں۔ ادھر قومی اتحاد کے ایک اہم رہنما ایئر مارشل اصغر خان نے مسلح افواج کے سربراہوں کو ایک خط لکھا جس میں انہیں بھٹو حکومت کے خلاف بغاوت کی ترغیب دی گئی تھی اور بی بی سی۔ کے مطابق اس خط کی تین ہزار کاپیاں دیگر فوجی افسروں میں بھی تقسیم کرائی گئی تھیں۔

وزیر اعظم وسط مارچ میں ہی فوج کے اعلیٰ افسران کے ساتھ انفرادی اور اجتماعی میٹنگ میں شروع کر چکے تھے۔ ابتدا میں وہ خود ہی مسلح افواج کے سپریم کمانڈر کی حیثیت سے مختلف جرنیلوں سے ملاقاتیں کرتے رہے جن میں انہوں نے اپنی حکومت کی بقا اور قومی اتحاد کے ایجی ٹیشن کو کچلنے کے سلسلے میں فوج کی مدد حاصل کرنے کے امکانات کا جائزہ لیا۔ جوں جوں ایجی ٹیشن بڑھتا گیا، سروسز چیفس اور کور کمانڈرز کے ساتھ وزیر اعظم کی ملاقاتیں بھی بڑھتی گئیں۔ ان ملاقاتوں کے دوران جہاں مسٹر بھٹو جرنیلوں کو کرید کرید کر ان کے خیالات اور سوچوں سے خود کو آگاہ رکھنے بلکہ جرنیلوں کو اپنے سامنے ایکسپوز (EXPOSE) ہوتے دیکھنے کے خواہاں تھے، وہاں انہیں سب سے بڑا نقصان یہ پہنچا کہ وہ خود بھی جرنیلوں کے سامنے ایکسپوز ہوتے چلے گئے اور جرنیلوں پر ان کی کمزوریاں اور انتظامیہ پر ان کی ڈھیلی گرفت عیاں ہوتی چلی گئی۔ جرنیلوں کو سیاسی معاملات میں ملوث کرنا اور ان کے ساتھ سیاسی مسائل پر بحث کرنا گویا ان پر سوچ اور فکر کے نئے دروازے کھولنے کے مترادف تھا اور درحقیقت یہیں سے سیاسی معاملات میں جرنیلوں کو اپنی اہمیت کا احساس ہونا شروع ہوا۔ یہ ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کی شب جرنیلوں کے انتہائی اقدام کا نقطۂ آغاز تھا۔ سیاست میں فوج کی مداخلت کا دروازہ درحقیقت خود وزیر اعظم بھٹو ۱۹۷۴ء میں کھول چکے تھے جب بلوچستان میں انہوں نے مری اور مینگل قبائل کے خلاف جنرل ٹکا خان کے ذریعے ملٹری آپریشن کرایا۔ جنرل ٹکا خان مشرقی پاکستان میں قتل عام کرانے کے سلسلے میں پہلے ہی خاصی شہرت رکھتے تھے اور مشرقی پاکستان سے "قصاب" کا خطاب لے کر واپس آئے تھے۔ یہ صاحب یحییٰ دور میں بھٹو اور پیپلز پارٹی کے زبردست مخالف تھے۔ اگر ۱۹۷۳ء میں وزیر اعظم بھٹو کی مقبولیت کا گراف ۱۹۷۷ء جیسا ہوتا تو یہ ایک یقینی بات تھی کہ خود جنرل ٹکا خان ہی بلوچستان کے آپریشن کے بعد مسٹر بھٹو کی حکومت کا تختہ الٹ دیتے لیکن مسٹر بھٹو کی خوش قسمتی تھی کہ ملک کے دو بڑے صوبوں پنجاب اور سندھ میں وزرائے اعلیٰ کی انتظامی امور پر گرفت اور غلام مصطفیٰ کھر کے علاوہ غلام مصطفیٰ جتوئی کی ذاتی مقبولیت نے عوام میں مسٹر بھٹو کی ساکھ قائم رکھی اور ٹکا خان بھٹو حکومت کا تختہ الٹنے کی جسارت نہ کر سکے۔

۱۹۷۰ء کی ہماری انتخابی مہم کے دوران جنرل ٹکا خان زون اے کے مارشل لاء ایڈ منسٹریٹر تھے اور اسمبلی ہال میں ان کا دفتر ہوتا تھا۔ ایک روز مجھے ان کا بلاوا آیا جس کا مقصد مجھے وارننگ دینا تھا۔ موصوف نے اپنے مخصوص لب و لہجہ میں مجھے دھمکی دیتے ہوئے کہا۔ "تم اور تمہارا اخبار بہت گڑبڑ کرتا ہے۔......... دیکھو جوان! یہ ٹھیک نہیں ہے ہم نہیں چاہتے کہ تمہیں کوئی تکلیف ہو لیکن اب ہمیں

مجبوراً دوسرا راستہ اختیار کرنا پڑے گا۔ یاد رکھو......... پیپلز پارٹی اور بھٹو کو ہم کبھی نہیں آنے دیں گے۔" (مراد تھی برسر اقتدار نہیں آنے دیں گے۔) مجھے ٹکا خان کے یہ الفاظ کبھی نہیں بھولے۔ اس وقت بھی نہیں، جب وزیر اعظم بھٹو نے ان صاحب کو دفاع کا وزیر مملکت اور قومی سلامتی کے امور کا مشیر بنا کر کابینہ میں شامل کر لیا اور یہ صاحب اپنے ماضی کے دعووں کو بھلا کر رات دن مسٹر بھٹو کی جوتیاں سیدھی کرنے ہی کو ثواب دارین کے حصول کا واحد ذریعہ سمجھنے لگے وزیر اعظم بھٹو کی طبیعت بھی طرفہ تماشا تھی۔ یہ ان کے مزاج کا خاصہ تھا کہ وہ اپنے کسی بھی دور کے مخالفین کو اپنے زیر نگین اور احکامات کا تابع دیکھ کر ذہنی تسکین حاصل کرتے تھے۔ برطانیہ میں میاں ممتاز دولتانہ کی بحیثیت سفیر تعیناتی، خان عبدالقیوم خان کو وزیر داخلہ بنانا، پیر علی محمد راشدی کو ایڈوائزر کا عہدہ دینا ٹکا خان کو وزیر مملکت بنانا، ان کی طبیعت کے اسی پہلو کے عکاس اقدامات تھے وہ ان لوگوں کو اپنا تابع مہمل دیکھ کر بے حد تسکین حاصل کرتے تھے۔

جنرل ٹکا خان نے مجھے دی گئی دھمکی کو عملی جامہ پہنایا اور ۱۹۷۰ء میں ملٹری کورٹ سے مجھے ۵ سال قید کی سزا سنائی گئی تو اس کی توثیق خود موصوف نے فرمائی تھی۔ ۱۹۷۰ء کا الیکشن میں نے جیل سے اس طرح لڑا تھا کہ میرے حلقۂ انتخاب پسرور میں میرے جلسوں میں پیپلز پارٹی کے کارکن میری جگہ، ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پڑی ہوئی میری قد آدم تصاویر سے پر کیا کرتے تھے اور الحمد للہ کہ میں نے جیل سے یہ الیکشن اس طرح جیتا کہ پورے پاکستان میں حاصل شدہ ووٹوں کی تعداد کے اعتبار سے شیخ مجیب الرحمٰن کے بعد میرا نمبر دوسرا تھا۔

O......O......O......O

ساتواں باب
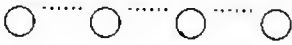
جزوی مارشل لاء کا نفاذ

اپریل میں جہاں پی۔ این۔ اے کی تحریک اپنے عروج پر تھی اور پولیس تحریک کو روکنے میں ناکام ہو چکی تھی، وہاں ان "ٹیکنو کریٹ صاحبان" پر بھی بوکھلاہٹ طاری تھی اور اب مسٹر بھٹو اپنے اقتدار کے دور عروج کے ان مشیران کرام کے مشوروں پر عمل کرنے کا خمیازہ بھگت رہے تھے۔ وزیر اعظم کے نزدیک اب یہ لوگ کسی اہمیت کے حامل نہ رہے تھے۔ وہ اپنے اقتدار کی بقا کے لئے اب یا تو اپنے اولین دور کے سیاسی رفیقوں کی طرف دیکھ رہے تھے اور یا پھر فوجی جرنیلوں کیساتھ میٹنگوں کا دائرہ وسیع کر رہے تھے۔ ایئر مارشل اصغر خان تو انتخابی مہم کے دوران ہی مسعود محمود اور ان تمام افسران کا نام لے کر وزیر اعظم بھٹو سمیت سب کو کوہالہ کے پل پر پھانسی دینے کے دعوے کرتے رہے تھے اور مسٹر بھٹو کے اقتدار کا تخت ڈولتے دیکھ کر یہ مشیران کرام اب اپنا وجود بچانے کے چکر میں تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ بھٹو حکومت کے زوال میں میرے نزدیک جہاں بے شمار اسباب و عوامل نے اپنا اپنا کردار ادا کیا وہاں زوال کا ایک اہم سبب وہ ظلم و تشدد تھا جو وزیر اعظم سے ملنے والی کرسیوں پر بیٹھ کر بیورو کریسی کے ان کل پرزوں نے عوام پر روا رکھا تھا۔ حضرت سیدنا علی مرتضےٰ رض کا قول ہے کہ .... "کافر کی حکومت چل سکتی ہے، مشرک اور منافق کی حکومت بھی چل سکتی ہے، لیکن ظالم کی حکومت نہیں چل سکتی" ہمارے دور حکومت میں عوام کی زبانیں بند رکھی گئیں ان کے سر جھکائے گئے نتیجے کے طور پر جب ۷ جنوری کو انتخابات کے اعلان کے بعد ۲۱ جنوری کو قومی اتحاد کے قیام کا اعلان ہوا تو پھر ایک دم ہی عوام کے ہاتھ بھی کھلے اور زبانیں بھی۔ جھکے ہوئے سر بھی اٹھے اور گردنیں بھی۔ ظالم ہمیشہ بزدل ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ صورت حال بھٹو دور کے ان ظالموں کے ساتھ بھی پیش آئی اور یہ لوگ اپریل ہی میں رسی تڑا کر بھاگنے کے چکر میں نظر آنے لگے یہ لوگ اتنے حواس باختہ تھے کہ مسٹر بھٹو نے کسی بھی معاملے میں ان لوگوں سے بات تک کرنا ترک کر دیا تھا۔ ان پر عوام کی اصل طاقت کا مظاہرہ ہو چکا تھا جو کبھی خود ان کی قوت کا سرچشمہ تھی اور جس سے انہیں ان کے مذکورہ بالا مشیروں نے بڑی حکمت عملی کے ساتھ محروم کر دیا تھا۔ انتخابات سے پہلے ان لوگوں کی بے پناہ قوت کا اندازہ نمونے کے ان چند خطوط سے کیا جا سکتا ہے جو یہ کابینہ کے وزرا کو مسٹر بھٹو کی طرف سے لکھا کرتے تھے۔ اب جب مسٹر بھٹو پر ان کی حقیقت کھلی تو انہوں نے ان لوگوں کو عضو معطل بنا کر ایک طرف

تو اپنے سیاسی رفیقوں کو اہمیت دی اور دوسری طرف فوج کے جرنیلوں کا سہارا لیا۔ یہاں بھی انہوں نے ایک طرف جہاں ایک صحیح فیصلہ کیا اور بیورو کریسی کا حصار توڑ کر عوام اور اپنے سیاسی رفیقوں کی طرف واپس آئے، وہاں ان سے جرنیلوں کا سہارا لینے کی آخری غلطی بھی سرزد ہوئی اور بدقسمتی سے بڑے آدمیوں کی غلطیاں بھی بڑی ہی ہوا کرتی ہیں اور ہر بڑے آدمی کے زوال میں اس کی کسی نہ کسی ایسی ہی غلطی نے ہمیشہ اہم کردار ادا کیا ہے۔

سیاسی افق پر وزیر اعظم نے پنجاب کی اپنی روٹھی ہوئی طاقت اور اپنے جانشین ملک غلام مصطفےٰ کھر کو منایا اور دوبارہ اپنے پہلو میں جگہ دی۔

انتخابی مہم کے انچارج رفیع رضا جی ہار بیٹھے تھے۔ آئینی اور قانونی معاملات کی ڈرافٹنگ کے لئے مسٹر بھٹو حفیظ پیرزادہ پر اور سیاسی افہام و تفہیم کی فضا بحال کرنے نیز علمائے کرام کا اعتماد حاصل کرنے کے لئے وزیر اعظم مجھ پر بھروسہ کر رہے تھے۔ کور کمانڈرز کے ساتھ مختلف امور میں بھی حفیظ پیرزادہ اور میں ہی وزیر اعظم کی معاونت کرتے تھے۔ بعض میٹنگوں میں حامد رضا گیلانی، حنیف خان اور ایک آدھ میں شیخ رشید، ٹکا خان اور عزیز احمد بھی شریک ہوئے۔ ایک دو میں غلام مصطفےٰ جتوئی اور ممتاز علی بھٹو بھی شریک رہے۔ بھٹو صاحب جرنیلوں کے ساتھ غلام مصطفےٰ جتوئی کے خوشگوار اور خلوص پر مبنی تعلقات سے بھی استفادہ کرنا چاہتے تھے کیونکہ بحیثیت وزیر اعلیٰ سندھ انہوں نے جہاں ایک عام آدمی کا اپنے حسن سلوک اور اخلاق سے دل جیتا تھا وہاں بہت سے جرنیل بھی ان کی شرافت قلبی کا احترام دل سے کرتے تھے۔

جس میٹنگ میں ایجی ٹیشن کے خاتمہ کے لئے بعض شہروں میں جزوی مارشل لاء کے نفاذ کا فیصلہ ہوا اس میں وزیر اعظم کے علاوہ" چیف آف آرمی سٹاف جنرل محمد ضیاء الحق، ایئر چیف مارشل ذوالفقار علی خان، حفیظ پیرزادہ، عزیز احمد اور میجر جنرل عبداللہ ملک شامل تھے۔ وزیر اعظم بھٹو نے اس میٹنگ میں پولیس کے کردار پر عدم اطمینان کا اظہار کیا اور کہا کہ لوگ تحریک کے دوران پولیس والوں کو ہار پہناتے ہیں، یہ لوگ ان سے کولڈ ڈرنکس قبول کرتے ہیں۔ ادھر عدلیہ کا یہ حال ہے کہ ادھر ہم کسی کو گرفتار کرتے ہیں ادھر اسے مجسٹریٹ رہا کر دیتے ہیں۔ وزیر اعظم کی بات ختم ہوئی تو چیف آف آرمی سٹاف جنرل ضیاء الحق نے رضا کارانہ پیشکش کرتے ہوئے کہا۔ "SIR WE WILL SORT THEM OUT"

.... اس پر وزیر اعظم نے ان سے استفسار کیا۔ .... "کیسے؟"

"ایسے مقامات پر مارشل لاء لگا دیتے ہیں جہاں زیادہ گڑبڑ ہے" جنرل ضیا الحق نے جواب دیا۔ اس پر مسٹر بھٹو نے غور سے ان کی طرف دیکھا اور گویا ہوئے۔

"مارشل لاء کیسے لگایا جائے اس کی تو آئین میں گنجائش نہیں ہے"

جنرل ضیا الحق گویا ہوئے۔

"سر!" آئین میں ترمیم بھی تو کی جا سکتی ہے۔"

اس تجویز کے سامنے آنے پر مسٹر بھٹو نے اٹارنی جنرل یحییٰ بختیار کو بلایا اور ان سے مشورہ کیا گیا۔

یہ میٹنگ اپریل کے آخری ہفتے میں ہوئی تھی اور اس کے راوی ایئر مارشل (ریٹائرڈ) ذوالفقار علی خان ہیں لیکن اس میٹنگ سے ایک روز پہلے پی۔ ایم۔ ہاؤس میں ایک اور میٹنگ ہوئی تھی۔ جس کے راوی ریٹائرڈ میجر جنرل عبداللہ ملک ہیں۔ میجر جنرل عبداللہ ملک کے بارے میں یہاں میں مختصراً یہ عرض کروں گا کہ وزیر اعظم بھٹو انہیں بے حد پسند کرتے تھے اور جیسا کہ چند مواقع پر میرے سامنے انہوں نے جنرل عبداللہ ملک کے بارے میں اظہار خیال کیا' اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وزیر اعظم آئندہ چیف آف آرمی سٹاف کے طور پر جنرل ملک کو دیکھنا چاہتے تھے۔ جنرل عبداللہ ملک بڑی خوبیوں والے انسان ہیں اور حقیقت پسندی کے علاوہ اظہار حقیقت ان کی طبیعت کا خاصہ ہے۔ ان دنوں بھی وہ بے دھڑک اپنی رائے کا اظہار کر دیا کرتے تھے جب مسٹر بھٹو کے مشیران کرام ہر وقت انہیں الٹے سیدھے مشورے دینے میں مصروف رہتے تھے۔ جنرل ملک ذاتی طور پر مسٹر بھٹو کے بے حد وفادار اور مداح تھے۔ ان دنوں وہ "چیف آف آرمی سٹاف" کے چیف آف سٹاف تھے۔

جنرل عبداللہ ملک بتاتے ہیں کہ ایک شام گھر پر انہیں وزیر اعظم کی طرف سے فون آیا جس کے ذریعے انہیں پی۔ ایم۔ ہاؤس پہنچنے کے لئے کہا گیا تھا۔ جنرل عبداللہ ملک نے پروٹوکول کا خیال کرتے ہوئے اپنے باس جنرل ضیاء الحق کو رنگ کر کے بتانا چاہا کہ وزیر اعظم نے انہیں بلوایا ہے' لیکن چیف آف آرمی سٹاف سے ان کی بات نہ ہو سکی۔ شام کو تقریباً سات بجے وزیر اعظم ہاؤس میں حاضر ہونا تھا۔ چنانچہ وقت پر پہنچے اور ڈرائنگ روم میں انہیں بٹھایا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وزیر اعظم تشریف لے آئے اور انہوں نے جنرل عبداللہ ملک کے ساتھ پہلی مرتبہ ملکی صورت حال پر گفتگو کی۔ وزیر اعظم نے جنرل ملک سے دریافت کیا کہ کیا ایجی ٹیشن کو ختم کرنے کے لئے مارشل لاء لگا دیا جائے۔ جنرل عبداللہ ملک نے ان کو نفی میں جواب دیا اور کہا کہ حالات کو سول ذرائع سے درست کیا جائے اور سیاسی معاملات میں فوج کو کم سے کم ملوث کیا جائے۔ یوں آئین بھی تو اس کی اجازت نہیں دیتا سر!" جنرل ملک نے اپنے دلائل کے آخر میں کہا۔

"تم نے آئین پڑھا ہے؟"۔ مسٹر بھٹو نے قدرے حیرت کے ساتھ پوچھا۔ "ہم تو حلف ہی آئین کے تحت اٹھاتے ہیں سر؟" جنرل ملک نے قدرے مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

اس پر مسٹر بھٹو نے انٹر کام اٹھایا اور دریافت کیا.......... "حفیظ کہاں ہے' اسے بھیجو۔"

حفیظ پیرزادہ کے آنے تک بعض مخصوص مقامات پر جزوی مارشل لاء کے نفاذ کے امکانات کا جائزہ لیا جاتا رہا اور جنرل ملک مسلسل اس خیال کو رد کرتے رہے۔ حفیظ پیرزادہ پہنچے تو انہوں نے فوراً رائے دی۔

"یہ کوئی مسئلہ نہیں' کل اسمبلی بلا کر آئین میں ترمیم کر لیں گے۔"

جنرل ملک نے پھر مخالفت کی اور کہا.......... "سر! ترمیم حالات کو مزید خراب کرے گی اور احتجاج ہو گا۔"

اس پر وزیر اعظم نے گویا فیصلہ دیتے ہوئے کہا۔

"یہ سیاسی معاملہ ہے' اسے آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔"

جنرل عبداللہ ملک نے کہا.......... "ٹھیک ہے سر! آپ اس پر آرمی چیف کی رائے لے لیں"

.... میٹنگ ختم ہو گئی۔

جنرل عبداللہ ملک نے گھر واپس پہنچ کر ساری بات جنرل ضیاء الحق کو بتائی کہ وزیر اعظم نے انہیں بلایا تھا اور کل غالباً وہ آپ سے اس موضوع پر گفتگو کریں گے۔

جزوی مارشل لاء کے نفاذ کے بعد تو چیف آف آرمی سٹاف اور کور کمانڈرز کے ساتھ میٹنگیں خاصے تسلسل کے ساتھ شروع ہو گئیں اور ان میں سے بیشتر میں حفیظ پیرزادہ اور میں مسٹر بھٹو کے ساتھ ہوتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ جزوی مارشل لاء کے نفاذ نے مکمل مارشل لاء کے نفاذ کا راستہ ہموار کر دیا تھا۔ آئین میں اس کے لئے ترمیم اگلے ہی روز کر دی گئی۔ .... اور اس کے بعد جرنیلوں کی سوچ بھی مکمل طور پر بدل گئی۔ وہ بجا طور پر یہ سوچنے لگے تھے کہ اگر حفاظت کرنا ہے تو پھر وہ خود کیوں نہ اقتدار سنبھال لیں۔ .... آخر مسٹر بھٹو کی ضرورت کیا باقی رہ جاتی ہے جب کہ قوم کا ایک بڑا حصہ ان کے اقتدار کا مخالف ہو چکا ہے۔ ذاتی طور پر میرا خیال ہے کہ جرنیلوں کے نام اصغر خان کا خط بھی ان کی سوچیں بدلنے کا باعث بنا تھا اور پی۔ این۔ اے کے بعض رہنماؤں سے کچھ جرنیلوں کے تعلقات کی رپورٹیں بھی انٹیلی جنس بیورو کے ذریعے مسٹر بھٹو تک پہنچی تھیں جس کا تذکرہ وزیر اعظم نے چیف آف آرمی سٹاف سے بھی کیا تھا اس پر جنرل ضیاء الحق نے وزیر اعظم سے احتجاج کیا تھا کہ انٹر سروسز انٹیلی جنس کی موجودگی میں جرنیلوں کے پیچھے انٹیلی جنس بیورو کو لگانا.......... فوج کی توہین کے مترادف ہے۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ یہ سلسلہ ختم ہونا چاہئے وزیر اعظم نے جنرل ضیاء الحق کو نہ صرف انٹیلی جنس بیورو کی طرف سے جرنیلوں کی نگرانی ختم کرانے کا یقین دلایا بلکہ ڈائرکٹر انٹیلی جنس اکرم شیخ کو فوری طور پر جرنیلوں کی نگرانی ختم کرنے کے احکامات بھی جاری کر دیئے۔ وہ ہر صورت جنرل ضیاء الحق کو مطمئن کرنا چاہتے تھے اور ان کی اس یقین دہانی پر انہیں مکمل بھروسہ تھا کہ قومی اتحاد کے رہنماؤں سے جرنیلوں کے تعلقات کی تحقیقات وہ خود کرائیں گے۔ چیف آف آرمی سٹاف کے موڈ کو دیکھتے ہوئے وزیر اعظم نے فوری نوعیت کے چند اور فیصلے بھی کئے تاکہ جنرل ضیاء الحق مطمئن ہو سکیں اور ۳۱ مئی کو انہوں نے اس گفتگو کے اگلے ہی روز اکرم شیخ کو ڈائرکٹر انٹیلی جنس بیورو کے عہدے سے ہٹا کر اپنے سپیشل سیکرٹری راؤ رشید کو ڈی آئی بی مقرر کر دیا۔ اکرم شیخ کو ایف آئی اے کا ڈائرکٹر لگا دیا گیا اور میاں اسلم حیات وٹو کو ایف۔ آئی۔ اے کی سربراہی سے ہٹا کر او۔ ایس۔ ڈی اسٹیبلشمنٹ ڈویژن لگا دیا گیا۔ ان پے در پے اقدامات کے ذریعے مسٹر بھٹو جرنیلوں کو یہ

باور کرانا چاہتے تھے کہ وہ ان کی وفاداریوں پر کامل یقین رکھتے ہیں۔ انٹیلی جنس بیورو نے اس کے بعد جرنیلوں کی نگرانی مکمل طور پر ختم کر دی اور اسی اقدام نے بیورو کریسی کو پوری طرح باور کرا دیا کہ اب بھٹو حکومت کا خاتمہ قریب ہے اور فوج اقتدار سنبھالنے والی ہے۔ چنانچہ بیورو کریسی کے اہم کل پرزوں نے بھی جرنیلوں سے روابط میں اضافہ کر دیا اور مستقبل کے حکمرانوں کو خوش آمدید کہنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ ۲۸ اپریل کو جب وزیراعظم نے قومی اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے پاکستان کے اندرونی معاملات میں امریکہ کی مداخلت کا الزام عائد کیا، اس وقت بھی ان کے اقتدار کا انحصار جرنیلوں کی صوابدید پر تھا۔ لیکن مئی کے آخر تک تو صورت حال مکمل طور پر ان کے قابو سے باہر ہو چکی تھی اور حالات پر جرنیلوں کی گرفت مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی جا رہی تھی گویا جزوی مارشل لاء کا نفاذ مسٹر بھٹو کے ہاتھ پاؤں باندھ گیا تھا۔

○ ..... ○ ..... ○ ..... ○

آٹھواں باب
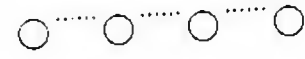
غیر ملکی ہاتھ؟

۲۸ اپریل ۱۹۷۷ء کی شام وزیراعظم نے قومی اسمبلی کے سامنے تقریباً پونے دو گھنٹے تک ایک نہایت جوشیلی تقریر کی۔ اس وقت تک پی۔ این۔ اے کے ساتھ مذاکرات شروع ہو چکے تھے۔ لیکن مذاکرات کے ذکر سے قبل تھوڑا سا جائزہ اگر مسٹر بھٹو کی تقریر کے حوالے سے پاکستان کے اندرونی معاملات میں امریکہ کی مداخلت کا لے لیا جائے تو کوئی مضائقہ نہ ہو گا۔ وزیراعظم نے اپنی جذباتی تقریر میں بحران کو بین الاقوامی سازش کا نتیجہ قرار دیا تھا اور کہا تھا کہ .... "ہاتھی مجھ سے ناراض ہے، ہاتھی نے ویت نام اور مشرق وسطیٰ پر ہمارے مؤقف کو تسلیم نہیں کیا۔ ہم نے عربوں کو ہتھیار سپلائی کئے ہم نے ایٹمی پلانٹ پر قومی مفاد کے مطابق مؤقف اختیار کیا۔ اس وقت ملک میں غیر ملکی کرنسی پانی کی طرح بہہ رہی ہے۔ کراچی میں ڈالر چھ سات روپے کا ہو گیا ہے۔ لوگوں کو اذانیں دینے کے لئے پیسے دیئے جا رہے ہیں۔ جیل جانے کا معاوضہ دیا جا رہا ہے اور یہ قومی اتحاد کی سازش نہیں، بلکہ بین الاقوامی سازش ہے۔ بلڈ ہاؤنڈز میرے خون کے پیاسے ہیں"۔ قومی اتحاد کے لیڈروں کے پاس اتنا دماغ اور صلاحیت نہیں کہ وہ تحریک کو یہاں تک لا سکتے۔ یہ سب کچھ بہت بڑے پیمانے پر بین الاقوامی مداخلت کا نتیجہ ہے۔

مسٹر بھٹو نے اپنی اس تقریر میں ماضی کے بعض واقعات کا حوالہ بھی دیا تھا کہ جنگ ویت نام کے دوران جب وہ وزیر خارجہ تھے تو امریکہ نے پاکستان کے مؤقف پر اعتراض کیا تھا اور چین کے خلاف اپنی اخلاقی امداد کا مطالبہ کرتے ہوئے ایوب خان کی موجودگی میں مسٹر بھٹو سے یہ تک کہا تھا کہ اور کچھ نہیں تو حمایت کی علامت کے طور پر پنگ پانگ کی گیندیں اور ٹیبل ٹینس کے ریکٹ ہی پاکستان امریکہ روانہ کر دے۔ ایوب خان نے اس موقع پر خاموشی اختیار کی لیکن مسٹر بھٹو نے صاف طور پر کہہ دیا کہ ہم کچھ نہیں بھیجیں گے کیونکہ اس کا تعلق اصولوں سے ہے۔

مسٹر بھٹو نے اپنی اس تقریر میں کہا۔

"ہاتھی کا حافظہ بڑا تیز ہوتا ہے، میرا یہ جرم معاف نہیں کیا گیا۔ چین سے ہاتھی کے شدید اختلافات تھے میں نے چین سے تعلقات بہتر بنائے تو یہ میرا ایک اور جرم بن گیا۔ میں نے مشرق وسطیٰ میں عربوں کی حمایت کی اور میری حمایت صرف زبانی یا سیاسی نہیں بلکہ فوجی نوعیت کی تھی۔ امریکہ نے ڈاکٹر

کسنجر کے دورے کے موقع پر بھارت کو برصغیر کی بالادست قوت قرار دیا۔ میں نے اس بات کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ میں نے اسلامی کانفرنس بلائی تو اسے ایک ماہ ملتوی کرنے کے لئے کہا گیا" میں نے ایسا کر دیا۔ پھر بلائی تو پھر ایک ماہ ملتوی کرنے کے لئے کہا گیا.......... میں نے پھر ایسا کر دیا۔ لیکن جب تیسری مرتبہ مجھ پر اس کو ملتوی کرنے کے لئے دباؤ ڈالا گیا۔ تو میں نے شاہ فیصل کو تفصیلی خط لکھا اور انہوں نے مجھ سے اتفاق کرتے ہوئے فروری میں اس کے انعقاد پر آمادگی ظاہر کر دی۔ (یہاں یہ واضح رہے کہ شاہ فیصل کے نام وزیر اعظم بھٹو کا وہ خط لے جانے والا میں ہی تھا۔) اسلامی کانفرنس کے بعد یاسر عرفات نے اقوام متحدہ سے خطاب کیا اور عالمی ادارے نے پی۔ ایل۔ او کو تسلیم کر لیا۔ ہم نے یونان اور ترکی کا تنازعہ ختم کرایا۔ کوریا نے اپنا تنازعہ طے کرنے کے لئے ہم سے رجوع کیا اور ہاتھی نے ان سب باتوں کو شدید ناپسندگی کی نگاہ سے دیکھا۔ تیسری دنیا کا خیال پیش کرنے پر بھی ہاتھی سمجھتا ہے کہ میں اس کے لئے مصیبت بن گیا ہوں۔ لیکن شکاری کتے میرے خون کے پیاسے سب سے زیادہ اس وقت ہوئے جب میں نے فرانس سے ایٹمی ری پروسیسنگ پلانٹ کی خریداری کا معاہدہ کیا۔ کسنجر آئے اور مجھے دھمکی دی۔ پھر فرانس گئے اور اخبارات میں خاصا شور مچایا۔ مجھ سے کہا گیا میں اس پر مذاکرات کروں۔ میں نے کہا آپ کے ہاں انتخابات ہو رہے ہیں وہ ہو جانے دیں پھر مذاکرات کروں گا۔ اب جب دوبارہ مجھ سے مذاکرات کے لئے کہا گیا تو میں نے جواب دیا کہ میرے ہاں انتخاب ہو رہا ہے۔ کل تک میں خاموش رہا لیکن اب عوام کو معلوم ہو جانا چاہئے کہ یہ بہت بڑی سازش ہے۔ یہ دیسی سازش نہیں۔ بین الاقوامی سازش ہے' پہیہ جام کرنے کی باتیں ہمارے ہاں پہلے کبھی نہیں ہوئیں۔ یہ بیرونی خیالات ہیں۔ یہ بیرونی ہتھکنڈے ہیں یہ باہر سے درآمد شدہ چیز ہے۔ نفاذ شریعت کا مطالبہ کرنے والے اب اسے اصل مسئلہ تسلیم نہیں کرتے نظام مصطفیٰ کے نام پر ملک میں جنون پھیلانے والے مولانا مودودی اب یہ کہتے ہیں کہ یہ اصل مسئلہ نہیں۔ اس سے ان کے عزائم بے نقاب ہو گئے ہیں۔ کراچی' حیدر آباد اور لاہور میں مارشل لاء آئین کے تحت لگایا گیا ہے۔ ہنگامی حالت آئین کے تقاضوں کے عین مطابق ہے۔ جزوی مارشل لاء بھی آئین کے مطابق ہے اور ہنگامی حالات کے اختیارات کے تحت لگایا گیا ہے۔ پہلے مارشل لاؤں نے آئین کو توڑا تھا۔ موجودہ مارشل لاء آئین کی حدود کے اندر اور اس کی دفعات کے عین مطابق ہے۔ پاکستان میں اسلام ہم نافذ کریں گے شراب اور جوئے پر پابندی ہم نے لگا دی ہے۔ شریعت کے نفاذ کے لئے قومی اتحاد والے اسلامی نظریاتی کونسل میں آ جائیں ہم دوسرے ملکوں سے بھی سکالر بلائیں گے۔ آئین میں لکھ دیا گیا ہے کہ سات سال کے اندر تمام قوانین قرآن و سنت کے مطابق بنا دیئے جائیں گے لیکن اگر قومی اتحاد کا مسئلہ یہ ہے تو ہم ان کے تعاون سے یہ کام چھ ماہ میں بھی کرنے کو تیار ہیں۔"

وزیر اعظم کی تقریر کا ایک اہم حصہ وہ تھا جس میں انہوں نے انکشاف کیا کہ ۲۱ اپریل کو امریکی سفارت خانے کے دو افسر فون پر خوش دلی کے ساتھ ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے۔"

THE PARTY IS OVER " پارٹی ختم ہو گئی۔ بندہ گیا.......... مال ختم" .... اس موقع پر مسٹر بھٹو شدت جذبات سے لرز رہے تھے۔ ان کا چہرہ سرخ اور آواز گونج دار تھی انہوں نے کہا۔

" حضرات پارٹی ختم نہیں ہوئی اور جب تک میرا مشن پورا نہیں ہوتا یہ ختم نہیں ہو گی۔ میں نے اس پر امریکی حکومت سے احتجاج نہیں کیا بلکہ اس کے برعکس سبکدوش ہونے والے امریکی سفیر کو ڈنر دیا۔ امریکہ کی حکومت نے الٹا مجھ سے احتجاج کیا کہ راولپنڈی کے لوگوں نے امریکہ مردہ باد کے نعرے لگائے ہیں۔ میں نے لوگوں کو ایسا کرنے کی ہدایت نہیں کی تھی۔ لوگ جب حزب اختلاف کے پاس ڈالروں کا خزانہ دیکھتے ہیں تو اس پر احتجاج کرتے ہیں۔ جو غیر ملکی میری سبکدوشی کی پیشگوئیاں کر رہے ہیں، میں انہیں حیرت زدہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہوں میں نے ماضی میں بھی انہیں حیرت زدہ کیا ہے اور اب پھر کر دوں گا۔ غیر ملکی طاقتیں میرے خون کی پیاسی ہیں لیکن میں سازشوں سے خوفزدہ ہونے والا نہیں۔ "

پاکستان کے معاملات میں اس وقت غیر ملکی مداخلت کے سلسلے میں وزیر اعظم نے پہلی مرتبہ براہ راست الزام عائد کیا تھا جس سے گیلریز میں بیٹھے ہوئے سفارتی نمائندے ہکا بکا رہ گئے تھے۔ لیکن اس تقریر سے بھی کہیں زیادہ سنگین اور سنجیدہ انداز میں انہوں نے بیرونی مداخلت کا ذکر اپنے اس بیان حلفی میں کیا ہے جو لاہور ہائی کورٹ کے روبرو نصرت بھٹو کیس کے سلسلے میں انہوں نے داخل کیا تھا۔ یہ بیان کوٹ لکھپت جیل سے انہوں نے بھیجا تھا۔ اس بیان کا بیشتر حصہ ان کی ۲۸ اپریل کی قومی اسمبلی میں تقریر پر مشتمل ہے لیکن اس میں انہوں نے بعض نئے انکشافات بھی کئے کہ کس کس طرح انہیں اقتدار سے محروم کرنے کے لئے امریکہ نے سازشیں کیں۔ وہ اپنے بیان کے پیراگراف نمبر ۱۰۶ میں تحریر کرتے ہیں۔

"قومی اسمبلی میں میری تقریر کے بعد امریکی سفارت خانے کے چارج ڈی افیئرز نے وزارت خارجہ سے احتجاج کیا کہ حکومتی سطح پر ہونے والی بات چیت کو عوامی سطح پر موضوع بحث نہیں بنانا چاہئے تھا۔ کیونکہ اس سے آئندہ حکومتی سطح پر کوئی گفتگو کرنا مشکل ہو گا۔ امریکہ نے یہ تو کہا لیکن میرے الزامات کی صحت سے انکار یا ان کی تردید نہیں کی۔ "

پیراگراف ۱۰۷ میں مسٹر بھٹو لکھتے ہیں۔

"اگست ۱۹۷۷ء میں کسنجر نے لاہور میں مجھے دھمکی دی کہ اگر ری پراسسنگ پلانٹ پر میں نے پالیسی تبدیل نہ کی تو مجھے خوفناک انجام کی عبرتناک مثال بنا دیا جائے گا۔ "

پیراگراف ۱۰۸ میں لکھتے ہیں۔

"امریکی وزیر خارجہ کی تجویز پر خاموش مذاکرات کے لئے میں نے اپنے وزیر خارجہ عزیز احمد کو پیرس بھیجا ان کے پاس پاکستان کے اندرونی معاملات میں امریکہ کی مداخلت کے شواہد پر مبنی پچاس صفحات کی دستاویزات تھیں۔ لیکن امریکی وزیر خارجہ نے ان دستاویزات میں چنداں دلچسپی نہ لی بلکہ وہ سب کچھ

دیکھنے کے بعد تبصرہ کیا کہ .... "سمجھداری ہی جوانمردی ہوتی ہے۔" انہوں نے ہمیں ماضی کو بھلا کر تعلقات کا نیا باب کھولنے کا درس دیا اور اسی رات ہوٹل کے جس کمرے میں عزیز احمد ٹھہرے ہوئے تھے، اس کے تالے توڑ کر کمرے کی تلاشی لی گئی۔ لیکن وہ پچاس صفحات کی دستاویزات ان کے کمرے میں نہیں بلکہ پاکستانی سفارت خانے کی تحویل میں تھیں چنانچہ تالا توڑنے والوں کے ہاتھ کچھ بھی نہ آیا۔ "

پیراگراف ۱۰۹ میں مسٹر بھٹو نے تحریر کیا ہے کہ "۵ جولائی ۱۹۷۷ء کے کچھ ہی عرصہ بعد عزیز احمد نے ان تمام دستاویزات کی ایک کاپی مسٹر غلام اسحٰق خان کو اس درخواست کے ساتھ دی تھی کہ اس کا بغور مطالعہ کریں۔ اگر عدالت پسند کرے تو غلام اسحٰق خان (موجودہ سینٹ کے چیئرمین) کو عدالت میں طلب کر کے ان سے پوچھے کہ پاکستان کے معاملات میں مداخلت کے سلسلے میں ان کاغذات میں کیا کچھ موجود ہے"

پیراگراف ۱۱۰ میں وہ لکھتے ہیں۔

"جون ۱۹۷۷ء میں ٹریپولی کی اسلامی وزرائے خارجہ کانفرنس میں بھی عزیز احمد نے یہ دستاویزی ثبوت تمام وزرائے خارجہ میں تقسیم کئے تھے جن پہ یقین کرتے ہوئے کانفرنس نے پاکستان کے اندرونی معاملات میں بیرونی مداخلت کے خلاف ایک قرارداد پاس کی تھی۔ "

پاکستان کے اندرونی معاملات میں مسٹر بھٹو کا اس درجہ اصرار بے وجہ اور بے ثبوت ہرگز نہ تھا لیکن امریکہ ہو یا کوئی اور ملک .... وہ حالات پیدا نہیں کر سکتا۔ حالات ہم خود پیدا کرتے ہیں' امریکہ تو انہیں استعمال کرتا ہے ان سے فائدہ اٹھاتا ہے سو امریکہ نے ۷ مارچ کے انتخابات کے بعد پیدا ہونے والی صورت حال سے بخوبی فائدہ اٹھایا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ امریکہ مسٹر بھٹو اور ان کی حکومت کا دشمن تھا اور اس دشمنی کا آغاز اس وقت ہوا جب امریکہ میں کارٹر بمقابلہ فورڈ انتخابات کے دوران مسٹر بھٹو نے امریکی سفیر کو بلا کر یہ کہا کہ وہ امریکہ کے انتخابات میں جیرالڈ فورڈ کی کامیابی کے لئے دعاگو ہیں اور اس سلسلے میں سرکاری سطح پر بھی ایسے بیانات دیں گے جو امریکی رائے عامہ پر فورڈ کے حق میں اثرات مرتب کر سکیں ۔ ان دنوں جارج ویسٹ پاکستان میں امریکہ کے سفیر تھے۔ بعد ازاں مسٹر بھٹو نے اس قسم کے بیانات جاری کئے کہ امریکہ کے پاکستان ایسے اتحادی ری پبلیکن پارٹی اور صدر فورڈ کی وائٹ ہاؤس میں موجودگی کی وجہ سے کافی اطمینان محسوس کرتے ہیں اور اگر خدانخواستہ صدر فورڈ انتخاب ہار گئے تو اس سے خطے میں عدم اطمینان کی کیفیت پیدا ہوگی اور امریکہ کا عالمی وقار مجروح ہوگا۔

امریکی انتخابات میں مسٹر بھٹو کی توقعات کے برعکس جمی کارٹر کامیاب ہو گئے ڈیموکریٹک پارٹی کی روایتی بھارت نواز پالیسیوں پر کاربند رہنے کے ساتھ ساتھ وہ مسٹر بھٹو کے بیانات کی وجہ سے ان سے ذاتی پرخاش بھی رکھتے تھے۔ پاکستان اور فرانس کے مابین ایٹمی ری پراسیسنگ پلانٹ کی فراہمی کا معاہدہ جسے انہوں نے اپنے وقار کا مسئلہ بنا لیا تھا، اس کے پس پشت بھٹو صاحب سے ان کی ذاتی مخاصمت

کے علاوہ اسرائیل کا دباؤ بھی کار فرما تھا۔ مسٹر بھٹو نے عرب اسرائیل جنگ کے دوران جس طرح مصر اور شام کی فوجی مدد کی تھی اور فضائیہ کے علاوہ بری افواج نے بھی اسرائیل کے خلاف جنگ میں اہم کردار ادا کیا تھا، اس سے کسنجر کا' جو خود بھی ایک متعصب یہودی ہیں برافروختہ ہونا قدرتی امر تھا' امریکہ یہ بھی جانتا تھا کہ اگر پاکستان ری پراسیسنگ پلانٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا اور ایٹم بم بنا تو وہ اسرائیل کے خلاف بھی استعمال ہو سکتا ہے اس وجہ سے امریکہ کی طرف سے بھٹو صاحب کی مخالفت سمجھ میں آتی ہے۔

جنرل ٹکا خان ابھی فوج کے سربراہ تھے یہ ان کی ریٹائرمنٹ سے پانچ چھ ماہ پہلے کی بات ہے۔ کرنل بلاٹی نامی ایک شخص امریکی سفارت خانے میں ملٹری اتاشی کے عہدے پر فائز تھا وہ انتہائی اہم اور باخبر شخص تھا۔ پشاور میں ایک فوجی افسر کے ساتھ گاف کھیلتے ہوئے اس نے انکشاف کیا کہ .... "تمہارے آئندہ چیف آف آرمی سٹاف جنرل محمد ضیاء الحق ہوں گے۔" اس وقت اس عہدے کے لئے تین نام سر فہرست تھے اور سروسز کے لوگ انہیں کا ذکر کرتے تھے۔ یہ تین نام جنرل شریف' جنرل مجید ملک اور جنرل عزت بخش اعوان کے تھے۔ جنرل ضیاء الحق کا نام کسی کے سان و گمان میں بھی نہ تھا۔ چنانچہ جب کرنل بلاٹی نے اس فوجی افسر کے سامنے جس کا تعلق پاک فضائیہ سے تھا، جنرل ضیاء الحق کا ذکر کیا تو لامحالہ اسے بے حد تعجب ہوا۔ اس نے ایئر مارشل ذوالفقار علی خان کو یہ بات بتا دی۔ لیکن وہ ہنس کر ٹال گئے اور اسے کوئی خاص اہمیت نہ دی۔ چھ ماہ بعد وہی نام جو کرنل بلاٹی نے بتایا تھا پاکستان آرمی کے چیف آف سٹاف کے طور پر ساری دنیا کے سامنے آیا اور جنرل ضیاء الحق اپنے سے کئی سینئر جرنیلوں کو سپرسیڈ کر کے پاکستانی فوج کے سربراہ بن گئے۔

کرنل بلاٹی جنرل ضیاء الحق کے دور حکومت ہی میں اپنی ملازمت سے ریٹائرڈ ہوا اور بعد ازاں ۱۹۸۵ء میں جب وہ پاکستان کے نجی دورے پر آیا تو صدر ضیاء الحق نے ایوان صدر میں اس کی ضیافت کی۔

۲۱ مئی ۱۹۷۷ء کو جب ایک طرف پی۔ این۔ اے اور حکومت کے درمیان مذاکرات کے لئے گراؤنڈ بن رہی تھی اور دوسری جانب بھٹو حکومت کے خلاف پی۔ این اے کی تحریک بھی زوروں پر تھی امریکہ کے ایک سابق سفیر جوزف فارلینڈ اچانک پاکستان کے دورے پر پہنچے یہ صاحب مشرقی پاکستان کے بنگلہ دیش بننے کے تکلیف دہ مراحل میں بھی سولہ سترہ روز ڈھاکہ اور کراچی وغیرہ میں نظر آئے تھے۔ ان کے بارے میں حکومت کے پاس مصدقہ اطلاعات تھیں کہ یہ سی۔ آئی۔ اے کے بہت اہم عہدیدار ہیں۔ کراچی' لاہور اور راولپنڈی میں ان صاحب نے بعض پاکستانی رہنماؤں سے کئی خفیہ ملاقاتیں کیں جو حکومت کے نوٹس میں تھیں اور ان کی سرگرمیوں کا پورا ریکارڈ عزیز احمد کی تحویل میں تھا جس سے وزیر اعظم بھٹو کے الزامات کی تصدیق ہوتی تھی۔

۲۴ مئی کو جب امریکہ نے پاکستان میں اپنے سفیر کا تبادلہ کر دیا۔ تو سبکدوش ہونے والے امریکی سفیر کے اعزاز میں چیف آف آرمی سٹاف نے آرمی ہاؤس میں ایک ضیافت دی جس کے لئے انہوں

نے نہ تو وزارت خارجہ سے اجازت لی تھی اور نہ ہی وزیر اعظم سے (کم از کم مسٹر بھٹو نے ہمیں یہ بتایا تھا اور اگر اجازت لی بھی ہو اور بھٹو صاحب نے اس سلسلے میں غلط بیانی سے کام لیا ہو تو اس کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے کہ وہ اتنے بے بس اور کمزور ہو گئے تھے کہ اپنے چیف آف آرمی اسٹاف کو اس دعوت کی اجازت نہ دینا بھی اب ان کے بس میں نہیں رہا تھا۔)

مجھے اس دعوت کی صحیح تاریخ تو یاد نہیں البتہ اتنا یاد ہے کہ یہ سول حکومت کا تختہ الٹنے سے متصل ہی کسی تاریخ میں منعقد ہوئی تھی۔ غالباً ان دنوں پی۔ این۔ اے سے ہمارے مذاکرات جاری تھے اور مجھے یاد ہے کہ اجلاس سے واپس جاتے ہوئے میں نے آرمی ہاؤس کو بقعۂ نور بنے خود دیکھا تھا۔

ان تمام امور کے پیش نظر یہ بات صاف تھی کہ امریکہ ہر قیمت پر ان حالات سے فائدہ اٹھانے کے موڈ میں تھا جو بد قسمتی سے اندرون ملک وزیر اعظم بھٹو کے خلاف پیدا ہو چکے تھے۔ ایک طرف جہاں اس کے روابط بعض سیاسی رہنماؤں کے ساتھ تھے وہاں دوسری طرف پاکستانی فوج کے اعلیٰ افسران میں بھی اس کا حلقہ اثر موجود تھا۔

یہ امر آج ایک "عظیم المیہ" نظر آتا ہے کہ جس بھٹو کی حکومت کے خاتمہ کے لئے امریکہ نے ہر طرف ایک جال بچھا دیا تھا، اسی بھٹو کی بیٹی لیبیا پر امریکی جارحیت کے خلاف ایک حرف مذمت بھی کہنا پسند نہیں کرتی بلکہ پاکستان واپسی سے پہلے امریکہ کی آشیرباد لینے واشنگٹن اور نیویارک کے چکر کاٹتی ہے۔ ایک ایسی صورت حال میں امریکہ کو اپنا دوست سمجھتی اور دوسروں کو باور کراتی ہے کہ جب "واشنگٹن پوسٹ" میں اس سے متعلق ایسا مضمون شائع ہو رہا ہو کہ............ "امریکہ نے پہلی مرتبہ ایک مقبول عوامی لیڈر کو غیر مقبول بنانے کا تجربہ کیا ہے جو سو فی صد کامیاب رہا ہے۔"

؎

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

○.....○.....○.....○
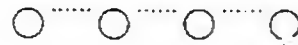
نواں باب

ری پراسیسنگ پلانٹ کے پس پردہ حقائق

پاکستان کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرنے اور وزیر اعظم بھٹو کو بیرونی دنیا کے سامنے اسرائیل کے اشارے پر "دوسرا ہٹلر" اور انہیں عالمی امن کے لئے خطرہ ثابت کرنے کے لئے امریکہ نے جس چیز کا سب سے زیادہ سہارا لیا وہ فرانس کے ساتھ مسٹر بھٹو کا ایٹمی ری پراسیسنگ پلانٹ کی فراہمی کا معاہدہ تھا۔ اس مسئلہ پر اب تک حقائق بہت کم ظاہر ہوئے ہیں اور افسانہ طرازی زیادہ کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں جذباتی نعرہ بازی نے بھی بہت کام دکھایا ہے اور وزیر اعظم بھٹو کے دانا دشمنوں سمیت نادان دوستوں نے بھی اس معاملے میں ان کے حقیقی کارنامے کو نعروں کے گرد و غبار میں چھپانے کی ہر ممکن سعی کی ہے۔ میں اس باب میں پہلی مرتبہ وہ حقائق دنیا کے سامنے لانے کی کوشش کر رہا ہوں جن پر ابھی تک تہہ در تہہ پردے پڑے ہوئے ہیں۔ بھٹو جو بھی تھے............ جیسے بھی تھے............ لیکن پاکستان کو ایک عالمی طاقت بنانے اور بین الاقوامی برادری میں اسے نمایاں ترین مقام دلانے کے شوق میں جنون کی حد تک مبتلا تھے اور پاکستان کو ایٹمی قوت بنانے کا ان کا جنون اور خواب تو بہت قدیم تھا۔ انہوں نے ۱۹۶۵ء میں جب وہ ایوب کابینہ میں وزیر خارجہ تھے نہایت جذباتی انداز میں کہا تھا۔

"اگر بھارت نے ایٹم بم بنایا تو چاہے ہمیں گھاس اور پتے کھانا پڑیں............ یا ہم بھوکے رہیں لیکن ہم بھی ایٹم بم بنا کر رہیں گے کیونکہ ہمارے پاس اس کا کوئی متبادل تو ہو گا۔ ایٹم بم کا جواب ایٹم بم ہی ہو سکتا ہے۔"

۱۸ مئی ۱۹۷۴ء کو بالآخر بھارت نے پہلا باقاعدہ ایٹمی دھماکہ کیا اور پاکستان کے عوام کی اکثریت پر اس کے جو اثرات مرتب ہوئے، وہ وزیر اعظم بھٹو کے لئے بجائے خود ایک چیلنج کی حیثیت رکھتے تھے لوگ لامحالہ مسٹر بھٹو کی طرف سے کسی جوابی اقدام کے منتظر تھے لیکن وزیر اعظم بھٹو کی مجبوری یہ تھی کہ وہ اس ضمن میں جو کچھ کر چکے تھے اور جو کچھ کرنے والے تھے، اسے گوناگوں عالمی تنازعات کے سبب ظاہر کرنے سے قاصر تھے پھر بھی انہوں نے اپنی بیشتر تقاریر اور بیانات کے ذریعے نہ صرف اندرون ملک عوام کا مورال بلند رکھا اور مجھے وزیر اطلاعات و نشریات کے علاوہ پارٹی کا سیکرٹری اطلاعات ہونے کی حیثیت میں خصوصی اقدامات کے لئے ہدایات دیں بلکہ قومی اسمبلی میں بھی برملا بھارت کے ایٹمی دھماکے پر شدید رد عمل کا اظہار

کیااور واضح طور پر یہ دھمکی دے دی کہ اب ہمیں بھی اس اقدام سے باز نہیں رکھاجاسکے گا۔ مجھے انہوں نے عالمی سطح پر بھارت کے خلاف پروپیگنڈہ **سائنٹیفک** بنیادوں پر چلانے کی ہدایت کی اور خود نہایت خاموشی کے ساتھ اس مذاکراتی مہم میں لگے رہے جوانہوں نے فرانس کی ایس۔ جی۔ این نامی فرم کے ساتھ ۱۹۷۳ء میں شروع کی تھی۔ جس کے تحت یہ فرم پاکستان کوری پراسیسنگ پلانٹ کی فراہمی کی شرائط طے کررہی تھی۔ وزیراعظم بھٹو خارجہ امور پر جتنی گہری نظر رکھتے تھے اس کے پیش نظر یہ تصور بھی نہیں کیاجاسکتا کہ وہ بھارت کے متوقع ایٹمی دھماکے سے بے خبر تھے ان کے پاس اس سلسلے میں تمام تازہ ترین اطلاعات تھیں اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ بھارت نے کس طریق کار کے ذریعے اور کتنا سرمایہ خرچ کر کے یہ کامیابی حاصل کی ہے۔ تاہم انہوں نے بھارت کے ایٹمی دھماکے کے بعد بعض نمایاں پاکستانی **سائنسدانوں** کی اچھی خاصی گوشمالی کی تھی' جو یہ دعویٰ کرتے تھے کہ بھارت کی طرح کاایٹمی دھماکہ کرنا ہمارے لئے بچوں کا کھیل ہے۔

فرانسیسی فرم کے ساتھ معاہدہ میں فرانسیسی حکومت باقاعدہ فریق کی حیثیت سے شریک تھی اور تین سال تک جو مذاکرات ہوتے رہے ان میں وزیراعظم نے فرانسیسی حکومت سمیت ایٹمی تحفظات کے عالمی ادارے آئی۔ اے۔ ای۔ اے کو بھی ہر قسم کی ضمانتیں اور یقین دہانیاں فراہم کر دی تھیں۔ ان کی تمام شرائط من و عن تسلیم کر لی تھیں۔ انہوں نے یقین دلایا تھا کہ پاکستان کو دیا جانے والا ری پراسیسنگ پلانٹ صرف صنعتی مقاصد کے لئے توانائی کے حصول تک محدود رہے گا۔ لیکن ساری یقین دہانیاں کرانے کے بعد مسٹر بھٹو نے جو اپنا کارڈ کھیلا' وہ یہ تھا کہ معاہدے میں کوئی ایک بھی ایسی شق موجود نہ تھی جس کے ذریعے پاکستان اس امر کا پابند ہوتا کہ خود اپنے ذرائع سے' اپنے **سائنسدانوں** کے ذریعے وہ ویسا ہی دوسرا پلانٹ نہ لگا سکے گا' جس کی فراہمی فرانس سے ہونا تھی یا یہ کہ وہ دوسرا پلانٹ پاکستان کسی عالمی ادارے کی نگرانی میں دینے کا پابند ہوگا۔ بین الاقوامی تحفظات کے ضمن میں وزیراعظم اس حد تک چلے گئے تھے کہ تسلیم کردہ پابندیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کا تصور بھی محال تھا کہ پاکستان ری پراسیسنگ پلانٹ سے جوہری بم بنا سکے گا، ری پراسیسنگ پلانٹ کی خریداری کا آئیڈیا مسٹر بھٹو کے ذہن میں ان کے سائنسی امور کے مشیر ڈاکٹر عبدالسلام اور ایٹمی توانائی کمیشن کے چیئرمین مسٹر منیر احمد خان نے ڈالا تھا۔ کسی بھی معاملے کی تمام ترجزئیات پر نظر رکھنے والے بھٹو نیو کلیئر ٹیکنالوجی کے باب میں نامکمل معلومات اور اندرون و بیرون ملک دوسرے بے شمار مسائل میں پھنسے ہونے کے سبب اس پروجیکٹ کے تمام پہلوؤں کا خود جائزہ نہ لے سکے اور یہ سارا کام پاکستان سائنس فاؤنڈیشن اور اٹامک انرجی کمیشن کے ذمے ڈال کر خود اس مسئلہ کے سیاسی اور معاشی پہلوؤں میں الجھ گئے۔ سب سے بڑی بات تو ۳۰۰ ملین ڈالر کے اس منصوبے کے لئے سرمائے کے حصول کا سوال تھا جس کے لئے انہوں نے عالم اسلام خصوصاً خلیجی ریاستوں اور تیل کی دولت سے مالامال عرب ممالک سے رجوع کیا جہاں سے انہیں مثبت یقین دہانیاں حاصل ہوئیں۔

خصوصاً لیبیا' سعودی عرب' متحدہ عرب امارات' کویت اور عراق کی جانب سے انہیں ہر قسم کے مالی تعاون کی پیشکش ہوئی عرب اسرائیل جنگ کے دوران پاکستانی افواج کے ہاتھوں اسرائیلی فوج کے دانت کھٹے کرا کے وہ عرب دنیا میں بے پناہ وقار پہلے ہی حاصل کر چکے تھے اور عرب سربراہوں کو اس امر میں ذرا بھی شک نہ تھا کہ پاکستان کا ایٹم بم اسرائیل کے مقابل خود ان کے تحفظ کی بہت بڑی ضمانت ہوگا۔ ادھر خود مسٹر بھٹو اپنی زبان سے اس معاملے پر ایک لفظ بھی کسی کو بتانے پر آمادہ نہ تھے' ملک بھر میں گنتی کے چند لوگ ان کے اصل پروگرام سے آگاہ تھے۔ جب اراکین اسمبلی بعض وزراء اور اعلیٰ حکام کی اس سلسلے میں تشویش کو انہوں نے حد سے گزرتے دیکھا تو آخر ایک روز انہوں نے اقدام لیا اور ایک میٹنگ میں نہایت معنی خیز انداز میں کہا "ہمیں اس ٹیکنالوجی کو ہر قیمت پر حاصل کرنا ہے' بین الاقوامی تحفظات صرف اس ایک پلانٹ تک محدود ہوں گے۔ میں نہیں سمجھتا کہ ہمارے **سائنسدان** اور ہنرمند اتنے نااہل ہوں گے کہ ایک ٹیکنالوجی کو دیکھنے اور سمجھنے کے باوجود خود اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر ویسا ہی دوسرا پلانٹ تعمیر نہ کر سکیں جس پر ہم کسی بھی قسم کے بین الاقوامی تحفظات قبول کرنے کے پابند نہ ہوں گے۔"

وزیراعظم جانتے تھے کہ ان کا پروگرام طویل اور صبر آزما ہے لیکن انہیں اس کا بھی یقین تھا کہ آخر کار وہ عرب دوستوں کے تعاون سے اپنے خواب کو شرمندۂ تعبیر ہوتے دیکھ سکیں گے۔ اس ضمن میں شاہ فیصل مرحوم کے پاس گفت و شنید کے لئے صرف مجھے ہی انہوں نے کم و بیش چار مرتبہ بھیجا تھا۔ جب کہ دوسرے ممالک کے ساتھ آغا شاہی' عزیز احمد' اے۔ جی۔ این قاضی' غلام اسحٰق خان' منیر احمد اور نجانے کتنے لوگ اس سلسلے میں ان کی بہت سی ایسی ہدایات پر عمل کر رہے تھے جن کے مقاصد سے شاید وہ خود بھی کم ہی آگاہ تھے۔ لیکن جب ۱۹۷۴ء میں بھارت نے راجستھان میں ایٹمی دھماکہ کیا تو اچانک ساری صورت حال ہی بدل گئی۔

ایک بہت بڑی اور انقلابی تبدیلی جولائی ۱۹۷۴ء یا شاید جون میں یہ آئی کہ وزیراعظم کو ہالینڈ سے ایک خط موصول ہوا جس میں میٹالرجی میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے والے ایک محب الوطن پاکستانی ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے انہیں آگاہ کیا تھا کہ وہ فلزیات کے ماہر اور لاتعداد تحقیقی مضامین کے مصنف ہونے کے علاوہ ایک عالمی شہرت یافتہ کتاب کے بھی مصنف ہیں۔ لیکن کراچی سٹیل مل کے نااہل اہلکار ان کی خدمات سے استفادہ نہیں کر رہے اور انہوں نے ان کی کسی پیشکش کا کوئی موزوں جواب نہیں دیا۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ وہ یورینیم کی افزودگی ایسے پیچیدہ اور مشکل ترین کام میں بھی مہارت رکھتے ہیں اور آج کل ہالینڈ میں المیلو کے مقام پر یورینکو نامی پروجیکٹ پر ایف ڈی او کے تحت کام کر رہے ہیں جس کا مقصد سینٹری فیوج سسٹم کے ذریعے یورینیم کی افزودگی ہے اور یہ پلانٹ برطانیہ ہالینڈ اور جرمنی کے مشترکہ سرمائے اور **سائنسدانوں** کے اشتراک سے عرصہ ۲۰ سال سے اس کام میں مصروف ہے۔ ڈاکٹر قدیر نے لکھا تھا کہ وہ سٹیل مل کے لئے بے حد مفید خدمات سرانجام دے سکتے ہیں۔ لیکن اس سلسلے میں ان کی

پیشکشوں کا کوئی مثبت جواب نہیں دیا جارہا۔

اس خط نے گویا وزیر اعظم کے ذہن میں طوفان برپا کر دیا اور ان کی تیز نگاہ نے تمام باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے المیلو پلانٹ سے ڈاکٹر قدیر کی وابستگی اور یورینیم کی افزودگی میں مہارت کو بھانپ لیا۔ انہوں نے خفیہ ذرائع سے ڈاکٹر قدیر کو اطلاع بھجوائی کہ وہ چھٹی لے کر پاکستان آئیں اور ان سے ملاقات کریں۔ اس کے ساتھ مسٹر بھٹو نے پاکستانی سیکرٹ سروسز اور سفارت خانوں کو المیلو پلانٹ کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کے لئے مشن پر لگا دیا۔ جب وہ تمام معلومات ان کے سامنے آئیں تو جیسے ان کی آنکھوں کے سامنے سے بہت سے پردے ہٹ گئے انہوں نے ڈاکٹر قدیر کے بارے میں بھی تحقیقات کرائیں اور ان کے بارے میں مفصل معلومات حاصل کیں۔ جن کی روشنی میں وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ یہی وہ آدمی ہے جو پاکستان کو ایٹمی قوت بنانے کے ان کے خواب کو جلد از جلد پایہ تکمیل تک پہنچا سکتا ہے۔ انہوں نے ڈاکٹر قدیر کو ہدایات بھجوائیں کہ وہ کسی کو کسی بھی قسم کے شک وشبہ کا موقع دیئے بغیر نارمل انداز میں چھٹی لے کر پاکستان پہنچیں اور ان کے ملٹری سیکرٹری بریگیڈیر امتیاز سے رابطہ قائم کریں۔ دسمبر ۱۹۷۴ء میں ڈاکٹر عبدالقدیر خان اپنی بیگم اور بچیوں سمیت کراچی پہنچے۔ بھٹو صاحب نے فوراً انہیں اسلام آباد بلوایا اور سمجھایا کہ آپ لوہا بنانے کے چکر میں نہ پڑیں بلکہ ہمیں یہ بتائیں کہ یورینیم کی افزودگی کا کام کس طرح شروع کیا جاسکتا ہے۔

بھٹو صاحب اس وقت منیر احمد خان پر بھی بے حد اعتماد کرتے تھے چنانچہ انہوں نے انہیں ہدایت دی کہ وہ ڈاکٹر عبدالقدیر سے ملیں اور ان کے مشوروں پر عمل در آمد کرائیں۔ ڈاکٹر قدیر منیر خان سے ملے اور انہیں صحیح طریقے پر نیو کلیئر ٹیکنالوجی کے حصول کے جدید ترین نظام سے آگاہ کر کے کراچی واپس چلے گئے۔ جانے سے پہلے انہوں نے مسٹر بھٹو سے ایک ملاقات اور کی اور بتایا کہ انہوں نے سارا کام منیر احمد خان کو سمجھا دیا ہے۔ ڈاکٹر قدیر کچھ عرصہ بعد ہالینڈ اپنی ملازمت پر واپس چلے گئے لیکن اب ان کے سامنے گویا ایک باقاعدہ مشن تھا۔ وہ کئی زبانوں کے ماہر ہونے کے سبب ڈچ' انگلش اور جرمن سائنسدانوں کی مرتبہ رپورٹوں کے کو آرڈینیٹر بھی تھے۔ اس لئے سینٹری فیوج سسٹم کی تنصیبات کے ایک ایک پہلو سے آگاہ تھے۔ جانے سے پہلے انہوں نے بھٹو صاحب سے ملاقات میں ری پراسیسنگ پلانٹ کی خریداری میں مضمر نقصانات سے انہیں پوری طرح آگاہ کر دیا تھا اور بتلایا کہ ۳۰۰ ملین ڈالر کا یہ سفید ہاتھی کم از کم بھی اپنی مکمل تنصیبات کے لئے بیس سال کا عرصہ لے گا۔ در حقیقت ری پراسیسنگ پلانٹ کی خریداری سے پہلے پاکستان کے پاس مطلوبہ مقاصد حاصل کرنے کے لئے تین بنیادی پلانٹ ضروری تھے۔

اول پیداواری ری ایکٹر' جو پلوٹینیم تیار کر سکے۔
دوم ایندھن تیار کرنے والا ری ایکٹر

سوم بھاری پانی کا پروڈکشن پلانٹ۔

تب کہیں جا کر ری پراسیسنگ پلانٹ کا نمبر آتا تھا۔ جو ایٹم بم کی تیاری کے حصول میں مددگار ثابت ہو سکتا۔ پھر سب سے بڑی بات یہ تھی کہ یہ تمام پلانٹ ایٹمی توانائی کے بین الاقوامی ادارے کے تحفظات سے بالاتر ہوتے جس کا ایک فی صد امکان بھی نہ تھا کیونکہ ہر چیز کے لئے ہم مغربی ممالک کے محتاج تھے' پاکستان کے پاس KANUPP کے علاوہ کوئی پاور ری ایکٹر نہ تھا نہ ری پروسیس کے لئے ایندھن کے ذخائر تھے۔ مسٹر بھٹو کے جنون سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کے سائنسی مشیروں نے انہیں بے حد غلط اور ادھوری معلومات فراہم کر کے ایک اچھا خاصا بڑا دھوکہ دیا تھا۔ جس کا پردہ اب چاک ہو چکا تھا۔ مسٹر بھٹو فرانس کے ساتھ معاہدے کو اس نوعیت تک لے جا چکے تھے کہ اب واپسی بہت مشکل تھی۔ نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن کی سی کیفیت تھی۔ اگر وہ معاہدہ منسوخ کرنا چاہتے تو بھاری اخراجات کا نقصان برداشت کرنے کے علاوہ معاہدہ سے پھرنے کے سلسلے میں بھاری تاوان بھی ادا کرنا پڑتا تھا۔ جسے برداشت کرنے سے پاکستان کی اقتصادی حالت قاصر تھی۔ دنیا بھر میں تیل کی قیمتیں ہوشربا حد تک بڑھی تھیں۔ ملکی مجموعی قومی پیداوار کا گراف گر رہا تھا۔ آئے دن سیلاب اور زلزلوں کا سامنا تھا۔ فصلیں اچھی نہیں جا رہی تھیں۔ غرضیکہ اقتصادی اعتبار سے پاکستان گوناگوں مشکلات کا شکار تھا اور ایسے عالم میں وزیر اعظم کے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ وہ ۳۰۰ ملین ڈالر کے اس سفید ہاتھی کو خرید سکیں یا اس کی خریداری کے اس معاہدے سے منکر ہو سکیں جس کے لئے انہوں نے ۳ سال تک مذاکرات کئے تھے اور پاکستان سے فرانس جانے والی مختلف مذاکراتی ٹیموں کے دوروں پر لاکھوں ڈالر خرچ آئے تھے انہوں نے ایک انتہائی کٹھن اور دشوار فیصلہ کیا جو انہیں کے سے مضبوط ترین اعصاب کا مالک شخص کر سکتا تھا۔ لیکن اس فیصلے کے چند اور اسباب بھی تھے جن میں اہم ترین بات یہ تھی کہ دسمبر ۱۹۷۵ء میں ڈاکٹر عبدالقدیر پھر پاکستان واپس آئے۔ کراچی ایئرپورٹ پر جب وہ اترے تو ان کے پاس صرف تین بڑے صندوق تھے جن میں ان کی یادداشتوں پر مبنی نوٹسوں کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ وزیر اعظم بھٹو نے انہیں اسلام آباد آنے کی دعوت دی۔ وہ اسلام آباد پہنچے تو وزیر اعظم بھٹو شہنشاہ ایران کے ساتھ لاڑکانہ چلے گئے۔ لیکن جانے سے پہلے ہدایات دے گئے کہ منیر احمد خان' ڈاکٹر قدیر کو وہ تمام کام دکھائیں جو ایک سال کے دوران ان کی ہدایات کے تحت ہوا ہے اور کام کی رفتار سے بھی آگاہ کریں۔ ڈاکٹر قدیر کام کی نوعیت دیکھ کر بے حد مایوس ہوئے کیونکہ گاڑی وہیں کھڑی تھی جہاں وہ اسے چھوڑ کر گئے تھے۔ ڈاکٹر قدیر کے مجوزہ پروجیکٹ کے لئے کمیشن میں ایک ایم۔ ایس۔ سی الیکٹریکل انجینئر انچارج بنایا گیا تھا جو یورینیم کی افزودگی کے منصوبے کو سمجھنے کی صلاحیت سے بھی محروم تھا۔ وزیر اعظم بھٹو جب اسلام آباد واپس آئے تو انہوں نے ڈاکٹر قدیر خان کو طلب کیا اور رپورٹ مانگی۔ بھلا ڈاکٹر خان کیا رپورٹ پیش کرتے؟ انہوں نے دل برداشتہ ہو کر واپس ہالینڈ جانے کا فیصلہ کر لیا تھا کیونکہ وہ بیوروکریسی کے جال کے سامنے خود کو بے بس

پاتے تھے۔ انہوں نے محسوس کر لیا کہ نیو کلیئر ٹیکنالوجی کے سلسلے میں مسٹر بھٹو کے مشیر اور بیورو کریسی کے کل پرزے انہیں مسلسل غلط اطلاعات دے کر قومی سرمایہ ضائع کرتے رہے ہیں۔ مسٹر بھٹو نے ڈاکٹر قدیر کی ساری بات بہت توجہ سے سنی اور انہیں چند دن پاکستان ہی میں رہ کر انتظار کرنے کو کہا۔

یہ موقع تھا جب مسٹر بھٹو نے اس سارے معاملے پر مجھے اعتماد میں لیا اور صورت حال کے تمام پہلو میرے سامنے رکھ کر مجھ سے رائے طلب کی۔ لامحالہ میں یہ باتیں جان کر بیک وقت غم و غصہ کا شکار ہوا کہ کس طرح ہماری بیورو کریسی جوہر قابل کو ضائع کرتی ہے اور اگر کوئی محب الوطن شخص اپنی صلاحیتوں سے وطن کو مستفید کرنا چاہتا ہے تو کس کس طرح اس کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کی جاتی ہیں۔ میں نے وزیر اعظم کو یہی مشورہ دیا کہ وہ ہر قیمت پر ڈاکٹر قدیر کو روکیں اور مناسب ہو گا کہ ان کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے کے لئے ایک مکمل طور پر آزاد ادارہ قائم کر دیا جائے جس کے وہ خود سربراہ ہوں اور اس ادارے میں انہیں جو ہنر مند فراہم کئے جائیں وہ سول محکموں یا بیورو کریسی کی بجائے فوج سے لئے جائیں۔ وزیر اعظم کو یہ بات غالباً پسند آئی اور انہوں نے میری رائے سے اتفاق کرتے ہوئے اگلے روز ڈاکٹر قدیر کو ملاقات کے لئے طلب کر لیا اور انہیں بتایا کہ وہ کس طرح ان کی سربراہی میں ایک مکمل طور پر خود مختار ادارہ قائم کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ جس پر کسی قسم کا کوئی "چیک" نہیں ہو گا اور اس ادارے کے لئے اپنے مدد گاروں کا انتخاب ڈاکٹر صاحب چاہیں تو خود پاک فوج سے کر سکتے ہیں۔ اور اگر چاہیں تو اس سلسلے میں وزیر اعظم کی صوابدید پر اعتماد کریں۔ ڈاکٹر قدیر نے وزیر اعظم کو جواب دیا کہ وہ اپنی بیگم سے مشورہ کر کے بتائیں گے مسٹر بھٹو نے انہیں مشفقانہ انداز میں حکم دیا کہ ایک گھنٹہ تک اپنی بیگم سے مشورہ کر کے انہیں اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیں۔ ٹھیک ایک گھنٹہ بعد ڈاکٹر قدیر نے فون پر وزیر اعظم کو اطلاع دی کہ وہ ہالینڈ واپس نہیں جا رہے بلکہ پاکستان ہی میں رہ کر یورینیم کی افزودگی کا پلانٹ لگائیں گے۔ میں نے دیکھا کہ وزیر اعظم کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا تھا۔ انہوں نے میز پر اپنے مخصوص انداز میں مکہ مارتے ہوئے کہا۔

"I WILL SEE THE HINDU BASTARDS NOW"

اس وقت مسٹر بھٹو کی مسرت کا عالم دیدنی تھا۔

وزیر اعظم بھٹو کے فیصلے اکثر بہت پہلو دار ہوتے تھے اور بسا اوقات ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے انہوں نے اپنے تمام رفیقوں کے مشورے نظر انداز کر کے کوئی اور ہی فیصلہ کیا ہو لیکن بعد ازاں جب ان کے فیصلے کے نتائج سامنے آتے تھے تو اکثر ہم لوگ حیران رہ جاتے تھے۔ انہوں نے میرے اور اپنے درمیان طے پانے والے پروگرام کے قطعی برعکس اچانک ہی ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی تقرری اٹامک انرجی کمیشن کے ایڈوائزر کے طور پر کر دی اور حکم دیا کہ وہ کمیشن کی رہنمائی کریں اور پلانٹ لگائیں۔ چند ہفتے ڈاکٹر قدیر نے اس ادارے میں گزارے اور جب دیکھا کہ وہاں ہر چیز پی۔ ڈبلیو۔ ڈی P.W.D. کی طرز پر چل رہی ہے اور

ان کے لئے وہ کام کرنا مشکل ہے جس کے لئے انہیں تعینات کیا گیا ہے تو انہوں نے ملٹری سیکرٹری برائے وزیر اعظم کو اپنے جذبات سے آگاہ کر دیا کہ یہاں رہ کر وہ کوئی کام نہیں کر سکتے۔ یہ ساری باتیں امتیاز کی وساطت سے وزیر اعظم کے علم میں آ گئیں۔ انہوں نے امتیاز کو حکم دیا کہ اپنے طور پر بریگیڈیر (اب لیفٹیننٹ جنرل) زاہد علی اکبر خان سے تمام الزامات کی تصدیق کریں۔ ڈاکٹر خان کے مطالبہ پر مسٹر بھٹو نے انہیں کور آف انجینئرز کی جو ٹیم دی تھی زاہد علی اکبر اس کے سلسلے میں سول ورکس کے ذمہ دار تھے۔ امتیاز نے زاہد علی اکبر سے بات کی تو پتہ چلا کہ معاملات میں سخت گڑبڑ ہے کوئی کام نہیں ہو رہا بلکہ وزیر اعظم کے ساتھ فراڈ کیا جا رہا ہے اور ڈاکٹر قدیر خان وطن چھوڑ کر جانے کا سوچ رہے ہیں۔ مسٹر بھٹو نے یہ سب کچھ سنا تو انہیں شدید غصہ آیا، انہوں نے ڈاکٹر قدیر کو طلب کیا اور تمام حالات دریافت کئے۔ انہوں نے سب کچھ صاف صاف مسٹر بھٹو کو بتا دیا کہ لوگ کس طرح نیو کلیئر ٹیکنالوجی کے حصول کے سلسلے میں ان کے اضطراب کو ایکسپلائٹ کر رہے ہیں اور انہیں غلط اطلاعات فراہم کی جا رہی ہیں۔

وزیر اعظم نے ڈاکٹر قدیر کو تسلی دے کر رخصت کر دیا اور اسی شام مجھے پی۔ ایم۔ ہاؤس میں طلب کر لیا۔ انہوں نے مختصراً ساری صورت حال مجھے بتائی اور بولے "مولانا" میں اس سنہری موقع کو ہاتھ سے جاتے نہیں دیکھ سکتا' یہ آدمی بہت قیمتی ہے (ان کا اشارہ ڈاکٹر قدیر کی طرف تھا) اس کا کوئی معقول حل نکالیں"۔ میں نے انہیں مشورہ دیا کہ آپ اس معاملے میں سیکرٹری جنرل فنانس' اے۔ جی۔ این قاضی' سیکرٹری وزارت خارجہ آغا شاہی' عزیز احمد اور غلام اسحق خان کو اعتماد میں لیں اور ان حضرات کے ساتھ ڈاکٹر قدیر کی بھی ملاقات کرا دیں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا مسٹر بھٹو ——— سخت ناراض تھے کیونکہ ان کی دانست میں ——— انہیں قوم کے سامنے شرمسار کرایا گیا تھا۔ لاہور کی ایک میٹنگ میں جس میں آغا شاہی اور ڈاکٹر امیر محمد خان (موجودہ چیئرمین زرعی تحقیقاتی کونسل' اور جنرل امتیاز بھی موجود تھے) مسٹر بھٹو نے ——— بڑے سخت الفاظ استعمال کیئے۔ میں یہاں وہ الفاظ درج کرنے سے قاصر ہوں۔ ان کے طیش کو دیکھتے ہوئے جنرل امتیاز نے تجویز پیش کی کہ ڈاکٹر امیر محمد کو ایٹمی توانائی کمیشن کا چیئرمین لگا دیا جائے۔ لیکن چونکہ ڈاکٹر امیر بھی ایٹمی سائنس دان نہ تھے اس لئے فیصلہ ہوا کہ اس ادارے کی سربراہی کسی اچھے ایڈمنسٹریٹر کو دے دی جائے جس کے لئے بھٹو صاحب نے جنرل رحیم الدین خان (موجودہ چیئرمین جوائنٹ چیف آف سٹاف کمیٹی) اور جنرل سعید قادر (موجودہ سینیٹر) کے نام تجویز کیئے۔ مختلف تجاویز سامنے آتی رہیں۔ میرا مشورہ یہ تھا کہ کہوٹہ پروجیکٹ کو بالکل خفیہ طور پر علیحدہ کر دیا جائے۔ یہ مشورہ بعد ازاں اے۔ جی۔ این قاضی غلام اسحق خان اور آغا شاہی نے بھی دیا۔

جولائی ۱۹۷۶ء میں ملٹری سیکرٹری امتیاز نے بھٹو صاحب کو جب وزارت خارجہ سے فون کر کے انہیں میٹنگ کے فیصلوں سے آگاہ کیا جس میں یہ تمام حضرات شریک تھے تو میں موجود تھا۔ بھٹو صاحب

نے فوراً تمام تجاویز کی منظوری دے دی اور ڈاکٹر قدیر کی یہ شرط بھی مان لی کہ کہوٹہ ریسرچ لیبارٹریز میں ان کو کام کرنے کی مکمل آزادی حاصل ہوگی۔ غلام اسحاق خان اور اے جی این قاضی نے بغیر کسی رکاوٹ کے مطلوبہ فنڈز کی بروقت فراہمی کا یقین دلایا۔ چنانچہ جولائی ۱۹۷۶ء میں کہوٹہ ریسرچ لیبارٹریز کا قیام عمل میں آیا اور ڈاکٹر خان نے یقین دلایا کہ صرف سات سال بعد وہ پاکستان کو ایٹمی توانائی کے میدان میں عالمی طاقتوں کے مقابل لا کھڑا کریں گے۔ بھٹو صاحب کو ان پر پورا بھروسہ تھا۔ چنانچہ انہوں نے ہم سب کے مشورے پر ایٹمی توانائی کمیشن کے ادارے کو نمائشی گھوڑے کے طور پر کام کرنے دیا لیکن جوہری توانائی کے میدان میں اصل کام ڈاکٹر قدیر کے حوالے کر دیا گیا۔ جن کی مدد کے لئے سنٹرل ورکس آرگنائزیشن کے نام سے لیفٹیننٹ جنرل زاہد علی اکبر خان اور میجر جنرل انیس علی سید کی سربراہی میں ایک ادارہ قائم کر دیا گیا۔ جو ڈاکٹر قدیر کو درکار سہولتوں اور اشیا کی فراہمی کا ذمہ دار تھا۔ اس سلسلے میں غلام اسحاق خان کا کردار بھی نہایت اہم ہے جنھوں نے کبھی فنڈز کا مسئلہ کھڑا نہ ہونے دیا۔

۸ اگست ۱۹۷۶ء کو جب کسنجر پاکستان پہنچے تو ان کے سامنے لے دے کے صرف فرانس سے ری پراسیسنگ پلانٹ کی خریداری کا معاہدہ تھا جسے کارٹر صرف اور صرف بھٹو کی مخاصمت میں ایک عالمی مسئلہ اور بھٹو کو امن عالم کے لئے خطرہ ثابت کر رہے تھے۔ حالانکہ یہ بات ان پر بھی ظاہر تھی کہ ری پراسیسنگ پلانٹ پاکستان کے کسی مطلب کا نہیں ہے۔ خصوصاً ملٹری آپشن کے اعتبار سے بالکل بے مقصد ہے۔ جب کسنجر نے وزیر اعظم بھٹو کو اس سلسلے میں "ہولناک انجام کی عبرتناک مثال" تک بنا دینے کی دھمکی دے دی تو مسٹر بھٹو نے وہ کٹھن اور مشکل فیصلہ کیا جس کے بارے میں میں نے قبل ازیں ذکر کیا ہے۔ وزیر اعظم کی خود اعتمادی اپنے عروج پر تھی اور انہوں نے ری پراسیسنگ پلانٹ کی خریداری کے معاہدے سے نپٹنے کے لئے ایک طویل ڈرامے کا پلاٹ سوچ لیا جس کے مرکزی کردار کارٹر اور کسنجر تھے۔ ان دنوں بھی بعض واقفان حال نے فرانس سے ری پراسیسنگ پلانٹ کی خریداری کے معاہدے کی مخالفت کی تھی اور اس کا ملٹری آپشن نہ ہونے کے سبب اس معاہدے کو ختم کرنے کی ضرورت پر زور دیا تھا۔ ایسے حضرات میں ہفت روزہ "اخبار جہاں" کے کالم نگار حبیب الرحمٰن اور "پاکستان اکنامسٹ" کے بعض کالم نگار سر فہرست تھے۔ خود مسٹر بھٹو کی بھی یہی منشا اور مرضی تھی کہ کہوٹہ ریسرچ لیبارٹریز کے کام کو ساری دنیا سے چھپا کر اس کی توجہ ری پراسیسنگ پلانٹ کی خریداری پر مرکوز کرا دی جائے اور اس نمائشی گھوڑے کے مسئلے پر اتنی شدت سے سٹینڈ لیا جائے کہ امریکہ خود ہی فرانس پر دباؤ ڈال کر اس معاہدے کی تنسیخ کرا دے اور یوں جو تاوان پاکستان کو دینا پڑے وہ الٹا پاکستان کو فرانس دے۔ آج کل بعض عالمی اداروں اور فرانس کے ساتھ پاکستان کے ساتھ معاہدے سے پھرنے کے سبب اس تاوان کی ادائیگی کا معاملہ بھی زیر بحث ہے جس سے نپٹنے کے لئے فرانسیسی حکومت بھی اس منسوخ شدہ معاہدے کے بارے میں تمام باتیں بھلا کر پاکستان کو ری پراسیسنگ پلانٹ کی فراہمی کی پیشکش کر رہی ہے۔ ۱۶ مارچ ۱۹۷۶ء کو اس پلانٹ کی فراہمی کے

معاہدے پر حکومت پاکستان کو بہ امر مجبوری دستخط کرنا پڑے تھے۔ ۱۱ جون ۱۹۷۷ء کو پیپلز پارٹی کی حکومت کا جو آخری بجٹ قومی اسمبلی کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس میں پلانٹ کی خریداری کے لئے صرف چالیس کروڑ روپے (۴۰ کروڑ) کی رقم مختص ظاہر کی گئی تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ اونٹ کے منہ میں زیرے والی بات تھی۔ .... بھٹو صاحب اس معاہدے کے جال میں پھنسنے کے بعد اب اس سے نکلنے کی ترکیبیں سوچ رہے تھے چنانچہ انہوں نے اس پلانٹ کے سلسلے میں عالمی سطح پر ہونے والی غوغا آرائی میں مزید اضافہ کرنے اور امریکہ کو "فلیراپ" کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ امریکہ نے بھی پاکستان کو ڈرانے دھمکانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی کہ اس نے ۲ جون کو وہ معاہدہ منسوخ کر دیا جس کے تحت پاکستان کو ۱۱۰ لڑاکا طیاروں کی فراہمی ہونا تھی۔ نیویارک ٹائمز نے ۱۹ جون ۱۹۷۷ء کو یہ خبر شائع کر دی تھی کہ فرانس نے پاکستان کو ایٹمی ری پراسیسنگ پلانٹ کی فراہمی کا معاہدہ منسوخ کر دیا ہے۔ جبکہ معاہدہ کی عملی منسوخی کا اعلان جون ۱۹۷۸ء میں اس وقت کیا گیا جب مسٹر بھٹو اقتدار سے معزول کئے جا چکے تھے۔ مسٹر بھٹو نے ہائی کورٹ میں اپنے بیان حلفی میں وزیر خارجہ عزیز احمد اور سائرس وانس کی رہبری میں جس ملاقات کا تذکرہ کیا ہے وہ ۳۱ مئی ۱۹۷۷ء کو ہوئی تھی اور اسی رات عزیز احمد کے کمرے کے تالے توڑے گئے تھے اور انہوں نے کارٹر کو فون کر کے اس امر پر سخت برہمی کا اظہار کیا تھا حتیٰ کہ پاکستان کو ری پراسیسنگ پلانٹ کی فراہمی کے عہد پر قائم رہنے تک کا کہہ دیا تھا۔ اس کے بعد مسٹر بھٹو کی ذات پوری شدت سے کارٹر کا ہدف بن گئی تھی۔ لیکن وہ نہیں جانتے تھے کہ بھٹو انہیں اپنے مقاصد کے لئے کس بری طرح استعمال کر رہے ہیں۔ کارٹر کو احمق بنانے کے چکر میں مسٹر بھٹو ہر حد سے گزر گئے اور دوسری طرف کارٹر نے بھی اپنے "دہقانی مزاج" کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہر قیمت پر بھٹو حکومت کے خاتمہ کا فیصلہ کر لیا۔ جس کا مزید ثبوت ۲۷ اپریل ۱۹۷۷ء کو گارجین میں شائع ہونے والے والٹر شوارٹز کے ایک مضمون سے ملتا ہے جس میں اس نے لکھا ہے کہ پاکستان کی حزب اختلاف کو غیر ملکی امداد ملنے کا معاملہ خلاف قرائن نہیں مضمون نگار نے تحریک استقلال اور مسلم لیگ کو سرمایہ داروں کی جماعتیں قرار دیا اور امریکہ کی مداخلت کے ثبوت کے طور پر لکھا کہ امریکہ کی جانب سے حزب اختلاف کی حمایت کی اس وقت تصدیق ہو گئی تھی جب امریکہ نے پاکستان کے ہاتھ آنسو گیس کے گولے فروخت کرنے سے انکار کر دیا۔ واشنگٹن پوسٹ نے بھی کم و بیش ایسا ہی مضمون شائع کیا تھا۔ بہ ایں ہمہ ۲ مئی کی اشاعت میں تہران جرنل نے بی۔ بی۔ سی پر شدید تنقید کی کہ وہ پاکستان کے بارے میں فتنہ انگیز خبریں نشر کر رہا ہے اور پاکستان کے اندرونی معاملات میں مداخلت بیجا کا مرتکب ہو رہا ہے۔ تہران جرنل نے واضح طور پر الزام عائد کیا تھا کہ بی۔ بی۔ سی یہ سب کچھ امریکہ کے اشارے پر کر رہا ہے۔

جس وقت مسٹر بھٹو یہ چومکھی جنگ لڑ رہے تھے کہ ایک طرف کارٹر کو چھیڑ چھیڑ کر اس کے ذریعے

فرانس پر دباؤ کو تیز سے تیز کر رہے تھے۔ دوسری طرف کہوٹہ پلانٹ کو پوری دنیا سے پوشیدہ رکھنے کے لئے کوشاں تھے۔ تیسری طرف اندرون ملک اپوزیشن کے ایجی ٹیشن سے نبرد آزما تھے اور چوتھی طرف جرنیلوں کو قابو میں رکھنے کے لئے ان سے آئے دن میٹنگ میں کر رہے تھے۔ اسی دوران وہ پوری دنیا میں سنٹرل ورکس آرگنائزیشن کے ذریعے ان ضروری آلات اور پرزہ جات کی خریداری کا جال بچھا رہے تھے جو کہوٹہ ریسرچ لیبارٹریز کے لئے درکار تھے۔ یہ سب کچھ کوئی معمولی بات نہ تھی۔ ایک تنہا انسان بیک وقت اتنے محاذ کھولے ہوئے تھا کہ اس کا تصور کرنا بھی محال تھا۔

ایٹم بم کا حصول مسٹر بھٹو کا جنون تھا، لیکن ایٹم بم بنانے کے بارے میں بیانات دینا جتنا سہل ہے اس کی تیاری اتنا ہی دشوار عمل ہے۔ امریکہ نے ۱۹۴۵ء میں ہیروشیما اور ناگاساکی پر جن ایٹم بموں کے ذریعے قیامت برسائی تھی۔ وہ قدرتی یورینیم سے سائنسی اصطلاح میں ایک جزو "پی۔ یو۔ ۲۳۹" کی پراسیسنگ پلانٹ کے بعد استعمال کے ذریعے تیار کئے گئے تھے۔ بھارت نے ۱۹۷۴ء میں جو ایٹمی دھماکہ کیا، اس میں بھی یہی طریق کار اختیار کیا گیا تھا اور ظاہر ہے کہ اب یہ طریق کار متروک شمار ہوتا تھا۔ سائنسی ترقی ۱۹۴۵ء کے مقابلے میں اب کافی آگے نکل چکی تھی۔ امریکہ دوسری جنگ عظیم کے فوراً بعد سے ورجینیا یونیورسٹی میں یورینیم کی افزودگی کے ذریعے جوہری بم کی تیاری کا پروگرام شروع کر چکا تھا جس کے دو معروف طریقے ہیں۔ ایک گیس ڈیفیوژن اور دوسرا سینٹری فیوج۔ اس دوسرے طریقے کی ایجاد کا کام امریکہ نے درمیان میں کئی مرتبہ روکا لیکن کمیونسٹ بلاک پر اپنی برتری قائم رکھنے کی کوشش میں پھر اس منصوبے پر کام شروع کر دیا جاتا رہا۔ برطانیہ، جرمنی اور ہالینڈ نے مشترکہ طور پر ۱۹۵۴ء میں اس منصوبے پر کام شروع کیا اور المیلو کے مقام پر ایک خفیہ پلانٹ اربوں ڈالر اور ہزاروں سائنس دانوں کی مدد سے شروع کیا۔ امریکہ کو اس منصوبے کی بھن گن ملی تو اس نے اپنے تینوں حلیف ممالک پر بھی اس سلسلے میں دباؤ ڈالنا شروع کیا اور ۱۰ مارچ ۱۹۶۱ء تک دباؤ ڈالتا رہا کہ یہ تینوں ممالک یورینکو نامی اپنے اس منصوبے کو ترک کر دیں لیکن یہ ممالک اپنے کام میں لگے رہے۔ خود امریکہ کو سینٹری فیوج کے ذریعے یورینیم کی افزودگی میں کامیابی ۱۹۷۹ء میں حاصل ہوئی جب وہ پورٹس ماؤتھ کے مقام پر واقع پلانٹ میں اس کی مکمل تنصیبات پر قادر ہو گیا۔ تاہم امریکہ کا یہ پلانٹ پوری طرح کام ۱۹۸۹ء تک شروع کرے گا۔ یہاں میں یہ واضح کرتا چلوں کہ یورینیم کی افزودگی میں کامیابی حاصل کرنے کا مطلب ڈائریکٹ جوہری بم تیار کر لینا ہے جس کے لئے نہ تو بھاری پانی کی ضرورت ہے، نہ کوئی ری ایکٹر لگانے یا ری پراسیسنگ پلانٹ خریدنے کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے۔ مسٹر بھٹو کو جب کوئیوں کے مول خود پاکستانی سائنس دانوں اور انجینئروں کی کاوشوں سے یہ سب کچھ مل رہا تھا تو انہیں کیا ضرورت تھی کہ وہ ری پراسیسنگ پلانٹ کا سفید ہاتھی خرید کر پاکستان کی معیشت کو تباہ کرتے۔ چنانچہ وہ اس پلانٹ کو پاکستان کی اقتصادیات کے لئے سم قاتل تصور کرتے تھے۔ کابینہ میں ڈاکٹر قدیر یا کہوٹہ پلانٹ کا مسئلہ کبھی زیر بحث نہیں آیا تھا۔ یہ سب کچھ صرف

چند افراد کے درمیان کا معاملہ تھا لیکن اب یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ہو سکتا ہے کہ امریکہ کو کسی طرح درحقیقت اس منصوبے کی بھی بھن گن مل گئی ہو اور مسٹر بھٹو امریکہ کی توجہات کو صرف ری پراسیسنگ پلانٹ تک محدود رکھنے میں کامیاب نہ رہ سکے ہوں، تاہم اس کے امکانات کم ہی ہیں، لیکن خود مسٹر بھٹو کو اپنے مشیروں اور کابینہ کے کچھ ارکان پر امریکی تعلقات کا شبہ تھا۔ امریکہ مسٹر بھٹو کے اقتدار کے درپے جو ہوا تو اس کے اسباب محدود نہیں تھے، تاہم اس میں کوئی شک نہیں کہ ۱۰ جون کو قومی اسمبلی میں وزیر اعظم نے تقریر کے دوران ری پراسیسنگ پلانٹ کی خریداری کے سلسلے میں جس شدومد سے اپنے عزائم کا اظہار کیا تھا اس کے بعد بات امریکہ کے لئے ناقابل برداشت ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر قدیر کا نام تو سینٹری فیوج سسٹم کی کہوٹہ اور سہالہ کے مقام پر تنصیب کے معاملے میں بہت بعد میں سامنے آیا۔ وہ بھی ۱۹۸۲ء کے لگ بھگ جب پاکستان اس معاملے میں کامیابی حاصل کر چکا تھا اور مجھے یقین نہیں کہ امریکہ کو اس معاملے کی کوئی خبر ۱۹۷۶ء میں مل چکی ہو گی۔ تاہم امکانات موجود ہیں۔ اگرچہ وزیر اعظم بھٹو امریکہ کو ری پراسیسنگ پلانٹ کے چکر میں ڈالے رکھنے میں پوری طرح کامیاب تھے۔

ڈاکٹر قدیر اور کہوٹہ ریسرچ لیبارٹریز کے بارے میں خود مسٹر بھٹو کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ ہائی کورٹ اور بعد ازاں سپریم کورٹ میں اپنے حق میں ہر قسم کے دلائل دینے کے دوران وہ صرف ری پراسیسنگ پلانٹ کو امریکہ سے وجہ مخاصمت بتا رہے تھے اور کہوٹہ ریسرچ لیبارٹریز کے ڈاکٹر قدیر کا نام ان کی زبان پر نہیں آیا تھا۔ لیکن یہاں یہ امر شک پیدا کرتا ہے کہ امریکہ محض ری پراسیسنگ پلانٹ کے مسئلے پر ان کے پیچھے نہیں پڑ سکتا تھا جب کہ امریکیوں پر یہ واضح تھا کہ پلانٹ پاکستان کے لئے ملٹری آپشن نہیں رکھتا۔ مسٹر بھٹو کے خلاف امریکہ کا پوری قوت سے محاذ کھول دینا اس شک میں مبتلا کرتا ہے کہ کہیں امریکہ کو کہوٹہ پلانٹ کے سلسلے میں تو کوئی بھن گن نہیں مل گئی تھی۔ بہرحال اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا، خصوصاً اب جب کہ پاکستان مسٹر بھٹو کے خواب کی تعبیر حاصل کر چکا ہے اور ان کے خلاف تمام ممکنہ سازشیں کرنے کے باوجود امریکہ پاکستان کو اس کی راہ سے نہیں ہٹا سکا، اس کا معلوم کرنا ایسا ضروری بھی نہیں رہا۔

وزیر اعظم بھٹو ۱۸ جون کو ہفتہ کے روز سعودی عرب روانہ ہوئے۔ جہاں شاہ خالد سے ہنگامی ملاقات کے بعد انہیں اسی روز لیبیا روانہ ہونا تھا۔ ان کے ہمراہ عزیز احمد، آغا شاہی، افضل سعید، مسعود کی نور، اے۔ بی۔ اے۔ فاروق، مسعود محمود اور چند دیگر حکام تھے۔ وفد میں شریک لوگوں کے نام بھی امریکہ کو یہ باور کرانے کے لئے کافی تھے کہ مسٹر بھٹو درحقیقت پلانٹ کی خریداری کے لئے سرمایہ حاصل کرنے ہی جا رہے ہیں ورنہ ایک انتہائی کشیدہ اندرونی صورت حالات میں اور اپوزیشن کے ساتھ مذاکرات کے انتہائی نازک موڑ پر ان کا ملک سے باہر جانا انتہائی ناقابل فہم نظر آتا تھا۔ ان کی ملک سے عدم موجودگی کے دوران ہی مذاکرات میں تعطل آیا جس پر سوموار ۲۰ جون کو اسلام آباد میں مولانا مفتی محمود نے شدید تنقید

کی اور یہ کہا کہ مسٹر بھٹو کو قومی اتحاد سے مشورہ کئے بغیر ملک سے باہر نہیں جانا چاہئے تھا انہوں نے کہا کہ مجھ سے بھٹو نے صرف لاڑکانہ تک جانے کی بات کی تھی اور اب وہ ابو ظہبی میں بیٹھے ہیں۔

مولانا مفتی محمود کو کیا پتہ تھا کہ مسٹر بھٹو انتہائی تھکے ہوئے ہونے کے باوجود لاڑکانہ تھکن اتارنے کے لئے جانے کی بجائے اچانک بیرون ملک کیوں دوڑے تھے۔ اور انہوں نے کیوں اسی روز یعنی ۲۰ جون کو ابو ظہبی ٹی۔ وی۔ کو انٹرویو دیتے ہوئے یہ کہا تھا کہ پاکستان ہر قیمت پر ری پراسیسنگ پلانٹ حاصل کر کے رہے گا اور کیوں مسٹر بھٹو نے تیسری اسلامی سربراہی کانفرنس بلانے کی تجویز پیش کی تھی۔ ان کے اس انٹرویو کا ایک اہم ترین حصہ جس پر امریکہ مزید چیں بہ جبیں ہو سکتا تھا وہ تھا جس میں انہوں نے اسلامی ممالک کے درمیان مشترکہ دفاع کے سمجھوتے کی ضرورت پر زور دیا تھا۔ امریکہ اور خصوصاً کارٹر کے ساتھ جتنی بڑی پنجہ آزمائی مسٹر بھٹو کر رہے تھے مفتی محمود مرحوم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ان تمام باتوں سے جمی کارٹر کا یہ یقین پختہ ہو چکا تھا کہ بھٹو متذکرہ بالا اسلامی ممالک کے تعاون سے ری پراسیسنگ پلانٹ حاصل کر لیں گے، بلکہ ان ممالک سے فرانس پر دباؤ بھی ڈلوائیں گے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ پلانٹ کے دیگر لوازمات بھی اسی طرح حاصل کر لیں۔ ۲۲ جون کو وزیر اعظم اچانک ہی اپنے وفد کے ہمراہ تہران سے کابل جا پہنچے اور وہاں بھی انہوں نے یہی بیان دیا کہ فرانس معاہدہ کے سلسلے میں اپنے فیصلے پر قائم ہے۔ ملک سے باہر مسٹر بھٹو کے ان اعلانات نے امریکہ کو بے حد برافروختہ کیا اور یہی مسٹر بھٹو کا مقصد بھی تھا کیونکہ اس وقت ان کے سامنے اس کے سوا کوئی دوسرا مسئلہ ہی نہ رہ گیا تھا کہ وہ ہر قیمت پر کہوٹہ ریسرچ لیبارٹریز کی تنصیبات اور وہاں شروع ہونے والے "اصل کام" کو دنیا بھر سے پوشیدہ رکھ کر فرانس کے ساتھ ری پراسیسنگ پلانٹ کی خریداری کے معاہدے سے جان چھڑائیں۔ اگرچہ ان کا یہ منصوبہ ان کی موت کے بعد پایہ تکمیل تک پہنچا اور آج اپنے دیرینہ خواب کی تعبیر دیکھنے کے لئے وہ ہم میں موجود نہیں لیکن ایٹمی ترقی کے باب میں ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ خصوصاً جس طرح انہوں نے اپنی ایک غلطی کا ازالہ کرنے کے لئے ایک ایسا پلاٹ تیار کیا جس سے عالمی طاقتیں تک غچہ کھا گئیں، وہ ایک ایسا کارنامہ ہے جسے صرف مسٹر بھٹو ہی انجام دے سکتے تھے۔
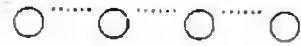
دسواں باب

مارشل لاء کے حق میں یحییٰ بختیار کے دلائل

کراچی اور حیدر آباد میں جزوی مارشل لاء کے نفاذ اور سمری ملٹری کورٹس کے قیام کے خلاف لاہور ہائی کورٹ میں ملک غلام جیلانی نے رٹ دائر کر دی تھی جس کے فل بنچ کے سامنے ایڈووکیٹ جنرل نے حکومت کے اس اقدام کے حق میں دلائل دیتے ہوئے کہا کہ فوج کو سول انتظامیہ کی مدد کے لئے بلایا گیا ہے نیز یہ کہ ہائی کورٹ مارشل لاء سے متعلق درخواست کی سماعت کرنے کی مجاز نہیں ہے۔ انہوں نے یہ دلائل ۱۸ مئی ۱۹۷۷ء کو دیئے تھے ۲۸ مئی کو اٹارنی جنرل یحییٰ بختیار نے لاہور ہائی کورٹ کے سامنے دلائل دیتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ مارشل لاء ملک کو بچانے کے لئے نافذ کیا گیا ہے ۲ جون جمعرات کے روز ہائی کورٹ نے درخواست پر اپنا فیصلہ سنا دیا جس کے مطابق آئین میں مارشل لاء کے نفاذ کی کوئی گنجائش نہ تھی اور شہریوں پر آرمی ایکٹ کے تحت فوجی عدالتوں میں مقدمات نہیں چلائے جا سکتے تھے۔ یہ فل بنچ کا فیصلہ تھا جس میں اسلم ریاض حسین، کرم الٰہی چوہان، شبیر حسین قادری، ذکی الدین پال اور ڈاکٹر جاوید اقبال شامل تھے۔ اٹارنی جنرل یحییٰ بختیار نے دلائل دیئے تھے کہ آئین کی شق نمبر ۲۴۵ کے تحت سول انتظامیہ کی مدد کے لئے فوج طلب کرنے کی ہدایت موجود ہے لیکن فل بنچ نے ان کے سابقہ دلائل کی روشنی میں اپنے فیصلے میں لکھا کہ اٹارنی جنرل نے لفظ "مارشل لاء" استعمال کیا تھا جسے سول انتظامیہ کی مدد کے لئے نافذ کیا گیا اور جیسا کہ میں اوپر درج کر چکا ہوں مسٹر یحییٰ بختیار نے ہائی کورٹ میں مارشل لاء ہی کے حق میں دلائل دیئے تھے۔ فل بنچ کی جانب سے ان کے الفاظ پر گرفت غلط نہ تھی۔ یحییٰ بختیار نے فیصلہ سننے کے بعد اعلان کیا کہ وفاقی حکومت اس فیصلے کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل دائر کرے گی۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا لیکن سپریم کورٹ نے ان کی یہ درخواست مسترد کر دی کہ ہائی کورٹ کے فیصلے کے خلاف حکم امتناہی جاری کیا جائے۔ بروہی اور شریف الدین پیرزادہ عدالتی وکیل تھے۔ ۶ جون سماعت کی تاریخ دی گئی اور ۶ جون کو یحییٰ بختیار نے عدالت کے روبرو اپنے دلائل میں کہا کہ لاہور ہائی کورٹ کے فیصلے میں تضادات موجود ہیں اس روز راولپنڈی کے بار روم سے وکلاء نے مارشل لاء کے حق میں یحییٰ بختیار کے دلائل کے خلاف احتجاج کے طور پر ان کی تصویر اتار پھینکی اور پی۔ این۔ اے کی لیگل کمیٹی کے سیکرٹری چوہدری اسماعیل نے مطالبہ کیا کہ ہائی کورٹ کے فیصلے کے بعد حکومت کو کراچی اور حیدر آباد سے مارشل لاء اٹھالینا

چاہیے چنانچہ ۷ جون ۱۹۷۷ء کو پرائم منسٹر ہاؤس کی ایک پریس کانفرنس میں کراچی اور حیدر آباد سے جزوی مارشل لاء کے خاتمہ کا اعلان کیا گیا جس کے اٹھتے ہی ۱۲ ہزار ۹ سو قیدیوں نے اسی روز رہائی پائی وفاقی حکومت نے اس سلسلے میں اپنا حکم واپس لے لیا تھا لیکن طرفہ تماشہ دیکھئے کہ ۷ جون ہی کو یحییٰ بختیار سپریم کورٹ میں مارشل لاء کے حق میں دلائل دیتے ہوئے کہہ رہے تھے کہ ۔۔۔۔۔۔۔ "ہر قسم کے مقدمات کی سماعت پر سول عدالتوں کی اجارہ داری نہیں" (یہ عدلیہ کو جو آئین میں پانچویں ترمیم کے بعد ویسے ہی بھٹو حکومت سے نالاں تھی اور خصوصاً یحییٰ بختیار سے خار کھائے بیٹھی تھی مزید ناراض کرنے کی کوشش تھی اس کا نتیجہ بعدازاں نہ صرف مارشل لاء کے نفاذ کو قانونی اور آئینی جواز فراہم کرنے کی صورت میں نکلا بلکہ جب احمد رضا قصوری کے والد کے قتل کے الزام میں مسٹر بھٹو کے خلاف مقدمہ زیر سماعت تھا اور یحییٰ بختیار ہی ان کے وکلاء کے پینل کے سربراہ کی حیثیت سے پیش ہوئے تھے تو عرصہ اقتدار کا ان کا یہ کردار یقیناً جج صاحبان کی آنکھوں کے سامنے پھر تا رہتا ہو گا) یحییٰ بختیار نے سات ججوں پر مشتمل سپریم کورٹ کے فل بنچ کے سامنے مزید دلائل دیتے ہوئے کہا کہ "سویلین افراد پر فوجی عدالتوں میں بھی مقدمات چلائے جا سکتے ہیں۔ موجودہ مارشل لاء ملک میں امن و امان برقرار رکھنے کے لئے لگایا گیا ہے تاکہ طاقت کو طاقت کے ذریعے ختم کیا جا سکے اور فوجی کارروائیاں قانون کے عین مطابق ہیں"۔

یہ دلائل تھے جو ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کی رات مارشل لاء کے نفاذ کے بعد جرنیلوں کے کام آئے اور گویا ان کے عزائم کی تکمیل کے لئے آئینی راستے بھی خود ہماری حکومت کے اناڑی جنرل فراہم کر رہے تھے۔

مارشل لاء کے خلاف سندھ ہائی کورٹ میں بھی اپیل دائر کی گئی تھی جس کا فیصلہ بھی وہی تھا جو لاہور ہائی کورٹ دے چکی تھی لیکن ۹ جون کو جب سپریم کورٹ میں پھر سماعت ہوئی تو یحییٰ بختیار نے اعلان کیا کہ سندھ ہائی کورٹ کے فیصلے کے خلاف بھی سپریم کورٹ میں اپیل دائر کی جائے گی۔ سندھ ہائی کورٹ نے اپنے فیصلے میں لکھا تھا کہ فوج سول انتظامیہ کی مدد نہیں کر رہی بلکہ یہ صریحاً مارشل لاء کا نفاذ ہے جس کی آئین میں قطعاً گنجائش نہیں سپریم کورٹ کے چیف جسٹس مسٹر یعقوب علی خان نے جب یحییٰ بختیار سے پوچھا کہ ملک سے مارشل لاء اٹھانے کے بعد اب حکومتی فریق کی پوزیشن کیا ہے؟ تو یحییٰ بختیار نے جواب دیا کہ سماعت جاری رکھنا پڑے گی کیونکہ آئین کی شق نمبر ۲۴۵ کے تحت مسلح افواج کی کارروائی کی تشریح ضروری ہے۔ اگر مذاکرات ناکام ہوئے اور ایجی ٹیشن شروع ہو گیا تو مسلح افواج کو اپنا کردار موثر طور پر ادا کرنا ہو گا۔ موجودہ صورت حال انتہائی غیر تسلی بخش ہے، اس لئے سپریم کورٹ کا فیصلہ ضروری ہے۔

ملاحظہ فرمایئے کہ اس سے زیادہ کھلی دعوت جرنیلوں کے لئے اور کیا ہو سکتی تھی؟ کہ ہم رات دن مذاکرات کی کامیابی کے لئے کوشاں تھے اور یحییٰ بختیار دو ہائی کورٹوں کی جانب سے مارشل لاء کا راستہ روکنے کی کوششوں کے سلسلے میں ان کے فیصلوں کو نہ صرف سبوتاژ کر رہے تھے بلکہ مذاکرات کی ناکامی اور

ملکی حالات کے انتہائی غیر تسلی بخش ہونے پر بھی مصر تھے۔ حالانکہ ۹ جون کو تیسری سماعت پر جب چیف جسٹس یعقوب علی خان نے حکومت کا موقف جزوی مارشل لاء ختم ہو جانے کے بعد دریافت کیا تو یہ بہترین موقع تھا کہ دو ہائی کورٹوں کا فیصلہ برقرار رہنے دیا جاتا اور مارشل لاء کے حق میں مزید دلائل نہ دیئے جاتے۔ بلکہ مناسب ہوتا کہ سندھ اور پنجاب ہائی کورٹ کے فیصلوں کو مناسب اہمیت اور تشہیر دی جاتی تاکہ جرنیلوں پر ایک اخلاقی اور قانونی دباؤ قائم رہتا اور ۵ جولائی کی رات آپریشن فیئر پلے کا فیصلہ کرنے میں انہیں آسانی نہ حاصل ہوتی۔ لاہور ہائی کورٹ کے فیصلے کے خلاف سپریم کورٹ نے سماعت ۴ جولائی تک ملتوی کی تھی لیکن جرنیل غالباً سپریم کورٹ کے فیصلے کا اندازہ کر چکے تھے اور اس سے پہلے سپریم کورٹ بھی مارشل لاء کے خلاف کوئی ویسا ہی فیصلہ دے دیتی جیسا کہ لاہور اور سندھ ہائی کورٹ نے دیا تھا جرنیلوں نے مناسب یہ سمجھا کہ "آپریشن فیئر پلے" کے حق میں اب تک یحییٰ بختیار جتنے دلائل دے چکے ہیں، انہی پر اکتفا کیا جائے۔ ۲۸ اپریل کو قومی اسمبلی میں تقریر کے دوران خود وزیر اعظم نے مارشل لاء کے حق میں جو دلائل دیئے ان میں پھر بھی بحث کے کچھ پہلو تھے اور ان کا انداز بھی سیاسی تھا لیکن یحییٰ بختیار نے تو اپنے قانونی دلائل کے ذریعے مارشل لاء کے نفاذ کے لئے آئینی جواز فراہم کر دیئے تھے جن سے اگر جرنیل استفادہ نہ کرتے تو یہ ان کی کم عقلی ہوتی۔

○ ...... ○ ...... ○ ...... ○

گیارھواں باب

مذاکرات کی طرف پیش رفت
اور
پاکستان قومی اتحاد کا مصالحتی فارمولا

۳۰ اپریل کو پی۔ این۔ اے نے راولپنڈی میں لانگ مارچ کا پروگرام بنایا تھا۔ جس کی قیادت پیر صاحب پگارا شریف کو کرنا تھی جو نظر بند رہنماؤں کی عدم موجودگی میں پی۔ این۔ اے کے سربراہ تھے۔ پورے ملک کی نگاہیں اس وقت راولپنڈی پر مرکوز تھیں۔ پاکستان بھر سے پی۔ این۔ اے کے کارکنوں کو راولپنڈی پہنچانے کے انتظامات کئے گئے تھے اور یہ لانگ مارچ پی۔ ایم ہاؤس تک طے پایا تھا۔ لیکن تماشہ اس کے برعکس ہوا اور قومی اتحاد کا لانگ مارچ تو شارٹ مارچ میں تبدیل ہو گیا اور اس کی جگہ اسی دوپہر راولپنڈی کی سڑکوں پر خود مسٹر بھٹو کا لانگ مارچ دیکھنے میں آیا۔ وہ ایک کھلی جیپ میں سوار ہو کر اچانک شہر میں نکل آئے اور انہیں اپنے درمیان دیکھتے ہی پیپلز پارٹی کے کارکنوں کے حوصلے بلند ہو گئے۔ صدر میں امریکن سنٹر کی عمارت کے سامنے وزیر اعظم نے عوام کے ہجوم سے خطاب کرتے ہوئے اپنے نام امریکی وزیر خارجہ سائرس وانس کا وہ خط بھی دکھایا جس میں انہوں نے یہ کہا تھا کہ ۲۸ اپریل کو قومی اسمبلی میں آپ کی تقریر سے ہمیں بے حد صدمہ ہوا ہے۔ کھلے بندوں الزامات عائد کرنے سے آپ کو پرہیز کرنا چاہئے تھا کیونکہ اس سے تعلقات کو صرف نقصان ہی پہنچ سکتا ہے۔ پی۔ این۔ اے کا لانگ مارچ بری طرح ناکام ہو گیا۔ اس کے اسباب میں جہاں انتظامیہ کا کردار شامل تھا وہاں پیر صاحب پگارا شریف کی ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل کے دو کمروں ۶۰۱ اور ۶۰۲ میں نظر بندی بھی تھی۔ ویسے بھی پیر صاحب جلسے جلوس کی سیاست کے آدمی نہیں ہیں۔ ۹ اپریل کو بھی قومی اتحاد کے ایک جلوس کی انہیں لاہور میں قیادت کرنا تھی لیکن اپنے منصب کے شایان شان نہ سمجھتے ہوئے انہوں نے وہاں بھی جلوس میں آنے سے گریز کیا تھا۔ ادھر جب ۳۰ اپریل کو لانگ مارچ کی قیادت ان کے سر ڈال دی گئی تو وہ شاید اس سے بھی گریزاں تھے۔ ان کا اپنا ایک خاص مزاج ہے جس سے ہٹ کر وہ کچھ بھی نہیں کرتے۔ ذاتی طور پر میرا خیال یہ ہے کہ وہ وزیر اعظم بھٹو کو بھی اتنی اہمیت نہ دیتے تھے کہ ان کے خلاف لانگ مارچ کرنے کے لئے پیدل سڑک پر نکل آتے۔ یہ ان کے منصب کے صریحاً خلاف عمل ہوتا۔ مجھے یاد ہے وہ مسٹر بھٹو سے شدید ترین نفرت کرتے تھے جس کی وجہ وزیر اعظم کا وہ فون تھا جو انہوں نے برسر اقتدار آنے کے فوراً بعد پیر صاحب کو کیا تھا۔ دراصل مسٹر بھٹو سندھ میں پیر صاحب کے روحانی اثر و نفوذ سے قدرے خائف تھے انہیں ہمیشہ سندھ میں

اپنا ایک ہی حریف اور مد مقابل نظر آیا جو پیر صاحب پگارا شریف تھے۔ اقتدار سنبھالنے کے فوراً بعد مسٹر بھٹو نے فون پر پیر صاحب کو خاصے درشت انداز میں دھمکی دی تھی کہ ”میرا نام ذوالفقار علی بھٹو ہے اور میں تمہیں دیکھ لوں گا۔“ لیکن جب ۳۰ اپریل ۱۹۷۷ء کو یہ طے پایا کہ پیر صاحب راولپنڈی میں قومی اتحاد کے لانگ مارچ کی قیادت کریں گے تو اچانک مسٹر بھٹو راولپنڈی کی سڑکوں پر نکل آئے اور پھر شہر اور کنٹونمنٹ کا دورہ کرنے کے بعد سیدھے ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل پہنچے جہاں پیر صاحب نظر بند تھے۔ انہوں نے پیر صاحب سے تقریباً پچاس منٹ تک بات چیت کی۔ مسٹر بھٹو نے اخباری نمائندوں سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ...... ”پیر پگارا کے خاندان سے ہمارے بہت پرانے مذہبی تعلقات ہیں“ اس لئے اگر انہیں قید بھی کرنا پڑا تو جیل انٹر کان سے کم نہیں ہوگی۔“ پیر صاحب پگارا لانگ مارچ کی ناکامی کے بعد اگلی صبح یکم مئی کو نہایت عزت و احترام کے ساتھ اپنے گھر پہنچا دیئے گئے۔

جمعرات ۲۸ اپریل ہی کو متحدہ عرب امارات کے وزیر خارجہ احمد خلیفہ السویدی حکومت اور اپوزیشن کے درمیان مصالحت کے مشن پر اسلام آباد پہنچے انہوں نے وزیر اعظم بھٹو کو شیخ زید بن سلطان النہیان کا ایک خصوصی پیغام بھی پہنچایا تھا۔ جس میں شیخ زید نے اپوزیشن کے ساتھ مصالحت کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے اس سلسلے میں اپنی خدمات پیش کی تھیں۔ وزیر خارجہ احمد خلیفہ اپنی آمد کے فوراً بعد وزیر اعظم سے ملے اور پھر سہالہ گئے جہاں قومی اتحاد کے نظر بند لیڈروں سے انہوں نے ملاقات کی سہالہ سے واپسی پر احمد خلیفہ السویدی کے ہمراہ سعودی عرب کے سفیر شیخ ریاض الخطیب نے بھی سہالہ کے نظر بندوں سے ملاقات کی تھی۔ اور ان دونوں حضرات کی مساعی کا مقصد صرف یہ تھا کہ قومی اتحاد کو حکومت سے براہ راست بات چیت پر آمادہ کیا جائے جس سے پی۔ این۔ اے کے رہنما نامعلوم وجوہ کے سبب گریزاں تھے۔ سہالہ ریسٹ ہاؤس میں اسی روز سردار سکندر حیات نے سردار قیوم سے ملاقات کی جس کا پس منظر یہ تھا کہ میں نے وزیر اعظم کو تجویز دی تھی کہ اپوزیشن رہنماؤں کی صفوں میں سردار عبدالقیوم کے محترم کردار کے سبب انہیں درمیان میں ڈالا جائے تاکہ وہ مفاہمت کے راستے تلاش کر سکیں۔ اب سردار سکندر حیات کو سردار قیوم سے ملاقات کے لئے اسی لئے بھیجا گیا تھا کہ وہ ان کا عندیہ معلوم کریں کہ وہ مصالحت کنندہ کا کردار ادا کریں گے یا نہیں۔ ادھر مفتی محمود نے حکومت سے بات چیت کا ایجنڈا تیار کرنے کے لئے قانونی ماہرین کو لاہور سے طلب کر لیا تھا۔ جو ۳۰ اپریل کو اگرچہ سہالہ نہ پہنچ سکے لیکن اس سے کچھ امید پیدا ہو چلی تھی کہ مفتی محمود مذاکرات کی طرف راغب ہو رہے ہیں۔ ۳۰ ہی کو پی۔ این۔ اے کے قائم مقام نائب صدر خان محمد اشرف اور جنرل سیکرٹری چوہدری رحمت الٰہی بھی گرفتار کر لئے گئے تھے اور توڑ پھوڑ کی بھی کئی وارداتیں ہوئیں۔ متحدہ عرب امارات کے وزیر خارجہ تو اگلی صبح وطن واپس روانہ ہو گئے، لیکن شیخ ریاض الخطیب معاملات سے ”ان ٹچ“ رہے۔ میں نے اپنی زندگی میں ان جیسا شخص بھی نہیں دیکھا وہ پاکستان کے لئے جس قدر درد اپنے دل میں رکھتے تھے، اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا کاش کہ خود پاکستانی اس کا

ایک پاسنگ بھی اپنے دل میں رکھتے ہوتے۔ ۲ مئی کو انہوں نے رات ساڑھے آٹھ بجے سہالہ میں پھر نظر بند لیڈروں سے ملاقات کی۔ اس ملاقات میں ترجمانی کے فرائض شاہ احمد نورانی نے ادا کئے تھے۔

مولانا مفتی محمود کے پیر کے انگوٹھے میں تکلیف تھی جس کے لئے انہیں سی۔ ایم ایچ پہنچا دیا گیا تھا۔ شیخ ریاض الخطیب نے ان سے سی۔ ایم ایچ جا کر ملاقات کی اور وزیر اعظم بھٹو کا ایک ذاتی خط بھی انہیں دیا جس میں وزیر اعظم نے مذاکرات کی پیش کش کرتے ہوئے اس امر کی یقین دہانی کرائی تھی کہ جو بھی معاہدہ حکومت اور پی۔ این۔ اے کے درمیان طے پائے گا وہ اس پر قائم رہیں گے اور سعودی عرب کے علاوہ دوسرے دوست ممالک جو ثالثی کے خواہاں ہیں اس معاہدے کے گواہ ہوں گے۔ مفتی صاحب کی خواہش پر ہسپتال ہی میں پیر پگارا' نواب زادہ نصر اللہ خان اور پروفیسر غفور کی ملاقات بھی ان سے کرائی گئی۔ جس میں مسٹر بھٹو کے خط کے مندرجات زیر غور آئے۔

سعودی سفیر ۳ مئی کو سی۔ ایم۔ ایچ میں پھر مفتی محمود سے ملنے گئے اور مسٹر بھٹو کی پیشکش کا جواب چاہا جس کے جواب میں مفتی محمود نے کہا کہ قومی اتحاد کی تجاویز آج مسٹر بھٹو کو پیش کر دی جائیں گی۔ مفتی محمود کو تفصیلی غور و خوض اور دوسرے رہنماؤں سے ملاقات کے لئے پھر سہالہ پہنچا دیا گیا۔ اسی شام لیبیا کے وزیر خارجہ علی طریقی بھی اسلام آباد پہنچے اور انہوں نے کرنل قذافی کی پیشکش سے مسٹر بھٹو کو آگاہ کیا کہ اگر وہ پسند کریں تو اس سلسلے میں کرنل قذافی مصالحت کنندہ کا کردار ادا کرنے کو تیار ہیں۔
حقیقتاً پورا عالم اسلام پاکستان کے اس اندرونی خلفشار سے پریشان تھا اور جس طرح وزیر اعظم بھٹو کے عہد حکومت میں اسلامی ممالک سے قریبی رشتے استوار ہوئے تھے' ان کے پیش نظر ان ممالک کی تشویش بجا تھی کیونکہ وہ امریکہ کو پیدا شدہ حالات اور بحران سے فائدہ اٹھانے کی پوزیشن میں دیکھ رہے تھے۔

۳ مئی ہی کو پی۔ این۔ اے نے سردار سکندر حیات کو قومی اتحاد کا قائم مقام نائب صدر اور محمود علی قصوری کو جنرل سیکرٹری مقرر کر دیا۔ جبکہ سندھ خصوصی ٹریبونل نے ڈی۔ پی۔ آر کے تحت گرفتار سردار شیر باز مزاری' مولانا شاہ احمد نورانی' شاہ فرید الحق' مشیر پیش امام' میاں محمد شوکت' ظہور الحسن بھوپالی' نواب مظفر حسین' دوست محمد فیضی اور زرین خان کو عدالت میں پیش کرنے کا حکم دیا۔ چوہدری ظہور الٰہی اور جے۔ اے۔ رحیم کی حراست کے خلاف درخواست کی سماعت ۱۷ مئی تک ملتوی کر دی گئی۔ مصطفیٰ کھر کے دو بھائیوں ملک میلاد کھر اور ملک غازی کھر کی درخواست ضمانت بھی مسترد کر دی گئی تھی۔ واضح رہے کہ مصطفیٰ کھر اس وقت مسلم لیگ کے سینئر نائب صدر تھے۔

۴ مئی بدھ کو لیبیا کے وزیر خارجہ علی عبدالسلام الطریقی نے وزیر اعظم بھٹو اور مفتی محمود سے پھر ملاقاتیں کیں اور انہیں صدر قذافی کی اس خواہش سے آگاہ کیا کہ وہ پاکستان میں امن و امان دیکھنا چاہتے ہیں تاکہ بیرونی طاقتیں اندرونی گڑبڑ سے فائدہ نہ اٹھا سکیں۔ وہ اسی روز وطن واپس روانہ ہو گئے۔ ادھر سی۔ ایم۔ ایچ میں شیخ ریاض الخطیب نے بھی مفتی محمود سے ملاقات کی جس کے بعد مفتی صاحب کو سہالہ لے

جایا گیا جہاں دیگر رہنماؤں کے علاوہ پیر پگارا بھی موجود تھے۔ یہاں میں یہ بتاتا چلوں کہ ۳ مئی کی رات مسٹر بھٹو اور مفتی محمود کے درمیان ایک خفیہ ملاقات پرائم منسٹر ہاؤس میں بھی ہوئی تھی۔

یہ خاص ملاقات کئی گھنٹے تک جاری رہی تھی اور اس میں وزیر اعظم نے مفتی محمود کو مذاکرات کے سلسلہ میں خلوص نیت کا یقین دلانے کی بھرپور کوشش کی تھی اور یہ بھی باور کرایا تھا کہ بیرون ملک سے دوست ان کے ایماء پر آ رہے ہیں۔ پی۔ این۔ اے کو "پریشرائز" کرنے کی کوشش نہیں کر رہے بلکہ اپنے طور پر مصالحت کرانے کے خواہاں ہیں۔ مسٹر بھٹو نے مفتی صاحب پر واضح کر دیا تھا کہ اگر کل کو وہ خود بھی برسر اقتدار آ گئے تو آج اگر انہوں نے دوست ممالک کے ساتھ تلخی پیدا کر لی۔ تو یہ مستقبل میں خود ان کے لئے مشکلات کا باعث ثابت ہوگی۔

اس ملاقات کے اگلے روز قومی اتحاد نے وزیر اعظم کو اپنے مطالبات پر مشتمل ۱۵ صفحات کا ایک مسودہ پیش کر دیا جسے قومی اتحاد کے قانونی ماہرین کے ایک گیارہ رکنی پینل نے ڈرافٹ کیا تھا۔ اس پینل میں محمود علی قصوری' ایس ایم ظفر' بیرسٹر ظہور الحق' خالد اسحٰق' عامر رضا خان' ایم انور بار ایٹ لاء' مرزا عبدالغفور بیگ' نسیم فاروقی' سید احمد یوسف' رانا عبدالرحیم اور اسماعیل چوہدری شامل تھے۔
یہ وہی مطالبات تھے جو مذاکرات کے دوران پی۔ این۔ اے نے اپنے اولین مسودے میں پیش کئے تھے۔ مذاکرات میں پیش ہونے والے اس مسودے کا مکمل متن قارئین کی نذر ہے تاکہ اس ذہنی فضا کی کچھ نقشہ کشی ہو سکے جو اس وقت پی۔ این۔ اے کے حلقوں میں پائی جاتی تھی۔

پاکستان قومی اتحاد کی طرف سے پیش کردہ پہلا مسودہ

ہرگاہ کہ پاکستان قومی اتحاد نے یہ دعویٰ کیا کہ مارچ ۱۹۷۷ء میں ہونے والے انتخابات میں حکومت اور انتظامیہ نے وسیع پیمانے پر دھاندلی کی اور اس طرح عوام کے ارادے کو ناکام کر دیا اور انتخابی عمل کو ایک فراڈ بنا دیا۔

اور ہرگاہ کہ پاکستان پیپلز پارٹی نے دعویٰ کیا کہ پاکستان قومی اتحاد نے انتخابات میں جس پیمانے پر دھاندلی ہونے کا الزام لگایا ہے اس پیمانے پر دھاندلی نہیں ہوئی اور اس نے (پیپلز پارٹی نے) دونوں کی اکثریت حاصل کی۔

اور ہرگاہ کہ نتیجتاً ملک میں ملک گیر سطح پر ایسی احتجاجی تحریک شروع ہوئی جس کی مثال نہیں ملتی۔ اس تحریک کے نتیجہ میں مارشل لاء نافذ ہوا لیکن اس اقدام سے بھی ملک میں پیدا شدہ سیاسی مسائل کو حل کرنے یا ان پر قابو پانے میں مدد نہ ملی۔

اور ہرگاہ کہ برادر اسلامی ملکوں خصوصاً سعودی عرب' کویت' لیبیا اور متحدہ عرب امارات نے تنازعات ختم کرنے اور معاہدہ پر عمل درآمد کرانے کی یقین دہانی کرانے کی پیشکش کی' ان کی مخلصانہ مساعی کے نتیجہ میں پاکستان پیپلز پارٹی کے نمائندوں اور پاکستان قومی اتحاد کے مابین موجودہ سیاسی بحران کو حل

کرنے، آزادانہ منصفانہ اور صحیح انتخابات کرانے کی ضمانت فراہم کرنے اور بدعنوانیوں کی روک تھام اور انتخابات کے لئے ضروری مناسب ماحول اور باہمی اعتماد کی فضا پیدا کرنے اور طاقت کے غلط استعمال کو روکنے کے لئے مذاکرات ہوئے اور اب فریقین مندرجہ ذیل معاہدہ پر متفق ہوگئے ہیں۔

۱ - اسمبلیوں کو توڑنا

قومی اسمبلی اور چاروں صوبائی اسمبلیاں ۷ جولائی ۱۹۷۷ء کو ختم ہوجائیں گی اور صوبائی وزراء اعلیٰ اور صوبائی وزراء اس تاریخ سے اپنے عہدوں پر رہیں گے۔

۲ - نئے انتخابات

قومی اسمبلی کے انتخابات ۶ اکتوبر ۱۹۷۷ء کو صوبائی اسمبلیوں کے ۱۰ اکتوبر ۱۹۷۷ء کو ہوں گے۔

۳ - سینٹ

۱۹۷۷ء کے انتخابات کے بعد قائم ہونے والی قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلیوں نے سینٹ کے جو ارکان منتخب کئے ہیں وہ اس تاریخ کے بعد سینٹ کے ممبر نہیں رہیں گے اور یہ خالی نشستیں آئین کی دفعہ ۵۹ میں بتائے گئے طریق کار کے مطابق وہ نئی قومی اور صوبائی اسمبلیاں پر کریں گی۔ جو سمجھوتہ کے تحت ہونے والے انتخابات کے نتیجہ میں معرضِ وجود میں آئیں گی۔ سینٹ کے جو ارکان اگست ۱۹۷۷ء میں ریٹائر ہوں گے وہ اور ایڈیشنل سینیٹر اس وقت تک ممبر رہیں گے جب تک نئی قومی اور صوبائی اسمبلیاں ان کی جگہ نئے ممبر منتخب نہ کردیں۔

۴ - سپریم عمل درآمد کونسل

سمجھوتہ پر عمل درآمد اس کی پوری وفاداری کے ساتھ مکمل پابندی کے مقاصد کے حصول کے لئے ایک سپریم عمل درآمد کونسل قائم کی جائے گی۔ (جسے بعد ازاں کونسل کہا جائے گا۔)

۵ - یہ کونسل

(۱) وہ فرائض ادا کرے گی اور ان اختیارات سے بہرہ ور ہوگی جس کا تعین سمجھوتہ اور اس کے شیڈول الف میں کیا گیا
(۲) سمجھوتہ کے مطابق انتخابات کے بعد نئی صوبائی حکومتیں قائم ہونے تک صوبائی گورنروں اور

صوبائی حکومتوں سے متعلق صدر اور وفاقی حکومت کے اختیارات کو بروئے کار لائے گی۔
(۳) قبائلی علاقوں سے متعلق صدر اور صوبوں کے گورنروں کے اختیارات کونسل کی ہدایت کے تحت استعمال ہوں گے۔
(۴) آزاد جموں و کشمیر سے متعلق صدر پاکستان اور وفاقی حکومت کے اختیارات کونسل کی ہدایات کے تحت استعمال ہوں گے۔

۶ - صوبائی حکومتیں

صوبائی اسمبلیاں ختم ہونے کے بعد صوبوں کے انتظامیہ اور قانون سازی کے اختیارات و کونسل کی ہدایات اور کنٹرول کے تحت صوبوں کے نئے گورنروں کو حاصل ہوں گے جو اس سمجھوتہ کے فریقین کی باہمی رضامندی سے مقرر ہوں گے اور وہ آئین پاکستان کے تحت صوبائی گورنر کو جو اختیارات حاصل ہیں ان کو بروئے کار لائیں گے۔

ایکٹ، آرڈی ننس ریگولیشنز اور آرڈر

قانون ساز ادارے کوئی قانون نہیں بنائیں گے اور صدر یا صوبہ کے گورنر اس وقت تک کوئی آرڈی ننس، ریگولیشن یا آرڈر نافذ نہیں کریں گے جب تک اس سلسلہ میں کونسل کی پیشگی منظوری حاصل نہ کرلی جائے۔

۷ - کلیدی تقرریاں

(۱) کونسل کو تمام کلیدی آسامیوں پر نئی تقرریاں کرنے یا ان پر نظر ثانی کرنے کا اختیار حاصل ہوگا۔ ان آسامیوں میں وفاقی اور صوبائی وزراء اور ڈویژنوں کے سیکرٹری و تمام شعبوں کے سربراہ شامل ہیں۔ بشمول قانون نافذ کرنے والے اور سیکورٹی و تفتیش کرنے والے اداروں کے سربراہوں، ڈویژنل کمشنروں، ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس، ڈپٹی کمشنروں اور پولیس سپرنٹنڈنٹوں کے مذکورہ بالا عہدوں پر تقرریاں اور تبدیلیاں کونسل کے کنٹرول میں ہوں گی۔
(۲) وفاقی حکومت صوبائی حکومت کے کسی عہدیدار کو کوئی تحریری یا زبانی حکم نہیں دے گی۔ تاکہ صوبائی انتظامیہ کی غیر جانبداری قائم رہ سکے۔

۸ - بلوچستان

بلوچستان میں متعین مسلح افواج معاہدہ کے بعد پندرہ دن کے اندر اندر زمانۂ امن کی چھاؤنیوں میں بلالی جائیں گی اور عوام کا اعتماد بحال کرنے اور ایسی فضا پیدا کرنے کے لئے فوری اقدامات کئے جائیں گے کہ

لوگ انتخابات میں حصہ لینے کے لئے اپنے گھروں میں واپس آ سکیں۔ بلوچستان میں جن افراد کو گھربار چھوڑنا پڑا تھا یا جو زخمی ہوئے تھے ان کی اور ان کے اہل خانہ کی بحالی کے لئے مناسب مالی اور انتظامی اقدامات کئے جائیں گے۔

فروری ۱۹۷۳ء کے بعد حکومتی اقدامات کے نتیجہ میں جن لوگوں کی زندگیاں ضائع ہوئیں ان کے کنبوں کو مناسب امداد دی جائے گی۔ اس سمجھوتہ کے نتیجہ میں بیرون ملک یا پاکستان کے اندر جو شخص (یا اس کا کنبہ) اپنے گھر واپس آئے گا۔ اسے ہراساں کرنے اور ڈرانے دھمکانے سے احتراز کیا جائے گا اور نہ ہی ان میں سے کسی کے خلاف کسی قسم کے ارتکاب جرم میں مقدمہ چلایا جائے گا۔

۹ - آزاد جموں و کشمیر

آزاد جموں و کشمیر اسمبلی و کونسل ۷-۷-۷۷ کو توڑ دی جائے گی اور موجودہ صدر، وزیراعظم اور وزرا اپنے عہدوں پر برقرار نہیں رہیں گے اور آل جموں و کشمیر مسلم کانفرنس کی رضامندی سے نیا نگران صدر مقرر کیا جائے گا جس کو حکومت آزاد کشمیر کے صدر کے تمام اختیارات حاصل ہوں گے۔

آزاد جموں و کشمیر کے عبوری آئین کے ایکٹ ۷۴ء میں جو یکطرفہ ترمیمیں کی گئی ہیں وہ واپس لے لی جائیں گی اور ۷۷-۱۰-۱۵ کو آزاد کشمیر اسمبلی اور صدر آزاد کشمیر کے عہدہ کے لئے انتخابات ہوں گے۔ الیکشن کمیشن کا تقرر اور دوسرے انتظامات آل جموں و کشمیر مسلم کانفرنس کے مشورے سے کئے جائیں گے۔

۱۰ - آئینی ترمیمیں

پاکستان کے آئین میں جتنی ترمیمیں کی گئی ہیں جن سے آئین میں دئے گئے بنیادی حقوق پر اثر پڑا ہے جن سے عدالتوں کے اختیارات ختم یا محدود ہوئے ہیں اور اعلیٰ عدالتوں کے عدالتی اختیارات پر زد پڑی ہے (جیسا کہ شیڈول 'ب' میں بتایا گیا ہے) وہ اس معاہدہ کی رو سے فی الفور غیر مؤثر ہو جائیں گے۔

۱۱ - ہنگامی حالت کا خاتمہ

ہنگامی حالت فوراً ختم کر دی جائے گی۔ تمام بنیادی حقوق بحال ہو جائیں گے ان حقوق کو محدود معطل یا ختم نہیں کیا جا سکے گا۔ سمجھوتہ کی مدت کے دوران ہنگامی حالت از سر نو نافذ نہیں کی جائے گی سوائے کونسل کی پیشگی منظوری کے اور ان پابندیوں کے تحت جو کونسل نافذ کرے گی۔

۱۲ - ڈیفنس آف پاکستان آرڈی ننس کا خاتمہ

ڈیفنس آف پاکستان آرڈی ننس فی الفور واپس لے لیا جائے گا اور اس کے تحت جو ٹریبونل قائم ہیں وہ ختم ہو جائیں گے اس آرڈی ننس کے تحت جن لوگوں کو سزائیں ملی ہیں یا جن پر مقدمے چل رہے ہیں ان کو رہا کر دیا جائے گا اور ڈیفنس آف پاکستان آرڈی ننس اور ڈیفنس آف پاکستان رولز کے تحت جو

مقدمے چل رہے ہیں وہ واپس لے لئے جائیں گے۔

۱۳ - خصوصی عدالتیں

کسی بھی قانون کے تحت قائم ہونے والے ٹریبونل اور خصوصی عدالتیں فی الفور ختم ہو جائیں گی اور عدالتوں یا ٹریبونلوں سے سزایاب ہونے والے تمام افراد فوراً رہا کر دئے جائیں گے خواہ سزا کی میعاد باقی ہو جتنی سزا وہ بھگت چکے ہیں وہی ان کی قید تصور ہوگی۔ کسی بھی خاص عدالت یا ٹریبونل میں جو مقدمے زیر سماعت یا سماعت کی ضرورت ہوگی تو یہ مقدمات عام عدالتوں میں پیش کئے جائیں گے اور ان کی سماعت عام قوانین کے تحت ہوگی۔

۱۴ - آرمی ایکٹ ۱۹۵۲ء

ایکٹ ایکس ۱۹۷۷ء یا دوسرے قوانین کے ذریعے آرمی ایکٹ ۱۹۵۲ء میں جو ترمیمیں کی گئی ہیں فی الفور واپس ہو جائیں گی اور ان کے تحت جن لوگوں کو سزائیں مل چکی ہیں وہ رہا کر دیئے جائیں گے۔

۱۵ - قیدیوں اور نظر بندوں کی رہائی

حفاظتی امتناعی قوانین کے تحت جن لوگوں کو نظر بندی یا حراست میں رکھا گیا ہے یا جن کو قانون نافذ کرنے والے اداروں یا مسلح افواج نے حراست میں رکھا ہے جن پر مقدمے چل رہے ہیں یا جن کو انتخابات یا یکم جنوری ۱۹۷۲ء کے بعد سیاسی سرگرمیوں کے سلسلے میں ارتکاب جرم پر سزا دی ہے۔ ان کو فوراً رہا کر دیا جائے گا اور ان کے خلاف درج یا فیصلہ طلب مقدمات یا ان کی نقل و حرکت محدود کرنے سے متعلق تمام احکام واپس لے لئے جائیں گے۔ اگر ضروری ہوا تو حکام قانون اپیل کے مرحلہ میں بھی یہ کارروائی کریں گے سیاسی کارکنوں کے خلاف نئے مقدمات قائم نہیں کئے جائیں گے نہ ہی ایسے افراد کو گرفتار یا نظر بند کیا جائے گا۔

فریقین کے ارکان جو دونوں طرف سے برابر تعداد میں ہوں گے پر مشتمل ایک کمیٹی ان تمام معاملات و مقدمات کا جائزہ لے گی جو حکومت کے خیال میں اس پیراگراف کے ذیل میں نہیں آتے۔ اس سلسلے میں حکومت دو ہفتوں کے اندر ایسے افراد کی فہرست مہیا کرے گی۔

۱۶ - سزا یافتہ سیاسی کارکن

یکم جنوری ۱۹۷۲ء کے بعد جن سیاسی لیڈروں یا کارکنوں کو ان کی سیاسی سرگرمیوں کی بنا پر گرفتار کیا گیا ہے یا ان پر مقدمات چلائے گئے اور جن کو ٹریبونلوں یا عدالتوں نے سزائیں دیں۔ وہ فوراً رہا کر دیئے جائیں گے اور ان کو بری تصور کیا جائے گا اس سلسلے میں تمام مقدمات جو عدالتوں یا ٹریبونلوں میں فیصلہ طلب

پڑے ہیں یا تفتیش کرنے والے اداروں کے پاس ہیں وہ فوراً واپس ہو جائیں گے۔

۱۷ - ریلیف اور امداد

مارچ ۱۹۷۷ء کے انتخابات کے دوران یا اس کے بعد انتخابات کے عواقب کے نتیجہ میں جن لوگوں کی جانیں ضائع ہوئیں ان کے کنبوں کو مناسب امداد دی جائے گی۔ مذکورہ بالا حالات میں جو لوگ زخمی ہوئے یا جن کو نقصان پہنچا ان کو معقول مالی امداد دی جائے گی۔

۱۸ - جلا وطن

وہ تمام پاکستانی جن کو پاکستان سے جلاوطن کر دیا گیا ہے یا جن کو پاکستان واپس آنے کی اجازت نہیں ہے ان کو بلاخوف و خطر ملک میں واپس آنے کی آزادی ہوگی۔

جن لوگوں کو صوبوں میں گرفتار کیا گیا اور ان کو صوبوں سے باہر لے جایا گیا اور حراست میں رکھا گیا وہ واپس لائے جائیں گے اور رہا کر دیئے جائیں گے اور کونسل کو اس امر کی اطلاع دی جائے گی۔

۱۹ - انتخابات سے متعلق سرگرمیاں

انتخابات سے متعلق سرگرمیوں میں حصہ لینے پر کسی شخص کو گرفتار نہیں کیا جائے گا، حراست میں نہیں رکھا جائے گا اس پر مقدمہ نہیں چلایا جائے گا اور نہ ہی ہراساں کیا جائے گا۔

۲۰ - سیاسی سرگرمیوں پر پابندی

سیاسی سرگرمیوں کو محدود کرنے کے لئے دفعہ ۱۴۴ یا کسی اور قانون کے تحت کوئی کارروائی نہیں کی جائے گی اور نہ ہی لاؤڈ سپیکر کا استعمال ممنوع قرار دیا جائے گا۔

۲۱ - پریس

آزادی صحافت پر عائد تمام پابندیاں ختم ہو جائیں گی۔ یکم جنوری ۱۹۷۲ء کے بعد جن اخباروں یا جرائد کے ڈیکلریشن منسوخ کئے گئے یا واپس لئے گئے وہ فوراً بحال ہو جائیں گے۔ نئے ڈیکلریشن حاصل کرنے کی آزادی ہوگی۔ جو پرنٹر، پبلشر اور صحافی سزایاب ہوئے ہیں یا حراست میں ہیں فوراً رہا کر دیئے جائیں گے۔ ضبط شدہ پریس اور جائیداد واپس کر دی جائے گی اور جرمانے کی رقوم واپس کر دی جائیں گی۔ نیوز پرنٹ کا کوٹہ اور حکومتی اور نیم حکومتی اداروں کے اشتہار دینے میں امتیازی پالیسی فوراً ختم کر دی جائے گی۔

۲۲ - سرکاری ذرائع ابلاغ

جو ذرائع ابلاغ سرکاری ملکیت یا کنٹرول میں ہیں وہ خبریں اور نظریات توازن اور غیر جانبداری کے ساتھ پیش کریں گے۔ پاکستان ٹیلیویژن پاکستان براڈ کاسٹنگ کارپوریشن اور نیشنل پریس ٹرسٹ کے اخبارات و جرائد پاکستان پیپلز پارٹی اور پاکستان قومی اتحاد کی خبروں کو یکساں طور پر پیش کریں گے اور یکساں جگہ یا وقت دیں گے۔ یہ ذرائع ابلاغ سیاسی جماعتوں اور کارکنوں کی کردار کشی نہیں کریں گے اور کونسل کے کنٹرول میں ہوں گے اور اس کی ہدایات کی پابندی کریں گے۔

۲۳ - ٹریڈ یونینز

تمام قانونی ٹریڈ یونین سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی کی جائے گی اور ان پر عائد پابندیاں ختم کر دی جائیں گی کسان اور مزدور لیڈر اور کارکن جو حراست میں ہیں فی الفور رہا کر دئے جائیں گے۔

۲۴ - الیکشن کمیشن

الیکشن کمیشن، کمیشن کے چیئرمین اور چار ایسے ارکان پر مشتمل ہو گا جو قومی اتحاد کے مشورے سے مقرر ہوں گے الیکشن کمیشن کو ایسے افسر اور اہلکار اور عدالتی افسر مقرر کرنے کا اختیار ہو گا جن کی تقرری فرائض کی بجا آوری کے لئے ضروری ہوگی۔ الیکشن کمیشن کو ایسے افراد کو سزا دینے کا اختیار ہو گا جو ڈسپلن کی خلاف ورزی کریں گے یا کسی بدعنوانی، غیر قانونی اقدام یا بے قاعدگی کے مرتکب ہوں گے۔

۲۵ - الیکشن کمیشن کا اختیار

الیکشن کمیشن کو معقول قانونی، مالی اور انتظامی اختیارات دئے جائیں گے اور اسے امتناعی یا لازمی اور ضبطی کے احکام جاری کرنے کا اختیار ہو گا۔ انتخابات منصفانہ آزادانہ اور صحیح طور پر کروانے کے لئے کمیشن کو افراد کی رہائی یا گرفتاری کے احکام معطل کرنے کے لئے ہائی کورٹ کے اختیارات حاصل ہوں گے شیڈول سی کے مطابق انتخابی قوانین میں فوراً ترمیمیں کی جائیں گی۔

۲۶ - مسلح افواج انتخابی کمیشن کی مدد کریں گی

عوامی نمائندگی کے قانون ۱۹۷۶ء میں آئین کی دفعہ ۲۴۵ کے حوالے سے مناسب ترمیمیں کی جائیں گی تاکہ کمیشن انتخابات کروانے کے لئے پاکستان کی مسلح افواج سے امداد و عملہ حاصل کر سکے اور فیڈرل سیکورٹی فورس، رینجرز اور پولیس کو انتخابات کے سلسلے میں کوئی سا فریضہ سونپ سکے۔

۲۷ - انتخابات کے نتائج

الیکشن کے نتائج کا اعلان الیکشن کمیشن کرے گا اور عوامی ذرائع ابلاغ بشمول ریڈیو ٹیلی ویژن اور نیشنل پریس ٹرسٹ کے اخبارات انتخابات کے نتائج کے بارے میں الیکشن کمیشن کے تحریری اقتدار کے بغیر کوئی اطلاع جاری نہیں کریں گے۔

۲۸ - انتخابی عذرداریاں

مارچ ۱۹۷۷ء کے انتخابات کے سلسلہ میں دائر شدہ تمام انتخابی عذرداریاں ختم تصور ہوں گی مذکورہ بالا انتخابات کے سلسلے میں جس امیدوار نے انتخابی اخراجات کا گوشوارہ داخل نہیں کیا اسے کوئی سزا نہیں دی جائے گی۔

۲۹ - پاکستان قومی اتحاد کونسل کو ان وفاقی اور صوبائی افسروں کی ایک فہرست پیش کرے گا جنھوں نے اس کے خیال میں ۷ جنوری ۱۹۷۷ء کے بعد بدعنوانیاں کیں اور وحشیانہ مظالم ڈھائے۔ کونسل ان افراد کے خلاف الزامات کی تحقیقات کرائے گی اور الزامات ثابت ہونے کی صورت میں مناسب انضباطی یا قانونی کارروائی کی جائے گی۔

۳۰ - (۱) یکم جنوری ۱۹۷۷ء کے بعد اسلحہ کے جتنے لائسنس جاری کئے گئے ہیں وہ معطل کئے جائیں گے اور ان لائسنسوں کے تحت جاری ہونے والا اسلحہ قریبی فوجی اسلحہ خانہ میں جمع کرایا جائے گا۔

(۲) یکم جنوری ۱۹۷۷ء کے بعد ممنوعہ بور کے اسلحہ کے جتنے لائسنس جاری کئے گئے ہیں ان کی تفصیل اور لائسنس ہولڈروں کے کوائف اسلحہ کی تفصیل اور لائسنس جاری کرنے والے حکام کی فہرست سمجھوتہ پر دستخط ہونے کے بعد ایک ہفتہ میں کونسل کو پیش کی جائے گی اور کونسل اس پر مناسب کارروائی کرے گی۔

۳۱ - جرائم کے مرتکب افراد کے خلاف کارروائی

الیکشن کمیشن نے مارچ ۱۹۷۷ء کے دوران جن امیدواروں، افسروں، اور دیگر افراد کے خلاف تحقیقات کیں اور بظاہر معلوم ہوا کہ انہوں نے اپنے اختیارات کا ناجائز استعمال کیا انتخابی قانون کی خلاف ورزی کی منصفانہ انتخابات کے عمل میں رکاوٹ پیدا کی یا دیگر جرائم کا ارتکاب کیا ان کے خلاف فی الفور مقدمے چلائے جائیں گے۔

۳۲ - ایف ایس ایف کا کنٹرول

فیڈرل سیکورٹی فورس آرمی جنرل ہیڈ کوارٹر کی کمان اور کنٹرول میں دے دی جائے گی۔

۳۳ - مشکلات کا ازالہ

جونہی کونسل کو محسوس ہو گا کہ اس معاہدہ پر عمل در آمد میں مشکلات حائل ہیں تو وہ صدر کو ایسے آرڈیننس آرڈر کا مسودہ بھیجے گی جس سے اس کے خیال میں یہ مشکلات دور ہو سکیں، صدر مسودہ ملتے ہی اس پر دستخط کر کے اس کو نافذ کر دیں گے اور اگر انہوں نے ۲۴ گھنٹوں میں ایسا نہ کیا تو یہ تصور کیا جائے گا کہ انہوں نے دستخط کر دیئے ہیں اور وہ قانون پاکستان کا حصہ بن جائے گا۔

۳۴ - صورت حال کو جوں کا توں برقرار رکھنا۔

(۱) سمجھوتہ پر دستخط ہونے کے بعد اور اس کے بعد انتخابات مکمل ہونے تک وزیر اعظم اور ان کی حکومت پالیسی پر مبنی کوئی ایسا فیصلہ نہیں کرے گی جس سے ملک کے مالیات اور جائیداد پر اثر پڑے اور اگر کسی وجہ سے ایسا فیصلہ ناگزیر ہو جائے تو وہ کونسل کی رضامندی سے کیا جائے گا۔

(۲) سمجھوتہ پر دستخط ہونے کے بعد انتخابات ہونے تک وفاقی اور صوبائی حکومتیں پاکستان میں کسی سیاسی جماعت یا تنظیم پر پابندی عائد کرنے کے لئے کوئی اقدام نہیں کریں گی۔

(۳) اگلے عام انتخابات تک آئین میں کوئی ترمیم نہیں کی جائے گی سوائے ان ترامیم کے جو اس سمجھوتہ پر عمل در آمد کے سلسلے میں ضروری ہوں گی۔

۳۵ - عمل در آمد

(۱) سمجھوتہ کی شق ۲، ۳، ۴، ۵، ۶، ۱۰، ۱۱، ۲۵، ۲۶ اور ۲۷ پر عمل در آمد کے لئے عارضی ترامیم کی ضرورت ہوگی اور ان ترامیم کا اہتمام پاکستان پیپلز پارٹی اور اس کے چیئرمین کی ذمہ داری ہوگی اس سمجھوتہ پر فوری عمل در آمد کے لئے قانون سازی اور ترامیم کا اہتمام اور ہدایات اور نوٹیفیکیشن کا اجرا جلد از جلد ہو گا۔

(۲) وفاقی اور صوبائی حکومتیں سمجھوتے پر عمل در آمد کے سلسلے میں ضروری اقدام کریں گی اور کوئی ایسا اقدام نہیں کریں گی اور نہ اس کی اجازت دیں گی جس سے معاہدہ پر عمل در آمد میں رکاوٹ پیدا ہو۔

شیڈول الف

سپریم عمل در آمد کونسل

(۱) ماسوائے اس امر کے جو آئین کے منافی ہو پاکستان پیپلز پارٹی اور پاکستان قومی اتحاد کے

درمیان طے پانے والے سمجھوتے پر پوری طرح عمل در آمد کے لئے ایک سپریم عمل در آمد کونسل قائم کی جائے گی (جسے بعدازاں کونسل کہا جائے گا)

(۲) کونسل کی ہیئت ترکیبی یہ ہوگی۔

(i) پاکستان پیپلز پارٹی پانچ ارکان نامزد کرے گی۔

(ii) پاکستان قومی اتحاد پانچ ارکان نامزد کرے گا۔

(۳) کونسل کو مکمل اختیار ہو گا کہ اس کا کوئی رکن کوئی حوالہ پیش کرے یا یہ خود تحریک کرے یا کوئی شکایت موصول ہو تو یہ مسئلہ پر جس کا تعلق سمجھوتہ پر عمل در آمد یا کسی خلاف ورزی سے ہو غور کر کے فیصلہ صادر کرے۔

(۴) کونسل کے فیصلے متفقہ ہوں گے اختلاف کی صورت میں مسئلہ خود بخود سپریم کورٹ کو چلا جائے گا۔

(۵) متعلقہ مسئلہ سپریم کورٹ کے تین سب سے سینئر ججوں کے سامنے پیش ہو گا اور وہ عمل در آمد کونسل کے تمام ارکان کو نوٹس جاری کر کے اور بند کمرے میں کونسل کے ساتھ یا حاضر ارکان کی موجودگی میں مسئلہ پر غور کر کے ۷۲ گھنٹوں کے اندر اکثریت رائے سے فیصلہ صادر کریں گے۔ سپریم کورٹ کا یہ فیصلہ کونسل کا فیصلہ متصور ہو گا۔

(۶) کونسل حسب ضرورت اجلاس کرے گی لیکن ہفتے میں ایک اجلاس لازمی ہو گا جو ہفتہ کے پہلے یوم کار کو ہو گا اور اس وقت تک جاری رہے گا جب تک درپیش کام نپٹ نہ جائے۔

(۷) کونسل کے اجلاس کے لئے کورم سات (۷) کا ہو گا اور اگر کورم نہ ہونے کی صورت میں اجلاس نہ ہو رہا ہو تو یہ سمجھا جائے گا کہ مسئلہ سپریم کورٹ کے پاس چلا گیا ہے اور اس کا فیصلہ سپریم کورٹ مذکورہ بالا طریق پر کرے گا۔

(۸) وفاقی اور صوبائی حکومتیں کونسل کے فیصلوں پر فوراً عمل کریں گی اور اس فیصلہ کی پابندی ان تمام آئینی اور انتظامی حکام پر لازمی ہوگی جو وفاق یا صوبوں کے سلسلہ میں کسی قسم کے فرائض ادا کر رہے ہوں گے بشمول مسلح افواج، حکومتی کارپوریشنوں سرکاری ذرائع ابلاغ کے اور متعلقہ افراد، حکام اور اہلکاروں کا فرض ہو گا کہ وہ کونسل کے فیصلوں اور ہدایات پر عمل کریں۔

(۹) کونسل کو اپنے طریق کار کے متعلق ضوابط بنانے اپنی کارروائی کو منضبط کرنے اور کمیٹیاں تشکیل کرنے کا اختیار ہو گا۔

(۱۰) وفاقی حکومت وہ تمام سہولتیں فراہم کرے گی جو کونسل اور اس کے ارکان کے خیال میں ضروری ہوں گی اور مصارف وفاقی فنڈ سے پورے ہوں گے۔

مذکورہ بالا کو آئین پاکستان میں عارضی ترمیم کے طور پر بطور دفعہ ۲۵۴ الف شامل کیا جائیگا وزیر اعظم کے انتخاب کے بعد یہ حصہ آئین کا حصہ نہیں رہے گا۔

○ ○

شیڈول 'ب'

ترمیم نمبر	شق	ترمیم شدہ دفعہ
۱	۳	۸
۱	۵	۶۱
۱	۷	۱۲۷
۱	۸	۱۹۳
۱	۹	۱۹۹
۱	۱۰	۲۰۰
۱	۱۲	۲۱۲
۳	۲	۱۰
۳	۳	۲۳۲
۳	۴	۵۴
۳	۸	۱۹۹
۵	۲	۱۰۱
۵	۵	۱۷۹
۵	۶	۱۸۰
۵	۷	۱۸۷
۵	۹	۱۹۵
۵	۱۰	۱۹۶
۵	۱۱	۱۹۹
۵	۱۳	۲۰۰
۵	۱۴	۲۰۶
۵	۱۷	۲۸۰
۶	۲	۱۷۹
۶	۳	۱۹۵
۷	۲	۹۶-الف
۷	۳	۱۰۱
۷	۴	۲۳۵

انتخابی قوانین میں کی جانے والی ترامیم

۱...... دفعہ ۲۱۸ کی شق (۲) کی ذیلی شق (ب) میں لفظ "دو" کو "چار" سے بدلنے کے لئے ترمیم کی جانی چاہئے

۲...... دفعہ ۲۲۱ میں یہ شامل کیا جائے گا کہ کمیشن کو پاکستان کے تمام ملازمین کی خدمات حاصل کرنے کا اختیار حاصل ہو گا اور عوامی نمائندگی کے ایکٹ مجریہ ۱۹۷۶ء میں مناسب ترمیم کے ذریعے یہ شامل کیا جائے گا کہ۔

> پاکستان کے ملازمین میں یونیورسٹیوں' بلدیات' سرکاری کارپوریشنوں' نیم خود مختار کارپوریشنوں' حکومت کے زیر انتظام اداروں اور صنعتوں اور مسلح افواج کے ملازمین شامل ہیں۔

۳...... عوامی نمائندگی کے ایکٹ کے باب ۵ میں اس مفہوم کا حاصل ذیلی باب (۳) شامل کرنے کے لئے ترمیم کی جائے گی کہ کمیشن کو ذیلی باب (۲) کے تحت فرائض کی ادائیگی اگر کسی شخص کی ضرورت ہو گی تو وہ شخص فوری طور پر کمیشن کی ہدایات کا پابند ہو گا۔ جسے ان اشخاص کے سلسلہ میں تمام انضباطی اقدامات کرنے کا مکمل اختیار ہو گا جن میں انضباطی کارروائی' عہدہ میں کمی یا ملازمت سے برخواستگی' اور اگر وہ کمیشن کے خیال میں کمیشن کے احکام اور ہدایات کی پابندی کرنے میں ناکام رہے ہیں یا وہ انتخابات سے متعلق اپنے فرائض کے سلسلہ میں بدعنوانی یا حکم عدولی کے مرتکب پائے گئے ہیں تو ان افراد کو ان افراد کے اپنے محکموں کی شرائط ملازمت سے قطع نظر انہیں سزا دینے کا اختیار ہو گا اور وہ صرف مکمل الیکشن کمیشن کے روبرو ہی اپیل کر سکیں گے۔

۴...... عوامی نمائندگی کے ایکٹ میں الیکشن کمیشن کو یہ اختیار دینے کے لئے باب ۶۴۔ اے شامل کیا جائے گا کہ کمیشن کو پریذائیڈنگ یا ریٹرننگ آفیسر...... جیسی بھی صورت ہو...... کی دونوں کی گنتی کے خلاف اپیل کی سماعت کا حق ہو گا اور آئین کی دفعہ ۲۲۵ میں موزوں ترمیم کی جائے گی۔

۵...... الیکشن کمیشن کی طرف سے وفاقی و صوبائی حکومتوں کے تمام انتظامی اداروں اور حکومت پاکستان' حکومت کے زیر انتظام اداروں اور کارپوریشنوں کے زیر ملازمت اشخاص کے بارے میں استحقاقی یا امتناعی احکامات جاری کرنے کے اختیارات دینے کے لئے عوامی نمائندگی کے ایکٹ میں نیا ذیلی باب ۱۰۳ شامل کیا جائے گا۔

۶...... یہ بھی تجویز کیا جاتا ہے کہ کمیشن کو یہ اختیار دینے کے لئے کہ وہ یہ امر یقینی بنا سکے کہ پاکستان ٹی وی' پاکستان براڈ کاسٹنگ کارپوریشن اور نیشنل پریس ٹرسٹ کے اخبارات اپوزیشن کے ساتھ خبروں اور خیالات کی تشہیر کے معاملہ میں مساویانہ اور غیر جانبدارانہ سلوک کر رہے ہیں۔ باب ۱۰۳ کے ساتھ ایک ذیلی باب کا اضافہ کیا جا سکتا ہے۔

۷...... مزید تجویز کیا جاتا ہے کہ الیکشن کمیشن کو کسی حقیقی امیدوار یا اس کے کارکنوں کے تحفظ کے لئے ان کی ضمانت اور استحقاقی و امتناعی احکامات جاری کرنے کے سلسلہ میں ہائی کورٹ کے اختیارات دینے کے لئے باب ۱۰۳ میں ایک ذیلی باب کا اضافہ کیا جائے۔ ان اختیارات کو انتخابات کے نوٹیفکیشن کے اجراء کی تاریخ سے لے کر نتائج کا اعلان کے دس روز بعد تک استعمال کیا جا سکے گا اور یہ اختیارات ان اختیارات

کے علاوہ ہوں گے جو عام عدالتوں کو پہلے ہی حاصل ہیں۔

۸...... مزید تجویز کیا جاتا ہے کہ منصفانہ' عادلانہ اور صاف ستھرے انتخابات کروانے اور کسی قسم کی بدعنوانیوں' ناجائز اثر و رسوخ کے زیر اثر رشوت اور ایکٹ کی دفعات اور قواعد کی خلاف ورزی کو روکنے کے لئے کمیشن کو کسی شخص کے خلاف امتناعی یا استحقاقی حکم یا ترقی کا حکم اور ایسے ہی دوسرے احکام جاری کرنے کا اختیار دینے کے لئے باب ۱۰۳ کے ساتھ مزید ذیلی باب شامل کیا جائے۔

۹...... یہ ممکن بنانے کے لئے کہ انتخابی نتائج کا اعلان ریٹرننگ افسر کے بجائے صرف الیکشن کمیشن کرے گا اور کوئی شخص یا ادارہ کمیشن کی طرف سے قطعی ہدایات کے بغیر نتائج کے بارے میں کوئی اعلان نہیں کیا جائے گا۔ ایکٹ کے باب ۴۲ میں ترمیم کی جانی چاہئے۔

۱۰...... ایکٹ کے باب ۸۵ میں ترمیم کی جانی چاہئے تاکہ کسی ووٹر کو انتخابی امیدوار کے نشان یا نام یا ووٹر کے نام' ولدیت اور جائے رہائش کے حامل کسی کاغذ کے اجراء کو ممنوع قرار دیا جائے۔

۱۱...... ٹیلیفون یا کسی اور طرح کی ہونے والی گفتگو میں مداخلت کے لئے "وائر ٹیپنگ" یا کسی قسم کے الیکٹرونک آلات کے استعمال کو جرم قرار دیا جانا چاہئے اور کمیشن کو یہ اختیار دیا جانا چاہئے کہ کاٹنے جانے والے ٹیلیفون کو بحال کرنے کا حکم دے سکے۔

۱۲...... پاکستان قومی اتحاد نے منصفانہ' عادلانہ اور صاف ستھرے انتخابات کے انعقاد کے سلسلہ میں تجویز دینے کے لئے گذشتہ انتخابات کے دوران جو بدعنوانیاں سامنے آئی تھیں ان کا جائزہ لینے کے لئے ایک کمیٹی تشکیل دی تھی۔ کمیٹی کی پیش کردہ رپورٹ شامل بذا ہے۔ رپورٹ کی سفارشات کو قانون و ضوابط کا حصہ بنایا جانا چاہئے۔

۱۳...... پتہ چلا ہے کہ موجودہ چیف الیکشن کمشنر نے حالیہ انتخابات کے حوالہ سے حکومت کو حال ہی میں ایک رپورٹ پیش کی ہے جس میں انہوں نے منصفانہ انتخابات کو یقینی بنانے کے لئے کئی ترامیم تجویز کی ہیں۔ اس رپورٹ کی ایک نقل پاکستان قومی اتحاد کو فراہم کی جانی چاہئے جو اس رپورٹ پر تبصرہ کرے گا۔

۱۴...... یہ بھی ضروری ہے کہ نئے چیف الیکشن کمشنر سے کہا جائے کہ وہ موجودہ انتخابی قوانین کا جائزہ لیں اور منصفانہ' عادلانہ اور صاف ستھرے انتخابات کو یقینی بنانے اور بدعنوانیوں کے خاتمہ کے لئے ان کی تجاویز حاصل کی جائیں اور نئے چیف الیکشن کمشنر کی سفارشات کو قوانین و قواعد کی صورت دی جائے۔

مطالبات کی اس قدر طویل فہرست دیکھ کر وزیر اعظم لامحالہ پریشان ہو گئے تھے چنانچہ انہوں نے جمعرات ۵ مئی کو اس مسودے پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ...... مطالبات کی اس طویل فہرست سے صورت حال پیچیدہ ہو گئی ہے' قومی اتحاد کو صرف بنیادی مطالبات پیش کرنے چاہئیں۔

وزیر اعظم بھٹو کے اس تبصرے کا جواب پیر پگارا نے اسی روز ان الفاظ میں دیا۔

"اگر پی۔ این۔ اے کا یہ مسودہ مصالحت کے لئے منظور ہے تو سمجھوتہ ہو سکتا ہے اور سمجھوتے کے بعد سات دن کے اندر اندر اسمبلیاں توڑ دی جائیں جس کے ۳۰ دن بعد انتخابات کراتا ہوں گے۔"

یہ صورت حال انتہائی پریشان کن تھی پی۔ این۔ اے کا مسودہ ایسا نہیں تھا جس پر عجلت میں کوئی

فیصلہ کیا جا سکتا' اس پر بے حد غور و خوض کی ضرورت تھی اور وقت بھی درکار تھا۔ وزیر اعظم بھٹو نے طے کیا کہ ۱۰ مئی کو پیپلز پارٹی کی پارلیمانی پارٹی کا اجلاس بلایا جائے گا جس میں اس مسودہ پر غور کیا جائے گا۔ ادھر پیر صاحب پگارا' سردار سکندر حیات اور ابو سعید انور کے خلاف ڈی۔ پی۔ آر کے ماتحت مقدمات درج کر کے انکی گرفتاریوں کے لئے پولیس نے چھاپے مارنے شروع کر دیئے اور لاہور میں دوبارہ کرفیو نافذ کر دیا گیا۔

اسی شام کا ایک اور اہم واقعہ تھا کہ ملک غلام مصطفیٰ کھر اسلام آباد پہنچے اور انہوں نے سخت بحران کے اس دور میں اپنے سابق دوست اور قائد ذوالفقار علی بھٹو کو پھنسے ہوئے دیکھ کر دوبارہ اپنی خدمات انہیں پیش کر دیں۔ یہ ان کا رضاکارانہ فیصلہ تھا اور وہ لاہور سے اپنی سفید مرسیڈیز خود چلاتے ہوئے اسلام آباد پہنچے تھے۔ کھر بے حد جذباتی ہو رہے تھے۔ وہ وزیر اعظم کے خلاف بیرونی طاقتوں کی سازشیں برداشت نہ کر سکے تھے۔ تجدید تعلق کا یہ منظر عجیب تھا بیشتر دوستوں کی آنکھیں اس موقع پر نم تھیں۔

○ ..... ○ ..... ○ ..... ○

بھٹو صاحب سہالہ ریسٹ ہاؤس میں

قومی اتحاد کی تحریک کے اوائل ہی میں میں نے وزیر اعظم سے گزارش کی تھی کہ انتخابات میں بے قاعدگیوں کے خلاف شروع ہونے والا ایجی ٹیشن اب ایک مذہبی تحریک میں تبدیل ہو رہا ہے اور جس تحریک میں مذہب کا عنصر شامل ہو جائے اس میں لوگ بے دریغ جانوں کے نذرانے پیش کرتے ہیں۔ پیپلز پارٹی کی حکومت کے خلاف پی۔ این۔ اے کی سیاسی جدوجہد بہ تمام و کمال نظام مصطفیٰ کے نفاذ کے مطالبہ میں بدل رہی تھی۔ وزیر اعظم نے اس رنگ کو محسوس کرتے ہوئے ۵ اپریل ۱۹۷۷ء کو مجھے ایک مکتوب ارسال کیا ہمارے اور وزیر اعظم کے درمیان سے بیورو کریسی کے پردے اب ہٹ چکے تھے ان کا انداز تخاطب ایک مرتبہ پھر ان کا اپنا بن چکا تھا وزیر اعظم کا مکتوب سامنے کے صفحات پر ملاحظہ ہو

بدقسمتی سے وزیر اعظم اب بھی اس معاملے کو محض "مولویالوجی" کا ایک مسئلہ سمجھ رہے تھے اور مخالف مولویوں کے مقابل حامی مولویوں کی ایک قوت کھڑی کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے خود ہی اوقاف کو مرکز کی تحویل میں دینے سے مسلسل گریز کیا تھا اور اب تحریک کی شدت کو دیکھتے ہوئے وہ اس کے خواہاں تھے کہ میں صوبائی وزرائے اوقاف اور علماء پر مشتمل ایک کمیٹی قائم کر کے مولوی حضرات کو حکومت کے حق میں ہموار کروں۔ وزیر اعظم کی سمجھ میں وہ نکتہ بہت دیر بعد آیا کہ جس کی طرف میں ابتدا ہی سے اشارہ کر رہا تھا ۱۷ اپریل کو جب وزیر اعظم اور میں لاہور میں تھے تو میں نے انہیں یہ مشورہ دیا کہ وہ فوری طور پر ایک پریس کانفرنس کا اہتمام کریں اور "نظام مصطفیٰ" کے نفاذ کے سلسلے میں بعض ٹھوس اقدامات کا اعلان کر دیں انہوں نے حکم دیا کہ میں اس کے لئے ان کی پریس کانفرنس کے نکات تحریر کر کے انہیں دے دوں۔ چنانچہ میں نے اسی روز وہ نکات ان کے حوالے کر دیئے۔ (مکتوب کا اصل متن اور وزیر اعظم کا نوٹ ملاحظہ ہو)

○ .... ○ .... ○

وزیر اعظم ہاؤس

راولپنڈی

مائی ڈیئر منسٹر!

منبر قومی اتحاد کی تحریک میں اہم کردار ادا کر رہا ہے اور محکمہ اوقاف کے ملازمین سمیت کم و بیش مولویوں پر ان کا سب سے زیادہ تکیہ ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ اوقاف کے ملازم مولویوں کو قومی اتحاد سے الگ کر کے مولویوں کی مزاحمتی قوت کو حکومت کے حق میں متحرک کیا جائے۔ کئی اہم مولوی اور دینی رہنما جنہوں نے گذشتہ انتخابات کے دوران ہماری حمایت کی تھی کہیں پس منظر میں غائب ہو چکے ہیں۔ انہیں دوبارہ سامنے لانا ہوگا اور ان کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے کہ وہ ایک بار پھر ہماری اسی طرح حمایت کریں جس طرح انہوں نے انتخابات کے دوران کی تھی۔ اس کام میں آپ کو صوبائی حکومتوں کی مکمل حمایت اور تعاون کی ضرورت ہوگی۔ لہٰذا آپ کو اپنی سربراہی میں ایک ایسی کمیٹی تشکیل دینی چاہیے جس میں اوقاف کے تمام صوبائی وزراء شامل ہوں۔ آپ کو ان کے ساتھ وقتاً فوقتاً ملاقاتوں کے بعد ایک لائحہ عمل تیار کر کے اس پر فوری طور پر عمل درآمد شروع کر دینا چاہیے۔ مجھے امید ہے کہ آپ اس سلسلہ جو اقدام بھی کریں گے اور اس سے جو بھی کامیابی حاصل ہو مجھے اس سے مطلع کرتے رہیں گے۔

دستخط (ذوالفقار علی بھٹو)
۵ اپریل ۱۹۷۷ء

مولانا کوثر نیازی
وزیر برائے مذہبی امور
اسلام آباد۔

اصل متن کیلئے ملاحظہ ہو ضمیمہ جات

حکومت پاکستان
وزارت برائے مذہبی و اقلیتی امور و سمندر پار پاکستانی

عنوان = وزیر اعظم کی مختلف مسالک کے علماء و مشائخ سے ملاقات کے بارے میں تجویز

جناب وزیر اعظم کو پشاور میں حزب اختلاف کی تحریک میں حصہ لینے والے علماء سے میری بات چیت یاد ہوگی۔

میں نے جناب وزیر اعظم سے یہ گذارش کی تھی کہ حزب اختلاف میں شامل بعض عناصر کی شر پسندانہ مگر کامیاب کوششوں کے باعث حکومت کے خلاف تحریک مذہبی جنگ کا سا رنگ اختیار کر گئی ہے جس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ایسے سادہ لوح علماء بھی جن کے کوئی سیاسی مقاصد نہیں ہیں اس تحریک میں شامل ہونے پر مجبور ہو گئے ہیں۔

سیاسی سوجھ بوجھ رکھنے والے مگر غیر جانبدار علماء سمیت ان علماء کو تحریک سے الگ کرنے کیلئے میں یہ تجویز کروں گا کہ جناب وزیر اعظم براہ کرم ملک بھر سے منتخب کردہ تقریباً ایک سو ایسے علماء اور مشائخ سے ملاقات کرنا پسند فرمائیں گے جن کو دلائل سے متاثر کیا جا سکتا ہے اور جن کے مذہبی جوش و جذبات کی بنیاد پر جناب وزیر اعظم کچھ مخصوص تجویز کردہ مخصوص فیصلوں کا اعلان کر کے اچھا تاثر پیدا کر سکتے ہیں۔

مندرجہ بالا مقصد کے حصول کیلئے میں جناب وزیر اعظم کی توجہ کیلئے یہ تجویز پیش کرنا چاہوں گا کہ وہ علماء اور مشائخ سے اپنی ملاقات میں درج ذیل اہم نکات کو مد نظر رکھنا پسند فرمائیں گے۔

(۱) ۔ اپنی حکومت کی اسلامی پالیسیوں اور کارگذاریوں کی مطابقت اور تسلسل میں جناب وزیر اعظم ایسی سرگرمیوں پر فوری طور پر پابندی لگانے کی پیشکش کریں جن کی تمام علماء اور پاکستانی عوام کا اکثریتی حصہ متفقہ طور پر مذمت کرتا ہے اور جن کی وجہ سے اسلامی جمہوریہ پاکستان کو تنقید کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ ان سرگرمیوں میں شراب کا استعمال اور قمار بازی (گھوڑ دوڑ اور اس کی دوسری صورتیں) شامل ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں اگر یہ کام کر لیا جائے تو صرف یہی واحد عمل مندرجہ بالا طبقے کے علماء اور مشائخ کو حزب مخالف کی تحریک سے الگ کرنے کیلئے کافی ہوگا اور ہو سکتا ہے اس اقدام کے باعث انہیں ایسے بیانات جاری کرنے کی انگیخت ملے جس سے ایجی ٹیشن کرنے والوں کی قوت کمزور پڑ جائے اور اس کا عوام پر بھی بلا شبہ شاندار اثر مرتب ہوگا۔

(۲) ۔ حزب اختلاف کے نفاذ شریعت کے بنیادی مطالبہ کے سلسلہ میں جناب وزیر اعظم اسلامی نظریہ کی کونسل کیلئے نئے ارکان کی نامزدگی کے فیصلہ کا اعلان بھی کر سکتے ہیں اور اگر علماء یہ

محسوس کریں تو کونسل میں مولانا مودودی اور مولانا شاہ احمد نورانی کی شمولیت یا پھر اس کے متبادل کے طور پر جناب وزیر اعظم نفاذ شریعت کیلئے طریق کار کی چھ ماہ کے دوران سفارش کرنے کیلئے ایک کمیشن کی تشکیل کا اعلان بھی کر سکتے ہیں۔ اس اقدام سے حزب اختلاف کے اس پروپیگنڈے کے غبارے سے ہوا خارج ہو جائے گی جس نے ان علماء کو بھی لبھا رکھا ہے جو اپنے طور پر امن پسند لوگ ہیں۔

وزارت کے پاس علماء اور مشائخ کی ایسی فہرست پہلے ہی سے موجود ہے جو اوقاف کے صوبائی محکموں کی سفارشات کی بنیاد پر تیار کی گئی ہے اور جونہی جناب وزیر اعظم نے اپنی سہولت کے پیش نظر اس اجلاس کی تاریخ اور وقت مقرر فرمایا دعوت نامے جاری کر دیئے جائیں گے۔

دستخط (کوثر نیازی)

میں ان سے بالکل مل سکتا ہوں، لیکن یہ اہم تجاویز کابینہ کے آئندہ اجلاس میں پیش کی جانی چاہئیں۔

دستخط (وزیر اعظم)
۸-۴-۷۷

وزیر برائے مذہبی امور۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وزیر برائے مذہبی امور
حکومت پاکستان
کیمپ لاہور
۱۷ اپریل ۱۹۷۷ء

وزیر اعظم کی خواہش کے مطابق میں "نظام مصطفیٰ" کے نفاذ کے سلسلہ میں ان کی پریس کانفرنس کیلئے درج ذیل نکات پیش کرتا ہوں۔

میں اس بات پر زور دینے کی اجازت چاہتا ہوں کہ پاکستان میں اسلامی نظام کے نفاذ کے عزم کا اعلان کرنے سے قبل وزیر اعظم کو اس امر کو یقینی بنانا چاہئے کہ یہ اعلان صرف وقت حاصل کرنے کا آلہ یا سیاسی چال ثابت نہ ہو۔ اگر بدقسمتی سے عوام نے یہ تاثر لیا تو مجھے ڈر ہے کہ یہ سارا عمل الٹ بھی پڑ سکتا ہے۔

قومی اتحاد، پاکستان پیپلز پارٹی کے خلوص اور وزیر اعظم کی طرف سے صحیح اسلامی نظام کے نفاذ کے بارے میں بہر حال شکوک و شبہات پیدا کرنے کی کوشش کرے گا، لہٰذا میں وزیر اعظم کے اعلان کے بعد ان کی اجازت سے تمام صوبوں کے معروف علماء اور مشائخ سے ضلع وار اجلاسوں اور تبادلۂ خیال کا سلسلہ شروع کروں گا۔ ان میں حزب اختلاف سے متعلق علماء و مشائخ بھی شامل ہوں گے۔

آخر میں پر زور طور پر میں یہ عرض کروں گا کہ وزیر اعظم اپنے اعلان کے ذریعے عام لوگوں اور خصوصاً حزب اختلاف کیلئے جو بھی سیاسی پیشرفت بھی کرنے کی نیت رکھتے ہیں وہ اس وقت تک مطلوبہ حد تک مؤثر نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ خصوصی اہمیت کا حامل نہ ہو۔

دستخط (کوثر نیازی)

یہ سیاسی کام آپ کو، دوسرے وزراء اور پارٹی لیڈروں کو کرنا ہو گا۔ میں تمام محاذوں پر توجہ نہیں دے سکتا۔

دستخط (وزیر اعظم)

میں نے ان سے گزارش کی تھی کہ وہ پاکستان میں اسلامی قوانین کے نفاذ کا اعلان کریں اور اس کی یقین دہانی کرائیں کہ اس طرح نہ تو وہ کسی کو سیاسی جھانسہ دے رہے ہیں نہ وقت گزاری کے لئے ایسا کر رہے ہیں میں نے ان پر واضح کیا اگر خدا نخواستہ ایسا تاثر مرتب ہو گیا تو اس کے بدترین نتائج برآمد ہوں گے۔ میں نے یہ بھی کہا تھا کہ پی۔ این۔ اے اس سلسلے میں ان کے خلوص نیت کو مشکوک بنانے کی بھرپور کوشش کرے گی چنانچہ میں وزیر اعظم کے اعلان کے بعد ملک میں اسلامی قوانین کے نفاذ کے لئے بلا تخصیص تمام علماء و مشائخ سے تبادلہ خیال کروں گا جن میں حزب اختلاف کے علماء بھی شامل ہوں گے۔

اس سے قبل ۸ اپریل کو بھی وزیر اعظم کے نام ایک مکتوب میں' میں نے کوشش کی تھی کہ علماو مشائخ کے ساتھ ان کی ایک ملاقات کا اہتمام کر سکوں۔ دراصل وزیر اعظم بھٹو کو وزیر داخلہ خان عبدالقیوم خان نے یہ تاثر دیا تھا کہ صوبہ سرحد کے علمائے کرام تشویش ناک حد تک حکومت کے مخالف ہو چکے ہیں جن کا سدباب ضروری ہے' چنانچہ وزیر اعظم کے حکم پر میں صورت حال کا جائزہ لینے صوبہ سرحد کے دورے پر گیا۔ اور وہاں مختلف مکاتب فکر کے علماء سے تفصیلی تبادلہ خیال کے علاوہ کئی جلسوں سے بھی خطاب کیا۔ واپسی پر میں نے وزیر اعظم کو جو رپورٹ پیش کی اس میں انہیں یہ سمجھانے کی بھرپور کوشش کی تھی کہ ایجی ٹیشن اب مذہبی رنگ پکڑ چکا ہے اور اس میں وہ علما بھی شامل ہو چکے ہیں جن کا سیاست سے کوئی واسطہ کبھی نہیں رہا۔ میں نے ان کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ ملک بھر سے منتخب ایسے ایک سو علماو مشائخ سے وہ ملاقات کریں اور ان کی تجاویز پر عمل کرتے ہوئے اسلامی قوانین کے نفاذ کے سلسلے میں اپنے فیصلے کا اعلان کر دیں۔ فوری نوعیت کے اقدامات کے طور پر میں نے مشورہ دیا تھا کہ شراب اور جوئے پر پابندی عائد کر دی جائے جس کے نتیجے میں سیاست سے لاتعلق علما تحریک سے علیحدگی اختیار کر لیں گے۔ مزید براں اس سلسلے میں اسلامی نظریاتی کونسل کی تشکیل نو اور اس میں مولانا مودودی اور مولانا شاہ احمد نورانی کی شمولیت کی تجویز کے ساتھ چھ ماہ کے اندر شرعی قوانین کے مکمل نفاذ کی ضرورت پر زور دیا۔ میں نے ان کو بتایا تھا کہ یہ اقدامات اپوزیشن کے غبارے میں سے ہوا نکال دیں گے اور اس سلسلے میں وزارت مذہبی امور کی جانب سے علما کے ناموں اور دیگر اقدامات سے آگاہ کرتے ہوئے میں نے ان سے اجازت طلب کی تھی کہ وہ مجھے علما سے اپنی ملاقات کا پروگرام طے کرنے دیں وزیر اعظم نے میرے اس تفصیلی مکتوب پر نوٹ لکھا کہ میں علما سے ملنے کے لئے تیار ہوں لیکن یہ اچھی تجاویز کابینہ کے اجلاس میں پیش کی جائیں۔ اس مقصد کے لئے میری ہدایت پر وزارت مذہبی امور کے سیکرٹری نے کابینہ کے غور و خوض کے لئے ایک تفصیلی نوٹ تیار کیا۔ میں خلوص دل سے یہ سمجھتا تھا کہ ملک میں اسلام کے نفاذ کا یہ سب سے بہترین موقع ہے جو اگر ہاتھ سے نکل گیا تو برصغیر کے مسلمانوں کے اس قدیم خواب کی تعبیر پھر شاید ہی کبھی نکل سکے' وزیر اعظم بھٹو اگر چاہتے تو اس وقت ملک میں اسلامی قوانین نافذ کر سکتے تھے جس کے بعد کسی شخص کو نہ تو اسلام کے نام پر کوئی تحریک چلانے کی ضرورت محسوس ہوتی اور نہ اسلام کا نام لے کر کوئی طالع آزما بعد میں عوام

کے مذہبی جذبات کا استحصال کر سکتا' یہ مسئلہ ہمیشہ کے لئے اسی وقت طے ہو جاتا.......... لیکن افسوس کہ قسمت میں ایسا نہ تھا میری تجاویز پر وزیر اعظم نے فیصلہ کن انداز میں سوچنے کے لئے اتنی تاخیر کر دی کہ وقت کی باگ ڈور خود ان کے ہاتھ سے نکل گئی اپریل کے آغاز میں پیش کی گئی تجاویز پر انہوں نے مئی میں فیصلے کئے لاہور گورنر ہاؤس میں منعقدہ ایک پریس کانفرنس کے ذریعے انہوں نے شراب اور جوئے پر پابندی کا اعلان کیا تو بی۔ بی۔ سی نے مختصراً ان کی پریس کانفرنس کی خبر دینے کے بعد آخری سطر جو نشر کی وہ یہ تھی.......... "جب مسٹر بھٹو شراب پر پابندی کا اعلان کر رہے تھے۔ تو وہ سگار پی رہے تھے۔" صرف اس ایک جملے کے ذریعے بی۔ بی۔ سی نے وزیر اعظم کے ان اقدامات کو مشکوک بنا کر رکھ دیا تھا۔ عام آدمی یہ سمجھا کہ "سگار" بھی غالباً شراب ہی کی طرح کی کوئی چیز ہے جسے مسٹر بھٹو شراب پر پابندی کے اعلان کے وقت بھی پی رہے تھے۔ کئی مولوی صاحبان نے خود مجھ سے دریافت کیا.......... "ہم صحیح طور پر سن نہیں سکے تھے' آپ بتائیں مسٹر بھٹو اس وقت کیا پی رہے تھے؟" یہ نظام مصطفیٰ کے نفاذ کی تحریک میں شریک لوگوں کی سادہ لوحی کا عالم جسے بیرونی طاقتیں بھرپور طریقے سے ایکس پلائٹ کر رہی تھیں۔

۷ مئی کو اس سلیکٹ کمیٹی کا اجلاس ہوا جو میری سربراہی میں قومی اسمبلی میں قائم ہوئی تھی۔ کمیٹی کے ذمے یہ کام لگایا گیا تھا کہ شراب اور جوئے پر پابندی کو بل کی شکل میں اسمبلی میں پیش کرے۔ کمیٹی کے اراکین میں وزیر خزانہ عبدالحفیظ پیرزادہ' وزیر قانون ایس۔ ایم۔ مسعود' وزیر زراعت شیخ محمد رشید' وزیر صنعت حامد رضا گیلانی' میر افضل خان' صاحب زادہ نذیر سلطان' علی اصغر شاہ اور ملک سکندر خان شامل تھے۔ کمیٹی نے طے کیا کہ مجوزہ بل منگل کو قومی اسمبلی میں پیش کر دیا جائے گا۔ چنانچہ ۱۰ مئی منگل کے روز میں نے قومی اسمبلی میں شراب اور جوئے پر پابندی کا بل پیش کیا جسے منظور کر کے قانونی شکل دے دی گئی' مزید برآں جمعہ کو ہفتہ وار تعطیل قرار دینے کا بل بھی پیش کر کے اسمبلی سے منظوری لے لی گئی۔ جمعرات ۱۲ مئی کو سینٹ نے بھی مذکورہ بالا دونوں بل پاس کر دیئے اور اس طرح ہم "کافروں" کے ہاتھوں ملک میں اسلامی نظام کے نفاذ کی سمت وہ قدم اٹھائے گئے جن کی جرأت نہ پہلے کسی نے کی تھی نہ ان میں اضافہ بعد میں کسی "مرد مومن" کو نصیب ہوا۔

یہ ذکر برسبیل تذکرہ نکل آیا جس سے فقط یہ ثابت کرنا مقصود تھا کہ قومی اتحاد کی جماعتیں شرعی قوانین کے نفاذ کے سلسلے میں مخلص نہ تھیں۔ اگر ہوتیں تو مسٹر بھٹو کے اقتدار کے خاتمہ کی جدوجہد کرنے کی بجائے اس وقت خود ان کے ہاتھوں ملک میں مکمل اسلامی قوانین کا نفاذ کرا سکتی تھیں' لیکن ان کا ہدف ہی اور تھا.......... نظام مصطفیٰ کے نفاذ کے فقط نعرے تھے جن کا مفہوم شاید خود اس کے بیشتر رہنماؤں پر واضح نہ تھا۔ وزیر اعظم نے سعودی عرب کے سفیر شیخ ریاض الخطیب کے ذریعے سہالہ میں نظر بند پی۔ این۔ اے کے رہنماؤں کو پیغام بھجوایا کہ وہ اپنے طویل مطالبات پر مبنی مسودے

پر پہلے وزارتی سطح پر بات چیت کر کے کوئی متفقہ فارمولا طے کر لیں۔ اس سلسلے میں سعودی سفیر شیخ ریاض الخطیب سے ۲ مئی کو قومی اتحاد کے رہنماؤں سے ملاقات کی جس میں انہیں شاہ خالد مرحوم اور شہزادہ فہد کی مفاہمت کی خواہشات سے بھی آگاہ کیا لیکن اتحاد کی طرف سے پیر صاحب پگارا شریف نے آٹھ صفحات پر مشتمل ایک دستاویز جاری کر دی اور اعلان کیا کہ ہم وزارتی سطح پر بات چیت نہیں کریں گے۔ اگلے روز مفتی محمود سے سی۔ ایم۔ ایچ میں سعودی سفیر کے علاوہ لیبیا کے سفیر نے بھی ملاقات کر کے انہیں مفاہمت پر آمادہ کرنے کی کوشش کی۔ ادھر مسٹر بھٹو کا اصرار تھا کہ اپوزیشن صرف بنیادی مطالبات پیش کرے اس طویل مسودے پر بات نہیں ہو سکتی جو اس نے پیش کر دیا ہے۔ ریاض الخطیب نے اس امر پر قومی اتحاد کے رہنماؤں کو آمادہ کرنے کے لئے ۸ مئی کو پھر ان سے سہالہ میں ملاقات کی جس کے جواب میں پیر صاحب پگارا نے کہا کہ ہمارے مطالبات بنیادی طور پر پانچ (۵) ہیں باقی تو ان کی تشریحات ہیں۔ وزیر اعظم بھٹو ۹ مئی کو کراچی چلے گئے اور ہمیں ہدایت دے گئے کہ اگر پی۔ این۔ اے والے راضی ہوں تو آپ لوگ سلسلہ جنبانی کر سکتے ہیں لیکن قومی اتحاد کے رہنما وزیر اعظم سے کم سطح پر گفتگو کرنے کے لئے آمادہ نہ تھے اور شیخ ریاض الخطیب نے اس سلسلے میں ان کے حتمی فیصلے سے وزیر اعظم کو آگاہ کر دیا۔ مسٹر بھٹو ۱۱ مئی کو واپس اسلام آباد پہنچے اور انہوں نے اعلان کیا کہ وہ قومی اتحاد سے براہ راست مذاکرات کے لئے تیار ہیں لیکن مجھے نہیں پتہ کہ مذاکرات کی ناکامی کا کیا نتیجہ نکلے گا۔ اسی روز پیپلز پارٹی کے پارلیمانی گروپ کا اجلاس ہوا جس میں وزیر اعظم بھٹو کو قومی اتحاد کے ساتھ مذاکرات کا اختیار دیا گیا۔ شام تین بجے پی۔ ایم۔ ہاؤس میں وزیر اعظم بھٹو کی صدارت میں کابینہ کا ایک اہم اجلاس ہوا جس میں میرے علاوہ حفیظ پیرزادہ، حامد رضا گیلانی، عزیز احمد، میر افضل اور ٹکا خان کے علاوہ چند اور وزرا شریک ہوئے۔ رات ۸ بجے تک ہم لوگ پی۔ این۔ اے کے ساتھ باقاعدہ مذاکرات کی حکمت عملی کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتے رہے جس کے بعد اجلاس ختم ہو گیا اور ہم لوگ گھروں کو روانہ ہو گئے۔

رات کے تقریباً ساڑھے نو بجے تھے، جب وزیر اعظم کے اے۔ ڈی۔ سی کا فون آیا جنہوں نے مجھے فوراً پی۔ ایم ہاؤس بلوایا تھا۔ جب میں پہنچا تو دیکھا کہ لان میں پڑی کرسیوں پر حفیظ پیرزادہ اور میر افضل خان پہلے سے بیٹھے تھے۔ ابھی میں بیٹھا ہی تھا کہ وزیر اعظم بھٹو تشریف لے آئے اور بولے .... چلئے "ہم اٹھ کھڑے ہوئے۔ منزل کا علم کسی کو بھی نہ تھا، نہ اس سلسلے میں اجلاس میں کوئی بات ہوئی تھی وزیر اعظم اور ہم لوگ گاڑی میں بیٹھ چکے تو اچانک وزیر اعظم کے ملٹری سیکرٹری میجر جنرل امتیاز بھی اگلی نشست کا دروازہ کھول کر شوفر کے ساتھ بیٹھ گئے۔ میں نے دیکھا کہ وزیر اعظم کی پیشانی پر ناگواری کی چند شکنیں نمودار ہوئیں جیسے انہیں امتیاز کی حرکت پسند نہ آئی ہو۔ گاڑی کی نشستوں کے درمیان شیشے کا ایک شٹر تھا جس کی وجہ سے آگے بیٹھنے والوں کے لئے گفتگو سننا مشکل تھا لیکن مسٹر بھٹو نے پھر بھی ہمیں یہ

بتانا پسند نہ کیا کہ وہ اس وقت رات گئے کس مشن پر جا رہے ہیں۔ دراصل وہ جنرل امتیاز کو "آرمی کا آدمی" سمجھنے لگے تھے۔ اور ان کی طرف سے بد اعتمادی کے شکار تھے۔ گاڑی شہری حدود سے باہر نکلی اور ایئرپورٹ کی سڑک سے ہوتی ہوئی سہالہ کی طرف روانہ ہوئی، ہم سارا راستہ خاموش رہے مگر ہمیں اندازہ ہو گیا تھا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔

مولانا مفتی محمود، نوابزادہ نصر اللہ خان اور سردار قیوم سہالہ ریسٹ ہاؤس میں نظر بند تھے ہم انہیں سے ملنے جا رہے تھے۔ ہم سہالہ پہنچے تو مولانا مفتی محمود، نوابزادہ نصر اللہ خان اور سردار قیوم نے بڑی خندہ پیشانی سے ہمارا "استقبال" کیا کسی قسم کی بدمزگی کا کوئی تاثر موجود نہ تھا۔ وزیر اعظم بھٹو، مفتی محمود اور نوابزادہ صاحب کے ساتھ ایک صوفے پر جا بیٹھے میں سردار قیوم کے ساتھ باتیں کرنے لگا۔ ماحول نہایت خوشگوار تھا تمام بات چیت بڑے دوستانہ انداز میں آگے بڑھی۔ ماضی کی تلخیوں کو بھلا کر نئے سرے سے قومی سفر شروع کرنے کے سلسلے میں تبادلۂ خیال ہوا۔ میں نے سردار عبدالقیوم سے کہا کہ

"اگر وہ چاہیں تو اس سلسلے میں بے حد مثبت کردار ادا کر سکتے ہیں کیونکہ موجودہ صورت حال کو ملک زیادہ دیر برداشت نہیں کر سکے گا۔" سردار قیوم پاکستان کی محبت سے سرشار ہیں۔ انہوں نے اس سلسلے میں فوراً اپنی آمادگی کا اظہار کر دیا اور بولے .... "اگر میں کچھ کر سکتا ہوں تو حاضر ہوں" مفتی محمود اور نوابزادہ نصر اللہ کا کہنا تھا کہ ساتھیوں سے مشورہ کئے بغیر ہم مذاکرات شروع نہیں کر سکتے اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم سب کو ایک جگہ اکٹھا ہونے کا موقع دیا جائے۔

وزیر اعظم بھٹو بولے۔ "کیوں نہ پہلے سردار قیوم صاحب مختلف مقامات پر نظر بند تمام رہنماؤں سے خود جا کر ملیں اور انہیں صورت حال کی سنگینی کا احساس دلا کر مذاکرات کے لئے آمادہ کرنے کی کوشش کریں۔ پھر ہم تمام رہنماؤں کو ایک جگہ اکٹھا ہونے کا موقع بھی دے دیں گے۔"

مفتی محمود اور نوابزادہ نصر اللہ خان نے اس تجویز سے اتفاق کر لیا۔ چنانچہ طے پایا کہ سردار عبدالقیوم کی رہائی عمل میں لائی جائے گی تاکہ وہ پی۔ این۔ اے کے دیگر رہنماؤں سے مل کر مذاکرات کے لئے سٹیج تیار کر سکیں۔ وہ مختلف جیلوں میں نظر بند رہنماؤں سے ملاقات کر کے یہ فریضہ انجام دینے پر آمادہ تھے اور انہیں یقین تھا کہ وہ کامیاب رہیں گے ہم سب نے اس موقع پر ان کی کامیابی کے لئے دعا کی اور اٹھ کھڑے ہوئے۔

واپسی پر مسٹر بھٹو بے حد خوش اور مطمئن نظر آتے تھے۔ تاہم جنرل امتیاز کی گاڑی میں موجودگی کی وجہ سے انہوں نے اس موضوع پر کوئی گفتگو نہیں کی پی۔ ایم ہاؤس واپس پہنچے تو وزیر اعظم ہمیں ساتھ لے کر اپنی رہائش گاہ کی طرف چل دئے اور برآمدے میں بیٹھتے ہی مجھ سے گویا ہوئے "جو کچھ کہتا ہے، اب کہو .... راستے میں تمہیں اس لئے اشارہ کیا تھا کہ "ان" کا وہ ایجنٹ ساتھ بیٹھا تھا" مسٹر بھٹو کا اشارہ واضح طور پر جرنیلوں کی طرف تھا۔ تھوڑی دیر ان کے ساتھ سہالہ میں ہونے والی گفتگو کے مختلف پہلوؤں

پر بات چیت ہوتی رہی۔ وہ اپنی اس کامیابی پر بے حد مسرور نظر آ رہے تھے۔ اچانک انہوں نے فون اٹھایا اور میجر جنرل عبداللہ ملک (سی۔ جی۔ ایس برائے چیف آف آرمی سٹاف) کو بلانے کا حکم دیا۔ جنرل ملک پہنچے تو مسٹر بھٹو نے بغیر کسی ترمیم یا اضافہ کے یہ "خوشخبری" انہیں بھی سنائی کہ اپوزیشن کو مذاکرات پر آمادہ کرنے کی عملی کاروائی کا آغاز ہو گیا ہے جس کے اچھے نتائج نکلیں گے۔ جنرل ملک نے بھی اس پر اپنی مسرت کا اظہار کیا۔ وہ ویسے بھی مسٹر بھٹو کے بے حد گرویدہ اور حقیقی خیر خواہ تھے۔ دوران گفتگو اچانک مسٹر بھٹو نے ان سے پوچھا .... "آپ کے ہاں کی کیا خبریں ہیں؟"

عبداللہ ملک نے جواب دیا .... "کچھ لوگ ذہنی تحفظ کا شکار نظر آتے ہیں"

"کوئی بات نہیں" مسٹر بھٹو بولے۔ "سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔"

○ ..... ○ ..... ○ ..... ○

تیرھواں باب

مذاکرات کی راہ ہموار ہوتی ہے

وزیر اعظم بھٹو انتخابات کے نتائج کے فوراً بعد سے کور کمانڈرز کے ساتھ میٹنگز کرتے رہے تھے۔ پرائم منسٹر ہاؤس میں ہونے والی ایسی ہی ایک میٹنگ کے بعد کھانے کی میز پر عبداللہ ملک نے لاء اینڈ آرڈر بحال کرنے کے سلسلے میں آرمی کی ذمہ داریوں پر اظہار خیال کیا۔ ان کی بات ختم ہوئی تو راولپنڈی ڈویژن کے کور کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل فیض علی چشتی نے غور سے ان کی طرف دیکھا۔ پھر خاصی بلند آواز میں بولے ...... "تم کور کمانڈر نہیں ہو، تمہیں کیا معلوم کہ ہماری کیا مشکلات ہیں؟۔ ہم کیوں گولی چلائیں؟ سیاست ہے تو سیاسی تصفیہ ہونا چاہئے!"

ان کی اس بات پر چند لمحے کیلئے پوری محفل پر گویا سناٹا طاری ہو گیا۔ عبداللہ ملک فیض علی چشتی سے جونیئر تھے۔ محفل میں اور بھی ان سے کئی سینئر جنرل موجود تھے۔ وزیر اعظم کے چہرے کا رنگ یہ الفاظ سن کر متغیر ہو گیا تھا۔ اسی اثناء میں لیفٹیننٹ جنرل سوار خان، اور ارباب جہانزیب بھی عبداللہ ملک کے پیچھے پڑ گئے اور محفل میں خاصی گرما گری بلکہ بدمزگی پیدا ہو گئی۔

وزیر اعظم بھٹو اس میٹنگ اور کھانے کے اختتام پر خاصے اپ سیٹ نظر آ رہے تھے۔ اضمحلال ان کے چہرے سے عیاں تھا۔ مسٹر بھٹو کی موجودگی میں یہ پہلا موقع تھا جب جرنیلوں نے یہ انداز گفتگو اختیار کیا تھا اور در حقیقت پی این اے کے ساتھ مذاکرات کے بارے میں سنجیدگی سے غور کرنا بھی مسٹر بھٹو نے اس کے بعد ہی شروع کیا۔ ان پر سیاسی مذاکرات کی اہمیت آشکار ہو چکی تھی۔ وزیر اعظم نے جرنیلوں کے ساتھ اس قسم کی میٹنگز اور کھانوں کا سلسلہ اس لئے شروع کیا تھا کہ وہ خود کو آرمی کے چیف آف سٹاف کی حد تک محدود کرنا نہ چاہتے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ تمام کور کمانڈرز کے ساتھ ان کے ذاتی دوستانہ تعلقات ہوں۔ بھٹو صاحب ان میٹنگوں میں نہایت متحرک اور فعال نظر آئے۔ وہ اپنی گفتگو سے جلد ہی ماحول پر چھا جانے کی کوشش کرتے۔ ایسی ہی ایک میٹنگ میں جبکہ بھٹو صاحب کچھ کہہ رہے تھے۔ میں نے دیکھا ...... کہ ان کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے دو جرنیلوں نے جو ساتھ ساتھ بیٹھے تھے، ایک دوسرے کو کہنیاں ماریں میں نے ان کی یہ حرکت دیکھی تو اسی وقت اندازہ کر لیا کہ جرنیلوں پر مسٹر بھٹو کی گرفت ڈھیلی ہو چکی ہے۔ اور اس سلسلے میں ان کے کھانے اور میٹنگز شاید بار آور ثابت نہ ہو سکیں۔

کور کمانڈرز کے ساتھ ایک اور میٹنگ میں جب مختلف جنرل اپنے اپنے علاقوں کی صورتحال سے مسٹر بھٹو کو آگاہ کر رہے تھے، تو وزیر زراعت شیخ محمد رشید کے ساتھ لیفٹیننٹ جنرل محمد اقبال کی زبردست جھڑپ ہوئی جنرل اقبال ان کے کیمونسٹ نظریات کی وجہ سے پہلے ہی ان کو ناپسند کرتے تھے۔ اس جھڑپ کے بعد ماحول میں زبردست تلخی آ گئی تھی۔ جنرل ارباب جہانزیب نے صاف طور پر مسٹر بھٹو کو مخاطب کرتے ہوئے کہا...... "ہمیں تو اب یہ خطرہ محسوس ہونے لگا ہے کہ سپاہی کہیں ہم پر ہی گولیاں نہ چلانا شروع کر دیں"۔ جنرل اقبال نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا...... "آپ لاہور آئیں۔ میں علماء سے آپ کی میٹنگ کرا سکتا ہوں"۔ میں نے اس دعوت پر خاموشی اختیار کر لی۔ چیف آف آرمی سٹاف جنرل ضیاء الحق نے ماحول کو بہتر بنانے کیلئے جنرل اقبال اور شیخ رشید کو ایک دوسرے کے ساتھ نہ الجھنے کی تلقین کی۔ اس دوران حفیظ پیرزادہ نے وہ ریفرنڈم والی تجویز پیش کی جس کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں کہ وزیر اعظم نے اس پر پہلے جنرل ملک سے مشورہ کیا تھا۔ حفیظ پیرزادہ کا کہنا تھا کہ ملک میں صرف اس سوال پر ریفرنڈم کرا لیا جائے کہ مسٹر بھٹو وزیر اعظم رہیں.......... یا.......... نہ رہیں اور یہ کہ اگر عوام ان کے حق میں ہوں تو وہ آئین میں ترمیم بھی کر سکیں' وزیر اعظم کی جانب سے حفیظ پیرزادہ کی تجویز کے ساتھ اتفاق رائے ظاہر ہوتے ہی جنرل ضیاء الحق نے اس کی تائید کی' جس کے بعد باقی جرنیلوں نے بھی کہا کہ انہیں اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ بھٹو صاحب نے جنرل ضیاء الحق کی طرف ایک مرتبہ پھر غور سے دیکھا تو وہ دوبارہ گویا ہوئے...... "سر! ہمارے پاس جوانوں کو "سیل" کرنے کیلئے کچھ تو ہونا چاہئے تاکہ آرمی مطمئن رہ سکے"۔ بھٹو صاحب نے کہا...... "میں ریفرنڈم اس بات پر کراؤں گا کہ لوگ مجھ پر اعتماد کرتے ہیں یا نہیں۔ مجھے آئین میں ترمیم کا قطعی حق بھی مل جائے گا جس کے ذریعے میں حکومت میں فوج کے کردار کا تعین کروں گا کیونکہ اب فوج کی شمولیت کے بغیر ملک کا نظام نہیں چل سکتا۔"

جنرل ضیاء الحق نے ان کی اس بات پر بھی مسرت کا اظہار کیا اور بولے "ٹھیک ہے سر! میں اس بات کو اپنے جوانوں کے سامنے "سیل" کر سکوں گا"۔ ذاتی طور پر میں اس میٹنگ میں صرف چند نوٹس لیتا رہا تھا اور ایک لفظ بھی بولنے سے گریز کیا تھا۔ ریفرنڈم کی تجویز سے مجھے ذاتی طور پر اتفاق نہ تھا کیونکہ اس میں کئی خلاء موجود تھے۔ سب سے پہلی بات تو یہی تھی کہ یہ ایک یکطرفہ فیصلہ تھا اس کیلئے کوئی گراؤنڈ ورک نہ کیا گیا تھا۔ اگر اپوزیشن اسے مسترد کر دیتی ہے تو پھر کیا ہو گا؟ کیا ایجی ٹیشن ختم ہو جائے گا؟ یہ سوالات اس وقت بھی میرے ذہن میں تھے۔

جمعہ ۱۳ مئی کو وزیر اعظم بھٹو نے قومی اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے ریفرنڈم کی تجویز پیش کر دی۔ انہوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ میں عوام سے یہ فیصلہ کرانے کیلئے تیار ہوں کہ وہ مجھے چاہتے ہیں یا نہیں۔ میں خود آزمائش میں پڑ سکتا ہوں لیکن قومی اسمبلی کو قربان نہیں کر سکتا۔ ہاری ہوئی پارٹی کو مجھ سے استعفیٰ طلب کرنے کا کوئی حق نہیں۔"یہ انتظام عارضی ہو گا جس کیلئے آئین میں ترمیم کی جائے گی۔"

اگلے ہی روز پیر پگارا نے پی این اے کی طرف سے اس تجویز کو مسترد کرنے کا اعلان کر دیا۔ پی این اے کے لیڈر مسٹر بھٹو سے اس لئے "الرجک" تھے کہ وہ کسی بھی وقت' کوئی سا بھی پتا بالکل اچانک ہی کھیل جاتے تھے۔ ایک طرف جہاں وہ اپوزیشن کے ساتھ مذاکرات کی داغ بیل ڈال رہے تھے اور دوسری طرف جنرلز کو مطمئن کرنے کی کوششوں میں مصروف تھے وہاں تیسری طرف انہوں نے اچانک ہی ریفرنڈم کا اعلان کر دیا تھا۔ پیر پگارا کو تو ان کے بیان کے فوراً بعد ۱۵ مئی کو ان کی رہائش گاہ واقع مل روڈ پر نظر بند کر دیا گیا اور ۱۶ مئی کو حفیظ پیرزادہ نے ریفرنڈم کیلئے آئین میں ترمیم کا بل پارلیمینٹ سے منظور کرا لیا جس کے مطابق ریفرنڈم کے نتائج کو کسی عدالت میں چیلنج نہ کیا جا سکتا تھا۔ اس سلسلے میں آئینی دفعات صرف ۳۰ ستمبر تک کار آمد قرار پائیں۔ طے پایا کہ ریفرنڈم بجٹ اجلاس کے بعد ہو گا اور سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کی سربراہی میں ریفرنڈم کمیشن قائم کیا جائے گا۔

سہالہ میں نظر بند مفتی محمود کی طبیعت اس روز کچھ زیادہ ہی خراب تھی۔ وہ ذیابیطس کے مریض تھے اور ان کے پاؤں کے انگوٹھے میں بھی تکلیف تھی تاہم انہوں نے کویت کے وزیر خارجہ شیخ صباح الاحمد جابر الصباح سے ڈیڑھ گھنٹہ تک ملاقات کی! اس ملاقات میں متحدہ عرب امارات کے سفیر راشد سلطان القاولی اور کویتی سفیر بھی موجود تھے۔ وزیر خارجہ ایک روز پہلے ہی اسلام آباد پہنچے تھے اور انہوں نے وزیر اعظم بھٹو کو بھی امیر کویت شیخ صباح السالم الصباح کا پیغام پہنچا دیا تھا۔ وزیر اعظم نے ریفرنڈم کی تجویز کے ذریعے جو پینترا اچانک بدلا تھا اس کی وجہ سے پی این اے کے رہنما جن سے مذاکرات کے سلسلے میں کچھ پیشرفت ہوئی تھی سخت بددل تھے۔ شیخ ریاض الخطیب بھی اس سارے کھیل سے اب بیزار نظر آتے تھے لیکن کویتی وزیر خارجہ کی مفتی محمود سے ملاقات نے ماحول کو پھر ساز گار بنانے میں مدد دی۔ ادھر ۱۷ مئی کو ایران کے وزیر خارجہ ہوشنگ انصاری بھی اسلام آباد آ پہنچے اور انہوں نے بھی مسٹر بھٹو کو شاہ ایران کا پیغام پہنچایا کہ حزب مخالف کے ساتھ سمجھوتہ کرنے میں تاخیر نہ کریں۔ ادھر سہالہ کی ملاقات میں یہ طے پایا کہ سردار قیوم کی رہائی ایک روز بعد عمل میں آ جائے گی تاکہ وہ خصوصی مشن پر روانہ ہو سکیں۔ ۱۹ مئی کو سردار قیوم رہا کر دیئے گئے۔ انہیں طیارہ بھی حکومت نے فراہم کیا اور وہ کراچی روانہ ہو گئے۔ انہوں نے اگلے روز کراچی میں اور اندرون نظر بند رہنماؤں سے ملاقاتیں کیں۔ گڑھی خیرو جیکب آباد میں وہ مولانا شاہ احمد نورانی سے سب سے پہلے ملے۔ دوپہر کا کھانا ان کے ساتھ کھایا وہ بذریعہ کار دادو پہنچے جہاں انہوں نے پروفیسر غفور سے ملاقات کی۔ شام کو وزیر اعلیٰ غلام مصطفےٰ جتوئی کے طیارے میں وہ کراچی واپس پہنچے اور رات کو انہوں نے سنٹرل جیل کراچی جا کر چودھری ظہور الٰہی سے ملاقات کی۔ اگلے روز یعنی ہفتہ ۲۱ مئی کو وہ لاہور آئے جہاں انہوں نے مولانا مودودی سے ملاقات کی۔ بعد ازاں وہ بذریعہ طیارہ اوکاڑہ پہنچے اور اصغر خان سے ملاقات کی۔ جو بے حد طویل تھی۔ رات کو وہ دوبارہ مولانا مودودی سے ملے اور پھر اسی رات وہ راولپنڈی واپس آ گئے۔ جہاں انہوں نے اپنے دورے کی رپورٹ مفتی محمود کو پیش کی۔ مذاکرات کے

باقاعدہ آغاز سے قبل ہی جو "ڈیڈلاک" ریفرنڈم کی تجویز کے سبب آیا وہ ختم ہونے کی امید بندھ رہی تھی۔
سردار قیوم کی رپورٹ خاصی حوصلہ افزا تھی۔ اصغر خان کے علاوہ تقریباً تمام رہنماؤں نے مذاکرات پر آمادگی ظاہر کی تھی۔ اصغر خان کا اصرار تھا کہ انہوں نے فوج کے نام جو خط لکھا ہے اس کے "مثبت نتائج" اب جلد برآمد ہونے ہی والے ہیں اور جرنیل بھٹو حکومت کا تختہ الٹنے والے ہیں لہٰذا بھٹو سے کسی بھی قسم کے مذاکرات کرنا بالکل فضول بات ہے۔ مذاکرات کی بجائے وہ ایجی ٹیشن کو تیز کرنے کی ضرورت پر زور دیتے رہے تاہم سردار قیوم نے انہیں اس بات پر آمادہ کر لیا کہ اگر حکومت تمام رہنماؤں کو رہا کر کے یکجا ہونے کا موقع فراہم کر دے تو مذاکرات کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ اتفاق رائے سے کر لیا جائے گا۔
سردار قیوم نے فوج کی مداخلت کے خیال کو خطرناک قرار دے کر اصغر خان سے گذارش کی کہ وہ ایسی کوئی حرکت نہ کریں جس سے فوج کو مداخلت کا موقع مل جائے۔ ۲۲ مئی کی رات سردار عبدالقیوم نے وزیر اعظم بھٹو سے ملاقات میں تمام باتیں ان کے گوش گذار کر دیں۔ اگلی صبح وہ اپنے مشن پر حیدر آباد روانہ ہو گئے جہاں وہ ولی خان اور غوث بخش بزنجو سے ملے۔ اور واپسی پر کراچی میں چوہدری ظہور الٰہی سے ملاقات کی۔ ادھر پیر پگارا نے ہری پور جیل میں اسی روز بیگم نسیم ولی خان سے ملاقات کی۔ سردار قیوم ۲۲ مئی ہی کو واپس راولپنڈی آئے اور مفتی محمود کو رپورٹ دینے کے علاوہ انہوں نے سعودی عرب کے سفیر سے بھی ملاقات کر کے انہیں معاملات سے آگاہ کیا۔ ۲۳ مئی کی صبح وہ وزیر اعظم بھٹو سے ملے۔ میں اسی روز ایک دن کے دورے پر حیدر آباد گیا تھا۔ بھٹو سے ملاقات کے دوران سعودی سفیر بھی موجود تھے۔ اسی روز پی ایل او کے سربراہ یاسر عرفات کے خصوصی ایلچی حانی الحسن بھی وزیر اعظم بھٹو کے نام پیغام لے کر پہنچے۔ جس میں یاسر عرفات نے مفاہمت کرانے کیلئے اپنی خدمات پیش کی تھیں۔ سردار قیوم نے راولپنڈی میں خان اشرف اور خانپور میں بیگم نسیم ولی خان سے ملاقات کی۔ ۲۵ مئی کو حانی الحسن نے مفتی محمود اور سعودی سفیر ریاض الخطیب سے ملاقات کی اور انہوں نے امید ظاہر کی کہ مذاکرات آئندہ ۴۸ گھنٹوں میں شروع ہو جائیں گے۔

ان نازک ترین لمحات میں دوست ممالک کی جانب سے جو کچھ پاکستان کیلئے کیا گیا اس کی مثال کسی دوسرے ملک کی تاریخ پیش نہیں کر سکتی۔ مسلسل ہنگاموں کی وجہ سے تقریباً ایک ارب ۲۵ کروڑ روپے مالیت کی املاک تباہ ہو چکی تھیں۔ ایسے میں سردار عبدالقیوم کے مشن کی کامیابی ایک بہت بڑی خوشخبری تھی۔ قومی اتحاد کے رہنماؤں کی اکثریت نے حکومت کے ساتھ مذاکرات پر آمادگی ظاہر کر دی تھی۔ اور مذاکرات میں شریک فریقوں کی یکساں تعداد میں اتفاق رائے ہو گیا تھا۔ ۲۶ مئی کو سردار عبدالقیوم نے ایک پریس کانفرنس کے ذریعے قومی اتحاد اور حکومت کے مابین مذاکرات کا باقاعدہ اعلان کیا۔
سردار صاحب ان دنوں پریس کی آنکھوں کا تارہ بنے ہوئے تھے مجھے یاد ہے جب وہ بھٹو صاحب سے ملے تو انہوں نے سردار صاحب سے کہا:

"سردار صاحب پریس میں یا تو نور جہاں کو پبلسٹی ملتی ہے یا پھر آپ کو" وزیر اعظم کو آمادگی کی یہ اطلاع سعودی سفیر شیخ ریاض الخطیب کے ذریعے پہنچائی گئی تھی جنہیں قومی اتحاد ضامن بنانا چاہتا تھا۔ دونوں فریقین نے مذاکرات کیلئے ایجنڈا تیار کرنا شروع کیا۔ کابینہ کے خصوصی اجلاس نے بھٹو کو مذاکرات کا مکمل اختیار دے دیا۔ میں ۲۸ مئی کو علماء کے ایک اجلاس سے خطاب کرنے پشاور پہنچا تھا۔ ۳۰ مئی کو اجلاس سے خطاب کیا اور علماء سے ملک میں مفاہمت کی فضاء پیدا کرنے کی اپیل کی۔ اسی روز وزیر اعظم بھٹو کا فون پہنچا۔ "فوراً آؤ..... مذاکرات میں حفیظ اور تمہیں میری معاونت کرنا ہے"۔ میں اسلام آباد پہنچا تو وزیر اعظم نے مجھے پریس کانفرنس کے ذریعے یہ اعلان کرنے کا فریضہ سونپا کہ..... مذاکرات جمعہ ۳ جون کو شروع ہوں گے۔ مسٹر بھٹو نے بیگم نسیم ولی خان کی رہائی کا حکم دے دیا تھا۔ مذاکرات کیلئے کسی جانب سے کوئی پیشگی شرط نہیں رکھی گئی تھی۔ مفتی محمود کو زبانی طور پر اس کی اطلاع دی گئی تھی کہ مذاکرات ۳ جون کو ایوان وزیر اعظم میں شروع ہوں گے۔ میں نے پریس کانفرنس میں سعودی عرب کے اس ناقابل فراموش کردار کا بھی تذکرہ کیا جو اس نے مذاکرات کیلئے سرانجام دیا تھا۔ شیخ ریاض الخطیب کو ہر بات سے پوری طرح آگاہ رکھا جا رہا تھا۔
۳۱ مئی کی صبح ساڑھے دس بجے وزیر اعظم نے فوجی حکام کا خصوصی اجلاس بھی طلب کیا تھا۔ جس میں تینوں مسلح افواج کے سربراہوں کے علاوہ چیئرمین جوائنٹ چیفس آف سٹاف کمیٹی اور کور کمانڈرز کو شرکت کرنا تھی۔

فوجی حکام کے ساتھ مذاکرات سے عین پہلے پھر خصوصی اجلاس کا حکم سن کر میرا ماتھا ٹھنکا..... کیا وزیر اعظم پھر کوئی پینترہ بدلنے والے ہیں۔ میں نے خدا سے گڑگڑا کر دعا کی.......... "الٰہی ملک کو بچانا، اب پھر کوئی نیا مسئلہ کھڑا نہ ہو جائے!"

○......○......○......○

چودھواں باب

جرنیل ایکسپوز ہوتے ہیں۔

یوں تو مذاکرات شروع ہونے سے پہلے فوجی جرنیلوں سے ہمارے کئی مشترکہ اجلاس ہو چکے تھے جن میں ریفرنڈم کی تجویز بھی زیر غور آئی ' دوبارہ **الیکشن** کرانے کی بات بھی چلی میں ان میں ضرورت سے زیادہ کبھی نہیں بولا لیکن مئی میں ہونے والے ایسے ہی ایک اجلاس میں مجھے نسبتاً مفصل اظہار خیال کرنا پڑ گیا۔

سابقہ اجلاس میں جرنیل صاحبان ریفرنڈم کی تجویز کو قبول کر چکے تھے ان کا کہنا تھا کہ وہ اسے اپنے "جوانوں" کے سامنے "سیل" کر سکیں گے مگر پی۔ این۔ اے کی طرف سے ریفرنڈم کے بائیکاٹ کے اعلان کے بعد صورت حال اچانک تبدیل ہو گئی اور جرنیل صاحبان بھی ریفرنڈم کے خلاف ہو گئے۔

اجلاس شروع ہوا اور وزیراعظم نے جنرل ضیاء الحق کو اظہار خیال کی دعوت دی تو انہوں نے کہا۔

"سر! ریفرنڈم کی تجویز تو نہیں چلے گی ' ہمارے جوان بھی اس سے مطمئن نہیں ہوئے اور ادھر اپوزیشن نے بھی اسے مسترد کر دیا ہے"

"پھر اب کیا ہو" ' مسٹر بھٹو نے کہا ' اس پر مختلف اصحاب بولتے رہے ' میری باری آئی تو مجھ سے نہ رہا گیا ' میں دل کی بات زبان پر لے آیا ' مجھے اس وقت تک فوج کے عزائم کا اندازہ ہو چلا تھا میں اس ساری ٹیم کو ایکسپوز کر دینا چاہتا تھا ' میں نے کہا۔

"مسئلے کے حل کی پانچ صورتیں ممکن تھیں۔

ایک یہ کہ یہ حکومت برقرار رہے اور آپ بدستور اس کا ساتھ دیتے رہیں ' آپ کہتے ہیں کہ یہ مشکل ہے ' آپ کو ڈر ہے کہ لا اینڈ آرڈر کے نفاذ کے لئے اب آپ کے جوان گولی چلانے سے انکاری ہیں۔

دوسری صورت یہ تھی کہ دوبارہ انتخابات کروائے جائیں وزیراعظم صاحب بھی اس سلسلے میں متذبذب ہیں اور آپ بھی کہتے ہیں کہ اس وقت جذبات اتنے مشتعل ہیں اور پولرائزیشن اتنی شدید ہے کہ الیکشن کے نتیجے میں خون خرابہ ہو گا۔

تیسرا راستہ یہ تھا کہ موجودہ حکومت مستعفی ہو جائے اور پی۔ این۔ اے اقتدار سنبھال لے ' آپ

کہتے ہیں کہ یہ صورت بھی آپ کو منظور نہیں کیونکہ پی۔ این۔ اے میں بعض ایسے عناصر شامل ہیں جو پاکستان کے وفادار نہیں ہیں۔

چوتھی صورت ریفرنڈم کی تھی جس کا اعلان آپ کی منظوری سے ہوا تھا مگر اب آپ کہتے ہیں کہ یہ بھی نہیں چلے گا ' پی۔ این۔ اے ' اسے مسترد کر چکی ہے اور آپ کے ' جوان ' بھی اس سے مطمئن نہیں ہیں۔

اب پانچویں اور آخری صورت ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ فوج "ٹیک اوور" کر لے اور جب حالات درست ہو جائیں تو آپ حضرات خود الیکشن کرا دیں اس کے علاوہ کوئی اور صورت ممکن ہی نہیں جس سے موجودہ خلفشار ختم ہو سکے اور آپ کے "جوان" بھی مطمئن ہو سکیں۔"

میں نے وزیراعظم سے اجلاس شروع ہونے سے پہلے نہ تو اپنی اس تقریر کے مضمون کا ذکر کیا تھا نہ ہی مجھے اندازہ تھا کہ اس پر ان کا رد عمل کیا ہو گا۔ مگر میری تقریر ختم ہوتے ہی انہوں نے زبردست طریقے سے میری مکمل تائید کی ' انہوں نے کہا۔

"میں مولانا سے پوری طرح اتفاق کرتا ہوں ' اب واقعی یہ ایک صورت باقی رہ گئی ہے کہ آرمی ٹیک اوور کرے اور اگر آپ لوگ چاہتے ہیں تو میں بخوشی حکومت سے دستبردار ہونے کے لئے تیار ہوں میں آج ہی لاڑکانہ چلا جاتا ہوں۔"

جنرل ضیا جو اب تک ساری گفتگو کے دوران خاموش تھے۔ بھٹو صاحب کی یہ بات سن کر اچانک اپنی نشست سے اٹھ کھڑے ہوئے انہوں نے قدرے جھکتے ہوئے اپنا ہاتھ اپنے سینے پر رکھا اور کہا۔

"NO SIR, WE HAVE NO SUCH INTENTION,WE ARETHE RIGHT ARM OF THE GOVERNMENT. WE ARE LOYAL AND WE WILL REMAIN LOYAL"

(نہیں جناب! ہمارا کوئی ایسا ارادہ نہیں ' ہم حکومت کا دایاں بازو ہیں ہم وفادار ہیں اور وفادار رہیں گے)

جنرل ضیا کی اس یقین دہانی کے بعد بات بظاہر ختم ہو گئی تھی وہ رخصت ہوئے تو وزیراعظم نے مجھے اور حفیظ پیرزادہ کو اشارہ کیا کہ ہم ان کے ساتھ چلیں ' ہم پرائم منسٹر کے رہائشی حصہ کے لان میں بچھی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ گئے تو حفیظ نے چھوٹتے ہی کہا۔

"سر مبارک ہو آج تو مسئلہ صاف ہو گیا ' فوج بھی پوری طرح آپ کے ساتھ ہے۔"

"آپ کا کیا خیال ہے؟" مسٹر بھٹو نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"مجھے حفیظ کی رائے سے اختلاف ہے" میں نے جواب دیا "میرا خیال ہے آرمی ٹیک...

کرے گی۔ "

"وہ کیسے ؟ " بھٹو صاحب نے پوچھا' میں نے کہا "اس کے دو اسباب ہیں " ایک تو آج کی میٹنگ میں جنرل ضیاء کا غیر معمولی طور پر کھڑے ہو جانا اور سینے پر ہاتھ رکھ کر یقین دلانا جو میرے نزدیک LADY PROTESTS TOO MUCH کا مصداق ہے اور جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لوگ کیموفلاج کر رہے ہیں۔ دوسرے یہ کہ جب آپ آخر میں تقریر کر رہے تھے تو میں نے دیکھا کہ دو جرنیل جنہوں نے کہنیاں میز پر ٹکا رکھی تھیں، آپ کے یہ کہنے پر کہ آپ حکومت چھوڑ کر لاڑکانہ جانے پر تیار ہیں' انہوں نے ایک دوسرے کو معنی خیز انداز میں کہنیاں ماریں' جس سے صاف ظاہر ہے کہ اندر ہی اندر کوئی کھچڑی پک رہی ہے۔ "

بھٹو بولے .... "میں تم سے پورا پورا اتفاق کرتا ہوں۔ "

بعد ازاں جب بھٹو صاحب مری میں حفاظتی نظر بندی میں تھے تو کہا کرتے تھے .... "یار ضیاء تمہاری ۳۱ مئی کی تقریر کو بھولا نہیں ہو گا۔ تم نے اس دن ان لوگوں کو پوری طرح ایکس پوز کر کے رکھ دیا تھا۔ "

لاہور ہائی کورٹ میں نصرت بھٹو کیس کے دوران اپنے بیان حلفی کے پیراگراف نمبر ۷ میں مسٹر بھٹو نے لکھا ہے۔

"IT IS PERTINENT TO POINT OUT HERE THAT IN MY MEETING WITH THE C.M.L.A. IN RAWALPINDI ON 28TH AUGUST, 1977 IN WHICH GEN CHISHTI WAS PRESENT, THE C.M.L.A WAS EXCESSIVELY HARSH ON MAULANA KAUSAR NIAZI. IN HIS CHARACTERISTIC FASHION, HE ATTACKED THE MAULANA MERCILESSLY. HE SHOWED SO MUCH HATRED FOR NIAZI THAT AT THE END OF THE DIATRIBE, THE C.M.L.A CONCLUDED BY SAYING,
"THIS IS ONE MAN I AM NOT GOING TO SPARE". ○

"یہاں یہ ذکر کرنا مناسب ہو گا کہ ۲۸ اگست ۱۹۷۷ء کو چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے ساتھ راولپنڈی میں میری ملاقات کے دوران جس میں جنرل چشتی بھی موجود تھے' چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر مولانا کوثر نیازی پر غیر معمولی طور پر گرجے برسے تھے۔ اپنے مخصوص انداز میں انہوں نے مولانا کوثر نیازی پر نہایت سفاکانہ حملے کئے۔ انہوں نے مولانا کوثر نیازی کے لئے اس قدر نفرت کا اظہار کیا کہ ان کی

○ حوالے کیلئے ملاحظہ ہو بھٹو صاحب کی کتاب "مائی پاکستان" مطبوعہ دہلی

جملہ برائیوں کا بیان اس بات پر ختم ہوا تھا کہ .... "یہ واحد آدمی ہے جسے میں کسی قیمت پر نہیں چھوڑوں گا۔ "

مسٹر بھٹو کے بیان حلفی کا یہ حصہ پیپلز پارٹی کے ان جیالے کارکنوں کی آنکھیں کھولنے کے لئے کافی ہو گا جو اپنی موجودہ چیئرپرسن اور چیئرویمن کے ایماء پر مجھ غریب پر رات دن تبرا کرتے نہیں تھکتے جن کے نزدیک میں آرمی کا آدمی ہوں' جنرل ضیاء سے میری گاڑھی چھنتی ہے' وہ میرے بغیر لقمہ بھی نہیں اٹھاتے' اور یہاں یہ بات واضح ہے کہ جب بھٹو نے یہ بیان حلفی دیا .... بیگم نصرت بھٹو مجھے پیپلز پارٹی کے قائم مقام جنرل سیکرٹری' سیکرٹری اطلاعات' مجلس عاملہ کے رکن ہی کے عہدوں سے آمرانہ انداز میں برطرف نہیں کر چکی تھیں بلکہ میری پارٹی کی رکنیت بھی ختم کی جا چکی تھی۔

ان کے بیان حلفی کا یہ حصہ اس الزام کے جواب میں ہے جو ان پر اس وقت کے مشیر برائے قومی سلامتی لیفٹیننٹ جنرل غلام حسن کی رپورٹ برائے سی۔ ایم۔ ایل۔ اے میں "داخلی صورت حال" کے عنوان سے عائد کیا گیا تھا اور مسٹر بھٹو' حفیظ پیرزادہ اور میری طرف ایک غلط بات منسوب کی گئی تھی کہ مسٹر بھٹو اور حفیظ پیرزادہ انتخابات کے بائیکاٹ کی کوشش کر رہے تھے جبکہ مولانا کوثر نیازی نے انتخابات میں حصہ لینے اور بحران پیدا نہ ہونے دینے کی کوشش میں ان کی مخالفت کی۔ درحقیقت ہمارے درمیان اس قسم کی کوئی بات کبھی نہ ہوئی تھی اور مسٹر بھٹو نے اپنے بیان حلفی کے پیراگراف نمبر ۱۲ میں بجا طور پر یہ کہا ہے کہ (پیپلز پارٹی کا کوئی فرد اس الزام کی صداقت تسلیم نہیں کر سکتا کہ میں انتخابات کا بائیکاٹ کر کے بحران پیدا کرنے کے حق میں تھا۔ انہوں نے مزید لکھا ہے کہ مجھے غلط طور پر کوثر نیازی کے خلاف حفیظ پیرزادہ کے ساتھ بریکٹ کیا گیا ہے یہ بات کوثر نیازی اور حفیظ پیرزادہ پر بھی بہتان ہے کیونکہ حفیظ میرے لئے میرے بیٹوں کی طرح ہیں۔ جبکہ کوثر نیازی ایک "دیدہ ور" ہیں۔ ان دونوں پر اس طرح کی بہتان تراشی محض پریوں کی کہانی قرار دی جا سکتی ہے۔) ○

بھٹو صاحب کے ان الفاظ کی موجودگی میں مجھ پر فوجی حکومت کے ساتھ کسی ساز باز کا الزام عائد کرنا خود مرحوم بھٹو کے ساتھ جتنی بڑی زیادتی ہے' اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے مارشل لاء کے پورے دور میں اور بعد ازاں مارشل لاء کے خاتمہ کے بعد مجھے وزارت قبول کرنے کی کتنی پیش کشیں ہوئیں ان سے واقفان حال خوب آگاہ ہیں اور یہ سلسلہ اس کے بعد شروع ہوا جب ۱۹۷۹ء میں مسٹر زیڈ۔ اے بھٹو' ان کے خاندان اور ساتھیوں کے خلاف حکومت پاکستان کا وائٹ پیپر (جسے میں بلیک پیپر کہتا ہوں) شائع ہوا' جس میں مسٹر بھٹو کے بعد سرفہرست ان کے ساتھیوں میں میرا نام تھا اور مجھ پر الزامات کے طومار باندھے جا رہے تھے۔

○ (حوالے کیلئے ملاحظہ ہو "مائی پاکستان")

ان الزامات کا قصہ بھی بڑا دلچسپ ہے' وائٹ پیپر شائع ہونے کے بعد مجھے مختلف سطحوں پر انکوائری' کے لئے بلایا گیا' میرے چھ سال کے بنک اکاؤنٹس منگوا کر ایک ایک چیک کے بارے میں مجھ سے سوالات کئے گئے' اپنا لاہور کا گھر اور پریس بیچ کر اور ایک بنک سے قرضہ لے کر میں نے اسلام آباد میں جو گھر بنایا تھا اس کے ٹھیکیدار کو بار بار بلوایا گیا۔ اور اس سے مکان کی تعمیر کے سلسلے میں میری طرف سے دیئے جانے والے حسابات کے بارے میں پوچھ گچھ کی گئی' جب کچھ نہیں ملا تو میری سابقہ وزارت نے "وائٹ پیپر کے الزامات کی روشنی میں مجھ سے خط کتابت شروع کی اور لین دین کا سوال اٹھایا' یہ خط کتابت پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے اور اس کا ایک ایک خط میرے پاس محفوظ ہے' میں نے ۷ مئی ۱۹۷۹ء کو وزارت کو جو مراسلہ بھیج دیا تھا چار سال کے بعد ۲۴ جنوری ۱۹۸۳ء کو اس کا جواب مجھے موصول ہوا اور یہ حکومت کی طرف سے مجھے آخری خط تھا' ساڑھے تین سال گزر گئے اب تک حکومت کو جرأت نہیں ہو سکی کہ وہ نام نہاد وائٹ پیپر کی روشنی میں مجھ سے ایک پیسے کا بھی تقاضا کر سکے' میرا یہ آخری خط اگر قارئین کی ضیافت طبع کے لئے یہاں درج کر دیا جائے تو نامناسب نہ ہو گا' اس سے یہ بھی اندازہ لگایا جا سکے گا کہ فریق ثانی کی بات سنے بغیر اور اسے صفائی کا موقع دیئے بغیر "وائٹ پیپر" کے' دفتر بے معنی' کتنا حقیقی وزن رکھتے ہیں' میں نے اپنے خط میں لکھا:۔

○ .... ○ .... ○

محترمی!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

میرے مراسلہ مورخہ ۷ مئی ۱۹۷۹ء کا جواب چار سال بعد آپ کے مکتوب مورخہ ۲۴ جنوری ۱۹۸۳ء کے ذریعے موصول ہوا' وزارت کی اس شاندار کارکردگی پر مبارک باد قبول فرمایئے۔

"مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ میں نے اپنے خط میں جن نکات کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرائی تھی آپ کے جواب میں ان پر کوئی روشنی نہیں ڈالی گئی۔

۱ ۔ میں نے عرض کیا تھا کہ وزارتی استحقاق کے مطابق وزارت کے خاتمہ کے بعد بھی میں پندرہ دن کی تنخواہ بمعہ الاؤنس' کرایہ مکان وغیرہ کا حق دار تھا' آپ نے اس نکتے پر کوئی بحث نہیں کی' اگر آپ کو کوئی شبہ ہو تو اس سلسلے میں آپ کیبنٹ ڈویژن سے رجوع فرمائیں۔

۲ ۔ میں نے لکھا تھا کہ میرا ایک ذاتی ریڈیو اور ٹیپ ریکارڈ سرکاری گاڑی میں لگا ہوا تھا جس کی تصدیق آپ اس وقت کے میرے ڈرائیوروں (مسٹر شیر دین اور مسٹر اللہ دین) سے کر سکتے ہیں' آپ نے ریڈیو کی موجودگی کی تصدیق کی ہے اور ریکارڈر کا ذکر گول کر دیا ہے اور اس طرح چھ سال کے بعد اب آپ فرماتے ہیں کہ میں وزارت کے دفتر میں آ کر ریڈیو وصول کر لوں' جواباً گزارش ہے کہ چھ سال کا ایک استعمال شدہ ریڈیو اب میرے کس کام کا ہے' مجھے اس کی قیمت ادا کی جائے۔ (ویسے برسبیل تذکرہ عرض کرتا ہوں کہ آپ سے یہ نہیں ہو سکا کہ اس دوران ریڈیو کسی کے ہاتھ بھجوا دیں بلکہ مجھ سے ہی خواہش کی ہے کہ میں ہی اس کی وصولی کے لئے آپ کے دربار میں حاضری دوں)

۳ ۔ میں نے لکھا تھا کہ میری نہایت قیمتی ذاتی آٹھ البمیں میرے آفس میں تھیں ان کی تصدیق (اس وقت کے او۔ ایس۔ ڈی مسٹر فیض جو اس وقت آپ کی وزارت میں کام کر رہے تھے) سے کر لی جائے' یہ مجھے لوٹا دی جائیں یا پھر ان کی

قیمت مع ہرجانہ ادا کی جائے مگر آپ نے سرے سے اس کا جواب ہی گول کر دیا ہے۔

۴ - آپ کی طرف سے پانچ ہزار آٹھ سو پچاس روپے کی ادائیگی کے مطالبے کا جواب ان نکات کے طے پاجانے کے بعد دیا جائے گا۔

۵ - جہاں تک جج ویلفیئر فنڈ سے چھبیس ہزار روپے کا میرے لئے زر مبادلہ خریدے جانے کا تعلق ہے میں اپنے ۱۹ مئی ۱۹۷۹ء کے خط میں اس کا جواب لکھ چکا ہوں جو آپ کے ڈیوٹی کلرک نے ۲۰ مئی ۱۹۷۹ء کو وصول کیا ہے از راہ کرم ایک بار پھر اس کی طرف مراجعت فرمایئے میں نے عرض کیا تھا کہ مجھے وہ دستخط دکھایئے جس کے تحت میں نے یہ رقم وصول کی ہے اگر آپ کے آفس میں میرے نام پر کسی نے یہ رقم وصول کی ہو تو میں اس کا ذمے دار نہیں' آپ یہ وصولی اس سے کیجئے' میں نے لکھا تھا کہ :۔

"میں متعلقہ فائل کی فوٹو کاپی کا انتظار کروں گا۔"

اور چار سال گزر جانے کے باوجود اب تک وہ فوٹو کاپی مجھے موصول نہیں ہوئی۔

کوثر نیازی

اب سوچتا ہوں تو مجھ پر ہونے والی ان نوازشات کی وجہ میری وہ تقریر تھی جو میں نے جرنیلوں کی اس میٹنگ میں کی تھی۔ بعد میں جب ہم گرفتار ہو کر مری آئے تو بھٹو صاحب بھی مجھ سے کہا کرتے تھے۔

"یار! تمہاری وہ تقریر جرنیل نہیں بھول سکتے' اس دن تو وہ ایکس پوز ہو کر رہ گئے تھے۔"

○ ○ ○ ○

پندرھواں باب

مذاکرات کے دوران پیپلز پارٹی مسودہ پیش کرتی ہے۔

یکم جون ۱۹۷۷ء کو شیخ ریاض الخطیب نے مسٹر بھٹو کے ساتھ آدھ گھنٹہ تک ملاقات کی اور انہیں آگاہ کیا کہ اپوزیشن ان سے یہ ضمانت چاہتی ہے کہ مسٹر بھٹو قومی اتحاد کے رہنماؤں کے ساتھ کسی سیاسی چال کا مظاہرہ نہ کریں گے اور نہ ہی مذاکرات کے دوران ہونے والی گفتگو کو عوامی سطح پر ظاہر کیا جائے گا مسٹر بھٹو نے کھلے دل سے انہیں یقین دلایا کہ وہ اپنی طرف سے یہ ضمانت پی۔ این۔ اے کو فراہم کر سکتے ہیں سعودی سفیر ہی نے در حقیقت مذاکرات کے لئے راہ ہموار کی تھی اور ان کی پوزیشن ایک حقیقی ثالث کی تھی۔ ان کے غیر جانب دارانہ اور مخلصانہ کردار ہی کے نتیجے میں قومی اتحاد کے رہنماان کی باتوں پر توجہ دیتے تھے۔ متحدہ عرب امارات کے شیخ زید بن سلطان چونکہ مسٹر بھٹو کے ذاتی دوست تھے؛ اس لئے ان کے سفیر کے رویئے سے بھی قومی اتحاد کے رہنما اس نتیجے پر پہنچے کہ ان کا کردار جانب دارانہ ہے۔ مفتی محمود کے ساتھ ان کی ایک ملاقات کے دوران تو دونوں میں اچھی خاصی جھڑپ بھی ہو گئی تھی اور مفتی صاحب نے انہیں سختی سے منع کر دیا کہ وہ آئندہ ان سے ملنے نہ آئیں۔ کویت کے وزیر خارجہ بھی بھٹو کے ذاتی دوست ہونے کی وجہ سے زیادہ متاثر کن کردار ادا نہ کر سکے لیکن شیخ ریاض الخطیب کا دونوں طرف یکساں رویہ تھا۔ وہ مسٹر بھٹو سے ملنے کے بعد سہالہ گئے جہاں انہوں نے مفتی محمود کو وہ تمام ضمانتیں فراہم کر دیں جو وہ چاہتے تھے۔ مفتی صاحب سے ان کی ملاقات ڈیڑھ گھنٹے پر محیط تھی اس دوران پیر صاحب پگارا شریف' نواب زادہ نصر اللہ خان اور سردار عبدالقیوم موجود تھے۔ مسٹر بھٹو کی منظوری کے ساتھ شیخ ریاض الخطیب نے مفتی محمود کو اس امر سے بھی آگاہ کر دیا کہ مذاکرات میں مسٹر بھٹو کی معاونت کوثر نیازی اور حفیظ پیرزادہ کریں گے چنانچہ مفتی صاحب نے بھی اپنے معاونین کے ناموں سے انہیں آگاہ کر دیا تاکہ کل ان کی باضابطہ رہائی عمل میں لائی جاسکے۔ مفتی صاحب نے باہمی صلاح مشورے سے اپنے معاونین کے طور پر نواب زادہ نصر اللہ خان اور پروفیسر غفور احمد کا نام لیا' تاہم انہوں نے شیخ ریاض الخطیب کے سامنے اس امر پر پھر اصرار کیا کہ مذاکرات کی بنیاد وہی ہوگی جو ۸ مئی کو بھٹو صاحب سے ملاقات کے دوران طے ہوئی تھی۔ جمعرات ۲ جون کو مجھے ان تمام معاملات

کے بارے میں پریس بریفنگ کرنا تھی لیکن جب اتحاد کے رہنماؤں کا یہ مطالبہ سامنے آیا کہ عوامی سطح پر اس وقت تک کوئی بات نہ لائی جائے گی جب تک حتمی سمجھوتہ نہیں ہو جاتا تو میں کشمکش و پیچ میں پڑ گیا۔ میری اور وزیر اعظم کی یہ متفقہ رائے تھی کہ ہم بات چیت کے ہر موڑ سے عوام کو کامل آگاہ رکھیں تاکہ اقتدار کی طرف للچائی ہوئی نظریں ڈالنے والے جرنیلوں کو محتاط رکھا جاسکے ہم نے یہ نقطہ نظر پی۔ این۔ اے والوں کو بھی سمجھانے کی کوشش کی لیکن بدقسمتی سے وہاں جتنی زبانیں تھیں' اتنی ہی بولیاں تھیں۔ وہاں کسی بات پر اتفاق رائے کم ہی ہوتا تھا۔ اصغر خان تو سرے سے مذاکرات ہی کے خلاف تھے اور انہوں نے جیل سے پیغام بھجوا دیا تھا کہ بھٹو حکومت سے کسی طرح کے مذاکرات کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ فوج عنقریب اقتدار سنبھالنے والی ہے جس کے بعد نوے دن کے اندر فوج انتخابات کرا دے گی۔ اس بات کی شہادت پروفیسر غفور احمد' نواب زادہ نصر اللہ خان اور سردار عبدالقیوم دے سکتے ہیں بلکہ مفتی محمود نے تو اپنی وفات سے قبل ایک بیان میں صاف طور پر کہہ دیا تھا کہ اصغر خان کے جرنیلوں سے باقاعدہ روابط تھے اور مارشل لاء انہوں نے لگوایا ہے۔ ۲ جون کو پی۔ ایم۔ ہاؤس میں وفاقی کابینہ کا پانچ گھنٹے طویل اجلاس ہوا جس کی وجہ سے رات گئے میں نے اخبار نویسوں سے ملاقات کی جو قوم کو اگلے روز شروع ہونے والے مذاکرات کے سلسلے میں کوئی خوشخبری سنانے کے لئے بے چین تھے۔ مجھے اس امر کے اعتراف میں کوئی باک نہیں کہ ہمارے قومی پریس نے اس وقت انتہائی مثبت رویے' کا مظاہرہ کرتے ہوئے حکومت اور قومی اتحاد کے درمیان مذاکرات کی کامیابی کے لئے اور مارشل لاء کا راستہ روکنے کے لئے کسی بھی قسم کے "شوشے" چھوڑنے سے مکمل گریز کیا۔ میں رات گئے انہیں صرف اتنا بتا سکا کہ یہ مذاکرات سعودی عرب کی کوششوں سے شروع ہو رہے ہیں۔ حزب اختلاف کے رہنما بہت محتاط ہیں وہ خدشات اور توہمات کے بھی شکار ہیں اتحاد کے بنیادی مطالبات میں دوبارہ انتخابات نئے الیکشن کمیشن کا قیام اور مسٹر بھٹو کا استعفیٰ شامل ہیں' لیکن اس کا جواب ان کے پاس بھی نہیں کہ اگر مسٹر بھٹو مستعفی ہو جاتے ہیں تو اقتدار کس کے حوالے کریں؟ میں نے پریس کو بتایا تھا کہ مذاکرات کے ہر مرحلے سے سعودی سفیر کو باخبر رکھا جا رہا ہے۔

اسی روز اپنی رہائی کے بعد مفتی محمود اور نواب زادہ نصر اللہ خان شیخ ریاض سے ملنے ان کی قیام گاہ پر گئے اور ایک مرتبہ پھر مذاکرات کے سلسلے میں مسٹر بھٹو کے خلوص نیت کے بارے میں ان سے ضمانت طلب کی جب کہ پروفیسر غفور اپنی جماعت کے سربراہ مولانا مودودی سے ہدایات لینے اور انہیں سارے معاملات سے آگاہ کرنے کے لئے لاہور روانہ ہو گئے۔ وہ بتا کر گئے تھے کہ کل صبح مذاکرات سے پہلے اسلام آباد پہنچ جائیں گے۔ صدر فضل الٰہی چوہدری نے اسی شام وزیر اعظم کے مشورے پر قومی اسمبلی کا بجٹ اجلاس بھی سوموار کی شام کو چھ بجے طلب کر لیا تھا۔

مذاکرات کا پہلا دور پی۔ ایم ہاؤس میں ۳ جون کو مکمل ہوا تو حکومت نے پی۔ این۔ اے کے جو مطالبات تسلیم کئے ان کے مطابق اصغر خان' مولانا شاہ احمد نورانی اور خان اشرف کو فوری طور پر رہا کر دیا گیا۔ اخبارات سے سنسر شپ ختم کر دی گئی دفعہ ۱۴۴ کے تحت تمام گرفتار شدگان کی رہائی عمل میں آ

گئی۔ تحریک کے دوران ہلاک اور زخمی ہونے والوں کو معاوضہ کی ادائیگی کا مطالبہ بھی مان لیا گیا۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے یک طرفہ پروپیگنڈہ بند کرنے کی بات بھی تسلیم کر لی گئی اور ہماری جانب سے نہایت فراخدلانہ طور پر یہ سارے ابتدائی مطالبات تسلیم کرنے کے جواب میں خیرسگالی کا مظاہرہ کرتے ہوئے قومی اتحاد نے بھی مذاکرات کے فیصلے تک ایجی ٹیشن ختم کرنے کی بات تسلیم کر لی۔ پی۔ ایم۔ ہاؤس کے آڈیٹوریم میں مذاکرات کے اختتام پر میں نے اور پروفیسر غفور احمد نے پریس بریفنگ کی جس میں متذکرہ فیصلوں پر مبنی ایک مشترکہ بیان انہوں نے پڑھ کر سنایا۔ ایک اخبار نویس نے سوال کیا "کیا دونوں فریق اب مطمئن ہیں؟"

"جی ہاں مطمئن ہیں" .... میں نے جواب دیا۔ پروفیسر غفور کی خاموشی کو "نیم رضا مندی" سمجھتے ہوئے اخبار والوں نے ان سے سوال داغ دیا، جس کے جواب میں ان کو بھی کہنا پڑا کہ "ایسی کوئی بات نہیں۔"

مذاکرات ساڑھے چار بجے شام شروع ہوئے تھے اور اس دوران وزارت داخلہ کے سیکرٹری مسٹر ایم کے چوہدری کو گرفتار شدگان کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کے لئے ایک مرتبہ پھر طلب کیا گیا جب کہ دفاعی امور پر مشاورت کے لئے جنرل ضیاالحق کو بھی بلوایا گیا لیکن انہیں بولنے کا بہت کم موقع ملا۔ مذاکرات کا دوسرا دور ۶ جون کو شروع ہونا طے پایا تھا۔ ۴ جون کو وزیراعظم نے میری ان تمام تجاویز کی منظوری دے دی جو میں نے اپریل میں انہیں پیش کی تھیں اور بعد ازاں جن پر کابینہ نے بھی اتفاق ظاہر کیا تھا۔ وزارت مذہبی امور نے اسی روز اعلان کر دیا کہ اسلامی نظریاتی کونسل از سر نو تشکیل دے دی گئی ہے اور یہ چھ ماہ کے اندر اندر تمام قوانین کو اسلامی سانچے میں ڈال کر حکومت کو پیش کر دے گی جس کے بعد اس کی تجاویز کو قانونی شکل دینے اور منظوری حاصل کرنے کے لئے قومی اسمبلی میں پیش کر دیا جائے گا۔ کونسل کے نئے چیئرمین مسٹر جسٹس حلیم مقرر کئے گئے تھے جبکہ مشیروں میں شریعت کالج دمشق کے پروفیسر شیخ محمد مصطفیٰ الزرقا، مدینہ یونیورسٹی کے ڈاکٹر معروف الدوالبی، پیرس سے ڈاکٹر محمد حمید اللہ (یہ وہی مشہور سکالر ہیں جنھوں نے جنرل ضیاالحق کو وہ تقریر لکھ کر دی تھی جو انہوں نے عالم اسلام کی نمائندگی کرتے ہوئے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں پڑھی تھی) جامع ازہر سے فقہ کے ایک سکالر، لیبیا سے اسلامی قانون کے ایک ماہر، ایران کی درسگاہ قم سے فقہ جعفریہ کے ایک سکالر شامل تھے۔ باقاعدہ ارکان میں مولانا احتشام الحق تھانوی، مولانا غلام غوث ہزاروی، مولانا ظفر احمد انصاری، مولانا جمال میاں فرنگی محلی، مولانا غلام مرشد، ادارہ تحفظ حقوق شیعہ کے رہنما مولانا سید اظہر حسن زیدی، علامہ نصیر الاجتہادی، مولانا حنیف ندوی، ڈاکٹر پروین شوکت علی اور مسٹر غلام فاروق شامل تھے۔ تین نشستیں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا مفتی محمود اور مولانا شاہ احمد نورانی کے لئے رکھی گئی تھیں۔ اسلامی نظریاتی کونسل کی اس ہیئت سے صاف ظاہر تھا کہ اس کے اراکین اور مشیر پوری طرح ایک متفق علیہ اسلامی نظام عدل کی تشکیل پر قادر تھے۔ جس

پر اجماع امت ممکن تھا۔ لیکن افسوس کہ نظام مصطفیٰ کے نفاذ کا نعرہ بلند کرنے والے قومی اتحاد نے اس وقت حقیقی نظام مصطفیٰ کے نفاذ کے اس سنہری موقع پر ذرا توجہ نہ دی بلکہ مؤخرالذکر تینوں رہنماؤں نے تو کونسل کی رکنیت تک قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ شاید یہ ان کے اسی عدم تعاون کا نتیجہ تھا کہ بعد ازاں انہیں دس سال تک مسلسل جنرل ضیاالحق کے اسلام پر وعظ سننے پڑے لیکن اسلام کے نفاذ کے لئے عملاً کوئی ایک قدم بھی نہ اٹھایا گیا۔

۵ جون کو مذاکرات کے دوسرے مرحلے سے ایک دن پہلے پروفیسر غفور نے پریس کلب میں صحافیوں سے گفتگو کرتے ہوئے یہ تو بتایا کہ وہ مذاکرات کی جلد کامیابی چاہتے ہیں لیکن کیوں؟ اس ضمن میں انہوں نے صرف اتنا کہنے پر اکتفا کیا کہ "ہمیں اصغر خان اور نورانی سے مشورہ کرنا تھا۔"

"درحقیقت انہیں مشورہ کچھ نہیں کرنا تھا بلکہ انہیں اصغر خان، مولانا شاہ احمد نورانی اور بیگم نسیم ولی خان کو زبان بند رکھنے پر آمادہ کرنا تھا۔ ہمارے پاس اطلاعات تھیں کہ اصغر خان، بیگم نسیم ولی، سردار شیر باز مزاری اور مولانا شاہ احمد نورانی حکومت کے ساتھ کسی معاہدہ کے حق میں نہیں تھے بلکہ ان کا اصرار بار بار یہی تھا کہ اب پی این اے کو مارشل لاء کا انتظار کرنا چاہئے۔ ان کا یہ اصرار ۳ جولائی کی رات پی این اے کی آخری میٹنگ تک جاری رہا جو سردار قیوم کے ہاں عشائیے کے موقع پر ہوئی تھی اور جس میں اصغر خان اور پروفیسر غفور کے مابین سخت تلخ کلامی ہوئی تھی۔ اصغر خان شروع دن سے مذاکرات کو سبوتاژ کرنے کیلئے کوشاں تھے اور قومی اتحاد کی مذاکراتی ٹیم کو ہر میٹنگ کے بعد مطعون کرتے تھے۔ انہیں یہ بھی ملال تھا کہ انہیں نہ تو پی این اے کا سربراہ بنایا گیا اور نہ ہی مذاکراتی ٹیم میں شامل کیا گیا چنانچہ وہ کھل کر کہتے تھے کہ ہم آپ لوگوں کے بھٹو سے کئے گئے کسی سمجھوتے کو قبول نہیں کریں گے۔ قومی اتحاد کی مذاکراتی ٹیم اس وقت جس مشکل صورت حال سے خود اپنی صفوں کے اندر دوچار تھی اس کی طرف سردار قیوم، پروفیسر غفور، اور مفتی محمود کبھی کبھار اشارہ کیا کرتے تھے۔

۶ جون کو دوبارہ مذاکرات گیارہ بجے دن شروع ہوئے اور تین گھنٹے تک بغیر کسی وقفے کے جاری رہے۔ بھٹو صاحب کے ساتھ حسب معمول میں اور حفیظ پیرزادہ تھے جبکہ مفتی محمود کی معاونت نوابزادہ نصراللہ خان اور پروفیسر غفور نے کی۔ ان مذاکرات میں مسئلہ کے حل کیلئے دو فارمولے زیر بحث آئے، جنہیں حتمی فیصلے تک پوشیدہ رکھنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ دونوں فارمولے مسٹر بھٹو نے پیش کئے تھے۔ ایک میں انتخابات ۷ مارچ کے نتائج کو کالعدم قرار دے کر از سر نو انتخابات پر اپنی آمادگی ظاہر کی تھی اور دوسرے فارمولے کے تحت متنازعہ نشستوں پر "ری پولنگ" کا آئیڈیا پیش کیا گیا تھا۔ پی این اے نے قیدیوں کی تفصیل مانگی جو اگلے دن مہیا کرنے کا وعدہ کر لیا گیا۔ پی این اے کو یہ بھی بتایا گیا کہ ۳ جون کی بات چیت کی روشنی میں ۲ ہزار افراد رہا کئے جا چکے ہیں پی این اے کا مسئلہ یہی تھا کہ کسی بھی فارمولے پر ان کی مذاکراتی ٹیم فیصلہ کرنے کی پوزیشن میں نہ تھی چنانچہ انہوں نے دونوں فارمولے رکھ لئے تا کہ باقی رہنماؤں سے

مشورہ کر سکیں ۔ سہ پہر کو مشترکہ پریس کانفرنس میں پروفیسر غفور نے کہا کہ...... "کوئی غیر آئینی بات نہیں ہوگی" تاہم میں نے ایک غیر ملکی صحافی کو اتنا ضرور بتایا کہ "اگر کسی بھی فارمولے پر اتفاق رائے ہو گیا تو آئین میں ضروری ترمیم کر لی جائے گی لیکن ایسا دونوں فریقوں کی مکمل رضامندی ہی سے ہوگا"۔

اسی شام مسٹر بھٹو کی صدارت میں پیپلز پارٹی کے پارلیمانی گروپ کا اجلاس بھی ہوا جس میں چیئرمین نے اراکین کو مذاکرات اور اپنے فارمولوں کے بارے میں بتایا۔ اجلاس نے اتفاق رائے سے انہیں کوئی بھی فیصلہ کرنے کا مکمل اختیار دے دیا۔ کاش! یہی پوزیشن قومی اتحاد کی طرف سے مفتی محمود کو بھی حاصل ہوتی!

اسی شام قومی اسمبلی کا بجٹ اجلاس بھی شروع ہوا۔ اور میاں طفیل محمد نے جو راولپنڈی پہنچ چکے تھے سعودی سفیر کے علاوہ کویت کے سفیر یوسف عبداللطیف عبدالرزاق سے بھی ملاقات کی۔ ۷ جون کو جو مذاکرات ہوئے ان میں پی این اے نے ہمارے دیئے ہوئے دو فارمولوں میں سے از سر نو انتخابات کا فارمولا قبول کر لیا۔ چنانچہ ری پولنگ کا فارمولا ختم کر دیا گیا۔ فارمولے کی جزوی تفصیلات طے کرنے کیلئے پروفیسر غفور اور حفیظ پیرزادہ پر مشتمل سب کمیٹی تشکیل دیدی گئی جس کا کام از سر نو انتخابات کے انتظامات اور آئین میں ضروری ترمیم کیلئے کارروائی کرنا تھا۔ سب کمیٹی کا اجلاس اسی روز ہونا بھی طے پایا۔ مفتی محمود، نوابزادہ نصراللہ اور پروفیسر غفور نے اس دن صاف طور پر بتا دیا کہ اصغر خان کے عزائم کیا ہیں اور کس طرح ان کی صفوں میں موجود سیاستدان مارشل لاء کا انتظار کر رہے ہیں۔ اس لئے معاہدے میں تاخیر نہیں ہونی چاہیئے مذاکرات کے بعد میں نے پی ایم ہاؤس ہی میں اخبار نویسوں کے سامنے اعلان کیا کہ کراچی اور حیدر آباد سے جزوی مارشل لاء فوری طور پر ختم کر دیا گیا ہے اور مارشل لاء کے تحت جو لوگ گرفتار کئے گئے تھے وہ رہا کئے جا رہے ہیں، ان کی تعداد بارہ ہزار نو سو تھی ان پر مارشل لاء کے تحت مقدمات بھی ختم کر دیئے گئے تھے اور سزائیں منسوخ کر دی گئی تھیں مذاکرات میں اتحاد نے انتخابات اکتوبر تک کرانے کا مطالبہ کیا تھا جبکہ ہمارا موقف تھا کہ اس کیلئے کم از کم ایک سال ملنا چاہیئے تاکہ عوامی سطح پر پھیلی ہوئی نفرتوں کی گرد بیٹھ سکے اور انتخابات پر امن فضا میں ہوں۔ اتحاد کے رہنماؤں کا گذشتہ شب جو اجلاس ہوا تھا، اصغر خان اس میں سرے سے شریک ہی نہ ہوئے تھے اور ان کی نمائندگی ملک وزیر علی نے کی تھی۔ وہ مذاکرات کو کوئی اہمیت دینے پر آمادہ ہی نہ تھے ان کے نزدیک اصل حل صرف مارشل لاء کا نفاذ تھا۔ انہوں نے اسی روز پشاور میں ایک پریس کانفرنس میں دھمکی دی کہ اگر تمام گرفتار شدگان فوراً رہا نہ کئے گئے تو میں اکیلا ہی ان کیلئے پوری قوت سے تحریک چلاؤں گا۔ گرفتار شدگان کی رہائی تو ایک بہانہ تھی در حقیقت وہ مذاکرات کو سبوتاژ کرنے اور پی این اے سے اپنا راستہ علیحدہ کرنے کی راہیں تلاش کر رہے تھے۔ ادھر حضرت مولانا شاہ احمد نورانی نے بھی اسی روز ہری پور دار العلوم اسلامیہ رحمانیہ میں ایک جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے کہہ دیا...... "بھٹو کا استعفیٰ ہمارا لازمی مطالبہ ہے" ۔ نیز یہ کہ مذاکرات کی ناکامی کی

صورت میں تحریک پوری شدت سے چلائی جائے گی۔

یہ ایک طرفہ تماشہ تھا کہ مذاکراتی ٹیم بھٹو کے ساتھ انہیں وزیر اعظم تسلیم کرتے ہوئے مذاکرات کر رہی تھی اور یہ مذاکرات ایوان وزیر اعظم میں ہو رہے تھے مفتی محمود نے بھٹو سے مستعفی ہونے کا کوئی مطالبہ نہ کیا تھا بلکہ نئے انتخابات کی جزئیات کی تیاری کا کام سب کمیٹی پر چھوڑ دیا گیا تھا لیکن اتحاد کے دو اہم اراکین مذاکراتی ٹیم سے ہٹ کر بھٹو کے استعفیٰ اور تحریک چلانے کی باتیں کر رہے تھے۔ جس کا نتیجہ اصغر خان کو تو پانچ سال کی نظر بندی کی صورت میں بھگتنا پڑا جو ان کیلئے مارشل لاء کا تحفہ تھی اور مولانا شاہ احمد نورانی کو مارشل لاء کا خمیازہ اپنی پارٹی کی ٹوٹ پھوٹ کی صورت میں بھگتنا پڑا۔ ظہور الحسن بھوپالی اور حاجی حنیف طیب نے انہیں ناقابل تلافی نقصان پہنچایا اور جماعت اسلامی کے مقابلے میں کراچی اور حیدر آباد ایسے ان کے محفوظ قلعوں میں دراڑیں پڑ گئیں۔

پی این اے نے اپنے قانونی ماہرین راولپنڈی میں یکجا کر لئے تھے جنہیں سب کمیٹی کے اجلاس سے پہلے انتخابات کے فارمولے کی ڈرافٹنگ کرنا تھی۔ ۸۔ جون کو سب کمیٹی کا اجلاس سٹیٹ بنک بلڈنگ میں ہوا جس میں پروفیسر غفور نے گیارہ رکنی قانونی ماہرین کی تیار کردہ رپورٹ حفیظ پیرزادہ کے سامنے رکھ دی جسے دیکھ کر وہ چکرا کر رہ گئے۔ اس میں انتخابات کے انعقاد کی تاریخ، انتخابی مشینری، الیکشن کمیشن کی نوعیت اور اس کے اختیارات، دھاندلی کے سدباب کیلئے قوانین، اسمبلیاں ٹوٹنے کے بعد عبوری مدت کیلئے وفاقی اور صوبائی حکومتوں کے ڈھانچوں کی تشکیل اور آئین میں ترامیم تک شامل تھیں۔ حفیظ پیرزادہ نے غالباً ان مسائل پر ابھی اس قدر غور و خوض نہ کیا تھا جتنا اتحاد کی طرف سے محمود علی قصوری اور ایس ایم ظفر کر چکے تھے چنانچہ نتیجہ یہ نکلا کہ سب کمیٹی متعدد امور طے ہی نہ کر سکی۔ اور اختلافی امور دوبارہ اعلیٰ سطحی اجلاس میں پیش ہونے کیلئے چھوڑ دیئے گئے۔ پروفیسر غفور نے سعودی عرب اور کویت کے سفیروں سے ملاقات کر کے انہیں بھی اپنے مطالبات کی تفصیل سے آگاہ کر دیا۔ جبکہ مفتی محمود نے اخبار نویسوں سے گفتگو کرتے ہوئے صاف کہہ دیا کہ "ضروری تحفظات کے بغیر انتخابات ہمارے لئے قابل قبول نہ ہوں گے"۔ ...... سانپ کے کاٹے تھے سو رسی سے بھی ڈر رہے تھے۔ انہوں نے خود بھی ایک گھنٹہ تک سعودی سفیر سے ملاقات کی جس میں نوابزادہ نصراللہ خان اور شاہ احمد نورانی ان کے ساتھ تھے۔ مذاکرات شروع ہونے کے بعد یہ ان کی شیخ ریاض الخطیب سے پہلی ملاقات تھی جس میں انہوں نے سعودی سفیر کو بتایا کہ وہ کسی صورت بھی اسمبلی کے رواں اجلاس میں شریک نہیں ہوں گے۔ مفتی صاحب نے عوام سے بھی اپیل کر دی کہ مطالبات تسلیم کرانے کیلئے جمعہ کو خصوصی دعائیں مانگی جائیں۔ ادھر شیخ ریاض الخطیب نے ساری صورتحال سے شاہ خالد کو فون پر آگاہ کیا کہ ڈور ایک مرتبہ پھر الجھتی نظر آ رہی ہے۔

میری ذاتی رائے میں اگر حفیظ پیرزادہ اس وقت پی این اے کے قانونی ماہرین کے مقابل مات نہ کھاجاتے اور یہ ان کے معیار کو مدنظر رکھتے ہوئے خود بھی کچھ تیاری کر لیتے تو مذاکرات میں وہ "ڈیڈ لاک" پیدا نہ ہوتا جو ۹ جون کے مذاکرات میں پوری شدت سے ابھر کر سامنے آیا۔ اعلیٰ سطحی اجلاس میں جو اڑھائی گھنٹے جاری رہا' پروفیسر غفور انتخابی تحفظات کی اپنی پیش کردہ شقوں پر اڑے رہے اور حفیظ پیرزادہ ان کی پیش کی ہوئی شقوں پر اعتراضات اٹھاتے رہے یوں اختلافات ایک مرتبہ پھر بڑھنا شروع ہو گئے حتیٰ کہ مفتی محمود نے دھمکی دے دی کہ اگر آج ہی یہ اختلافات دور نہ ہوئے تو کل ہم مذاکرات میں شریک نہیں ہوں گے وزیر اعظم بھٹو بھی ذہنی طور پر انتخابی تحفظات کی فہرست دیکھ کر الجھ سے گئے تھے۔ اس دن ماحول میں بے حد کشیدگی تھی چنانچہ جب مذاکرات کے اختتام پر مشترکہ پریس کانفرنس میں ایک صحافی نے مجھ سے پوچھا کہ "اب آپ لوگ سمجھوتے سے کتنے دور ہیں؟" تو میں نے اسے یہی جواب دیا کہ "جتنے آپ اور میں!" صحافی مذکورہ بالا اور میرے درمیان تقریباً ۳ سوفٹ کا فاصلہ تھا۔ اس دن کے مذاکرات میں نوابزادہ نصراللہ شریک ہی نہ ہوئے تھے۔ ان کے خیال میں حفیظ پیرزادہ معاملات کو الجھا رہے تھے اور بھٹو صاحب گویا "وقت گذاری" کیلئے حفیظ کے کھیل کو طول دے رہے تھے۔ کاش اس وقت اتحاد کے مطالبہ تحفظات کو وزارت قانون میں بیٹھے بیوروکریٹس کی بجائے بھٹو صاحب بھی پارٹی میں موجود آئین اور قانون کے ماہرین پر مشتمل کسی کمیٹی کے حوالے کر دیتے تو یہ معاملہ اتنا طول نہ کھینچتا۔

عین اسی روز ملک غلام مصطفےٰ کھر نے مسلم لیگ چھوڑ کر پیپلز پارٹی میں دوبارہ شمولیت کا اعلان کر دیا اور وزیر اعظم نے انہیں فوری طور پر اپنا سیاسی مشیر مقرر کر دیا۔ انہوں نے اپنی تقرری کے بعد جو پہلا بیان دیا اس میں تمام دوستوں سے متحد ہو کر "ملک دشمن" قوتوں کا مقابلہ کرنے کی اپیل کی گئی تھی اور بھٹو کے ہاتھ مضبوط کرنے کیلئے کہا گیا تھا۔

مصطفےٰ کھر کے مزاج کے پیش نظر قومی اتحاد کے رہنما یکدم بدک اٹھے اور انہوں نے یہی سمجھا کہ شاید مسٹر بھٹو اب کھر کے ذریعے انہیں ہراساں کرنے کی مہم شروع کرنے والے ہیں۔ مصطفےٰ کھر قومی اتحاد کے رہنماؤں کیلئے ایک خاصا دہشت زدہ کر دینے والا نام تھا۔ انہیں شک ہوا کہ مسٹر بھٹو اب دوبارہ کھر کو میدان میں لا کر ان کے ساتھ محاذ آرائی کا کوئی نیا باب کھولنے والے ہیں' وہ اس اقدام سے اتنے الرجک ہوئے کہ جمعہ ۷ اجون کو جب کھر نے وزیر اعظم کے خصوصی معاون برائے سیاسی امور کے عہدے کا حلف اٹھایا تو ان کی اس تقرری کے خلاف قومی اتحاد کے رہنما انور جاوید نے لاہور ہائیکورٹ میں ۲۸ جون کو باقاعدہ ایک رٹ دائر کر دی تھی۔

بہرحال جمعہ ۱۰ جون کو مذاکرات کا پانچواں اعلیٰ سطحی اجلاس پونے دو گھنٹے میں ختم ہو گیا اس میں قومی اتحاد نے اپنے مطالبات پر اصرار جاری رکھا جبکہ وزیر اعظم بھٹو نے چھ بنیادی اختلافات پر غور و خوض کیلئے مہلت طلب کی۔ یہ مختصر ترین اجلاس تھا جس کا مشترکہ بیان جو پریس کانفرنس میں پڑھ کر سنایا گیا صرف

ساڑھے تین سطروں پر مشتمل تھا طے پایا کہ چھٹا اجلاس اب اتوار کی شام کو رکھا جائے کیونکہ اگلے روز بجٹ اجلاس تھا شام کو اسمبلی میں وزراء کا موجود ہونا ضروری تھا۔

ہفتہ ۱۱ جون کو راولپنڈی بار ایسوسی ایشن سے خطاب کرتے ہوئے اصغر خان نے دھمکی دی کہ عوام اب مذاکرات کا زیادہ انتظار نہیں کریں گے۔ انہوں نے ایک بار پھر پہیہ جام ہڑتال قسم کی زبان استعمال کی۔ ادھر پروفیسر غفور نے بھی ایک پریس کانفرنس میں صورتحال پر شدید ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ مفتی محمود نواب زادہ نصراللہ خان اور خان اشرف نے شیخ ریاض الخطیب سے ملاقات کر کے شکائت کی کہ حفیظ پیرزادہ خود مسٹر بھٹو کے ایماء پر اختلافی مسائل اٹھا رہا ہے اور حکومت کے ارادے درست نظر نہیں آتے۔ شام کو حفیظ نے اسمبلی میں بجٹ پیش کیا شاید قومی اتحاد کی تجاویز پر عدم توجہی کی ایک وجہ بجٹ کی تیاری بھی تھی جس میں حفیظ کو بہت وقت دینا پڑا تھا۔

اتوار ۱۲ جون کو سعودی سفیر شیخ ریاض نے مسٹر بھٹو اور مفتی محمود سے الگ الگ ملاقاتیں کر کے دونوں کو "خود دیکھ لو کچھ دو" کے فارمولے کے تحت فوراً سمجھوتہ کرنے کا مشورہ دیا۔ کویت کے سفیر نے بھی اس روز وزیر اعظم سے ملاقات کی۔ ساڑھے پانچ بجے پی این اے کی مذاکراتی ٹیم کے ساتھ چھٹا اجلاس شروع ہوا جس میں حکومت کی طرف سے قومی اتحاد کی تجاویز کا وہ جواب دیا گیا جو وزارت قانون نے ڈرافٹ کیا تھا۔ مفتی محمود نے مسودہ رکھ لیا اور بتایا کہ وہ پی این اے کے سربراہی اجلاس میں اس پر غور کر کے کل ہمیں جواب دیں گے۔ ان کے جواب پر ہی ہمارے ردّعمل کا دارومدار تھا اور کوئی حتمی فیصلہ بھی تب ہی کیا جا سکتا تھا۔ امید تھی کہ منگل تک مذاکرات کا نتیجہ نکل آئے گا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ حکومت کی جانب سے سمجھوتے کا جو دوسرا مسودہ دیا گیا' وہ ڈیڈلاک ختم کرنے کی ایک بھرپور کوشش تھی لیکن شاید قومی اتحاد کے رہنماؤں کے سر پر اصغر خان کی دھمکیوں کی تلوار لٹکی ہوئی تھی جو وہ تمام تر جزئیات کے ساتھ اپنے مسودے کو من و عن منوانا چاہتے تھے۔ ہم پر ان کی بے بسی بھی عیاں تھی لیکن ہمارے پاس اس کا کوئی علاج نہ تھا۔

۱۲ جون کو حکومت نے سمجھوتے کا جو مسودہ قومی اتحاد کو دیا اس کا مکمل متن یہ تھا۔

"یہ سمجھوتہ وزیر اعظم پاکستان و چیئرمین پیپلز پارٹی مسٹر ذوالفقار علی بھٹو اور منتخب رکن قومی اسمبلی وصدر پاکستان قومی اتحاد مولانا مفتی محمود کے درمیان طے پایا۔ جنہیں بالترتیب آئندہ سطور میں فریق اول وفریق ثانی بیان کیا جائے گا۔ اس سمجھوتہ کا متن حسب ذیل ہے۔

جیسا کہ پاکستان کے پہلے عام انتخابات کے بعد جو مارچ ۱۹۷۷ء میں منعقد ہوئے سیاسی بحران پیدا ہو چکا ہے۔

اور جیسا کہ اس سمجھوتے کے فریق اپنی انفرادی اور نمائندہ حیثیت میں ایک پرامن حل کے متلاشی تھے اور جیسا کہ اس سمجھوتہ میں شامل فریقین کے درمیان ان کی نمائندہ حیثیت میں مذاکرات ہوئے جس

میں فریق اول کی معاونت عبدالحفیظ پیرزادہ اور مولانا کوثر نیازی نے کی نوابزادہ نصراللہ خان اور پروفیسر غفور احمد نے فریق ثانی کی معاونت کی اور جیسا کہ فریق اول نے حالات کو پر سکون بنانے اور معمول پر لانے کے لئے پاکستان قومی اتحاد کے تمام رہنماؤں کو رہا کر دینے کا حکم جاری کیا۔ کراچی ڈویژن اور لاہور اور حیدر آباد کے اضلاع سے مارشل لاء اٹھالیا۔ ان تمام افراد کی اعانت کی اجازت دی جن کی جانیں ضائع ہوئیں یا شدید زخمی ہوئے کرفیو اور دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی کرنے والے تمام افراد کی رہائی کے احکامات جاری کئے ان کے ساتھ ۵۲۲ افراد کے سوا ان تمام افراد کو رہا کرنے کے احکامات بھی جاری کئے گئے جو معقول الزامات کے تحت زیر حراست تھے۔

اور جیسا کہ فریق ثانی نے احتجاجی تحریک معطل کرنے پر آمادگی ظاہر کر دی ہے جو اس نے مارچ ۱۹۷۷ء کے پہلے انتخابات کے بعد شروع کی تھی۔

اور جیسا کہ دیانت دارانہ، منصفانہ اور صاف ستھرے انتخابات کے انعقاد کے لئے ضروری پُر امن اور باہمی اعتماد کا ماحول پیدا کرنے کے لئے فریقین نے یہ سمجھوتہ کیا ہے اس سمجھوتہ کی شرائط حسب ذیل ہوں گی۔

۱ - پاکستان کی قومی اسمبلی اور چاروں صوبوں کی صوبائی اسمبلیاں مورخہ ...... کو توڑ دی جائیں گی۔ قومی اسمبلی اس ضمن میں ضروری ترامیم لازماً منظور کرے گی نیز ایسے قوانین بھی منظور کئے جائیں جو اس سمجھوتہ کے نتیجہ میں ضروری ہوں گے۔

۲ - صوبائی وزراء اعلیٰ کی سربراہی میں قائم ہونے والی حکومتیں پیراگراف میں درج تاریخ پر کام کرنا بند کر دیں گی۔ اس کے نتیجے کے طور پر ایسی ضروری ترامیم قومی اسمبلی میں منظور کی جائیں گی جو آئین کے آرٹیکل ۲۳۴ کے ممکنہ حد تک قریب ترین ہوں۔

۳ - قومی اسمبلی کے انتخابات ۷ اکتوبر ۱۹۷۷ء کو منعقد کئے جائیں گے۔ صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات بھی اسی دن ہوں گے یا قومی اسمبلی کے انتخابات کے تین دن کے اندر اندر منعقد کئے جائیں گے۔

۴ - سینٹ کے وہ ارکان جو ۵ اگست ۱۹۷۷ء کو اپنے عہدہ سے ریٹائرڈ ہو گئے۔ اپنے عہدہ پر برقرار رہیں گے۔ سینٹ کے دیگر ارکان جنہیں قومی اور صوبائی اسمبلیوں نے منتخب کیا ہے پیراگراف تین کے مطابق قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات کے بعد مستعفی ہو جائیں گے۔

۵ - ۶ جنوری ۱۹۷۷ء کے بعد احتجاجی تحریک گڑبڑ اور دیگر تمام قوانین بشمول امتناعی نظربندی کے قوانین کے تحت گرفتار یا نظربند کئے جانے والے افراد کو رہا کر دئے گئے ہیں یا انہیں فوراً رہا کر دیا جائے گا۔ سوائے غنڈوں اور سماج دشمن عناصر کے جن پر نہایت سنگین جرائم بشمول قتل، لوٹ مار، زنا بالجبر اور آتش زدگی کے الزامات عائد کئے گئے ہیں انہیں رہا نہیں کیا جائے گا۔ تاہم فریقین کے ایک ایک نمائندہ پر مشتمل ایک کمیٹی قائم کی جائے گی جو ان کے خلاف الزامات کا جائزہ لے گی۔ کہ یہ طے کیا جا سکے کہ ان میں سے کسے رہا کیا جا سکتا ہے۔

۶ - اس کمیٹی کے ارکان میں پیدا ہونے والے کسی بھی اختلاف رائے کو عملدرآمد کونسل کے پاس بھیج دیا جائے گا۔

۷ - ۱۴ مارچ ۱۹۷۷ء کے بعد رونما ہونے والی تحریک یا گڑبڑ کے دوران متاثر ہونے والے ان تمام

افراد کو معقول معاوضہ دیا جائے گا جو شدید طور پر زخمی ہوئے جن کی جائیداد تباہ ہو گئی یا اسے شدید نقصان پہنچا نیز اسی انداز میں جان بحق ہونے والے افراد کے قانونی ورثا کو بھی معاوضہ دیا جائے گا۔ معاوضہ کا تعین حکومت پاکستان کرے گی ایسا معاوضہ یا امداد پارٹی کے ساتھ تعلق سے ماورا ہو کر ان تمام افراد کو دیا جائے گا جو جان بحق ہوئے جو شدید زخمی ہوئے یا ان کی جائیداد تباہ ہوئی یا اسے نقصان پہنچا۔

۸ - اس سمجھوتہ پر دستخط ہوتے ہی آئین کے آرٹیکل ۲۳۲ اور آرٹیکل ۲۸۰ کے تحت نافذ کی جانے والی ہنگامی حالت فوراً ختم کر دی جائے گی

۹ - سمجھوتہ پر دستخط ہوتے ہی ڈیفنس آف پاکستان آرڈیننس ختم کر دیا جائے گا نیز اس قانون کے تحت وضع کئے جانے والے ضوابط اور احکام بھی ختم کر دئے جائیں گے تاہم اس قانون کے تحت دشمن کی جائیداد اور حصول جائیداد سے متعلق قانون اور ضابطہ برقرار رہے گا۔

۱۰ - سمجھوتہ پر دستخط ہوتے ہی ڈیفنس آف پاکستان آرڈیننس کے تحت قائم ہونے اور کام کرنے والے ٹریبونل فوراً کام کرنا بند کر دیں گے اور ان کے زیر سماعت مقدمات فوری طور پر عام عدالتوں میں منتقل کر دئے جائیں گے۔ جہاں ان پر کارروائی عام قانون کے مطابق ہو گی۔

۱۱ - سمجھوتہ پر دستخط ہوتے ہی پاکستان آرمی ایکٹ میں ۲۱ اپریل ۱۹۷۷ء کے مطابق ترامیم جو ایکٹ ایکس ۱۹۷۷ء کے تحت کی گئیں ختم کر دی جائیں گی تاہم ان کے نتیجہ میں وہ اپیلیں متاثر نہیں ہوں گی۔ جو زیر سماعت ہوں گی یا زیر سماعت آئیں گی۔

۱۲ - سمجھوتہ پر دستخط ہونے کے چار ماہ بعد مسلح افواج صوبہ بلوچستان میں سول انتظامیہ کی امداد کے طور پر کام کرنا بند کر دیں گی۔

۱۳ - عوامی نمائندگی کے قانون میں حسب ذیل ترامیم کی جائیں گی۔

(ا) مارچ ۱۹۷۷ء کے انتخابات کے نتیجہ میں دائر کی جانے والی اور زیر سماعت اپیلیں ختم ہو جائیں گی۔

(ب) آئندہ انتخابات کے نتائج الیکشن کمیشن کے اعلان سے قبل ریڈیو ٹیلی ویژن سے نشر اور اخبارات میں شائع نہیں کئے جائیں گے۔

(ج) الیکشن کمیشن مسلح افواج اور سول آرمڈ فورسز بشمول پولیس کو انتخابی مہم کے دوران اور پولنگ کے موقع پر امن عامہ برقرار رکھنے کے لئے طلب کر سکے گا۔

۱۴ - فریقین سمجھوتہ کے ایک ہفتہ کے اندر ایک ضابطہ اخلاق تیار کریں گے جس میں حسب ذیل امور شامل کئے جائیں گے۔

(ا) انتخابی مہم کے لئے قواعد۔

(ب) انتخاب کے دوران تمام قانونی سیاسی سرگرمیوں کی بلا روک ٹوک اجازت۔

(ج) انتخابی مہم کے دوران اخبارات، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے قواعد کار۔

(د) آزادی صحافت جس میں ان اخبارات کے ڈیکلریشن کی بحالی بھی شامل ہے جن کی اشاعت پر پابندی عائد کی جا چکی ہے۔

(ر) انتخابی مہم کے دوران ارتکاب جرم پر کسی بھی شخص کو گرفتار و نظربند کیا جا سکے گا

اور اس کے خلاف قانونی چارہ جوئی کی جاسکے گی۔

(س) انتخابی مہم کے دوران عام جلسے منعقد کئے جاسکیں گے جلوس نکالے جاسکیں گے۔

(ش) سرکاری تحویل میں موجودہ ذرائع ابلاغ کے ذریعہ سپریم کورٹ آف پاکستان کے فیصلہ کے مطابق غیر جانبداری اور معقول توازن قائم رکھا جائے گا۔

۱۵ ۔ آئین پاکستان میں اس طرح ترمیم کی جائے گی کہ

(ا) شیڈول میں طے شدہ ترامیم کو آئین میں شامل کیا جائے گا۔

(ب) پیراگراف ۱۶ ۔ ۱۷ کے مطابق الیکشن کمیشن کی تشکیل نو

۱۶ ۔ الیکشن کمیشن ایک چیئرمین اور چار ارکان پر مشتمل ہو گا۔ چیئرمین کے لئے وہی استعداد درکار ہوں گی جس کا آئین کے آرٹیکل ۲۱۳ میں ذکر کیا گیا ہے ایک رکن ہائی کورٹ کا جج ہو گا۔ یہ تقرریاں صدر پاکستان فریق اول کے مشورے کریگا تاہم فریق اول فریق ثانی سے مشورہ کرے گا۔

۱۷ ۔ ایک نیا چیف الیکشن کمشنر مقرر کیا جائے گا۔

۱۸ ۔ اس سمجھوتہ پر عمل در آمد کے دوران فریقین کے درمیان کوئی تنازعہ یا جھگڑا پیدا ہو جائے تو تصفیہ کے لئے عمل در آمد کونسل کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ جو پیراگراف ۱۹ کے تحت وجود میں آئے گی۔

۱۹ ۔ عمل در آمد کونسل دس (۱۰) ارکان پر مشتمل ہو گی جس میں چیئرمین بھی شامل ہو گا۔ کونسل کی ہیت اور طریق کار حسب ذیل ہو گا۔

(ا) وزیراعظم پاکستان ذوالفقار علی بھٹو کونسل کے چیئرمین ہوں گے۔

(ب) چیئرمین کی غیر حاضری کے دوران مولانا مفتی محمود اجلاس کی صدارت کریں گے۔

(ج) مسٹر ذوالفقار علی بھٹو اور مولانا مفتی محمود میں سے ہر ایک چار چار افراد کونسل کے رکن کی حیثیت سے نامزد کرے گا جو پہلے عام انتخابات سے منتخب ہونے والی قومی اسمبلی یا پارلیمینٹ کے ارکان یا منتخب ارکان میں سے ہوں گے۔

(د) کونسل کے متفقہ فیصلہ پر فریق اول عمل در آمد کرے گا۔ اس مقصد کے لئے وزیراعظم کی حیثیت سے اپنے آئینی اختیارات کو بروئے کار لائے گا۔

۲۰ عمل در آمد کونسل دیانت دارانہ ' منصفانہ اور صاف ستھرے انتخابات کے انعقاد اور ان کی نگرانی کرے گی۔ عمل در آمد کونسل اس سلسلے میں پیدا ہونے والے معاملات یا ان سے متعلقہ معاملات پر براہ راست یا کسی فریق کی شکایت پر کارروائی کر سکے گی۔

۲۱ اگر عمل در آمد کونسل کسی متفقہ فیصلہ پر نہ پہنچ سکے تو وہ معاملہ ثالثی کے لئے سپریم کورٹ کے سامنے بھیج دیا جائے گا۔

۲۲ ایسے تمام معاملات جو پیراگراف ۲۱ کے تحت سپریم کورٹ کو سنے بھیجے جائیں گے ان کے فیصلہ کے لئے چیف جسٹس آف پاکستان سپریم کورٹ کے تین ججوں کو بطور ثالث مقرر کریں گے چیف جسٹس خود اپنی ذات کو بھی بحیثیت ثالث مقرر کر سکیں گے۔

۲۳ چیف جسٹس کے متعین کردہ ثالث فریقین کے نامزد افراد کے مؤقف کی سماعت کریں گے اور ۷۲ گھنٹوں کے اندر اندر اس پر فیصلہ دیں گے ثالثوں کے روبرو تمام سماعت اور کارروائی بند کمرے میں ہو گی۔

۲۴ ثالث کارروائی کے دوران شہادتیں قلم بند کرنے کے پابند نہیں ہوں گے نیز فیصلہ کے لئے نہایت مختصر وجوہات تحریر کریں گے۔

نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن

سوموار ۱۳۔ جون کو منعقد ہونے والا اجلاس مذاکرات کیلئے فیصلہ کن موڑ کی حیثیت رکھتا تھا۔ مذاکرات واضح طور پر ناکام ہوتے نظر آ رہے تھے لیکن ہر فریق کی کوشش یہ تھی کہ مذاکرات کی ناکامی کا الزام اس کے سر نہ آئے۔ ہمارے درمیان جن امور پر اتفاق رائے ہوا ان میں ہنگامی حالت کا خاتمہ، سیاسی قیدیوں کی رہائی اور صوبوں میں ایسے گورنروں کی تقرریاں شامل تھیں جن پر پی این اے حکومت کے ساتھ اتفاق کرے۔ الیکشن کمیشن کی تشکیل نو کا مطالبہ بھی مان لیا گیا تھا۔ اسمبلیاں توڑنے پر بھی اختلاف نہ تھا۔ جن نکات پر اختلاف تھا ان میں انتخابات کی تاریخ کا تعین تھا۔ پی این اے ۴۰ دن کے اندر اندر نئے انتخابات چاہتی تھی جبکہ ہمارے سامنے جو انتظامی دشواریاں تھیں ان کے پیش نظر نومبر، دسمبر سے پہلے انتخابات کا انعقاد ممکن ہی نہ تھا۔ پی این اے کی مذاکراتی ٹیم کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ خود کوئی فیصلہ کرنے یا سمجھوتے پر دستخط کرنے کی پوزیشن میں نہ تھی ہر معاملہ یہ کہہ کر مؤخر کر دیا جاتا تھا کہ ہم اپنے ساتھیوں سے مشورہ کر کے جواب دیں گے۔ پھر وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ "ساتھیوں" کے سامنے جانے کیلئے ان کے پاس کچھ نہ کچھ ایسی چیزیں موجود ہوں جو "ساتھیوں" اور عوام میں ان کا بھرم قائم رکھ سکیں۔ اگر یہ "ساتھیوں کا خوف" دامن گیر نہ ہوتا تو شاید قومی اتحاد کے رہنما بہت پہلے متفقہ سمجھوتے پر پہنچ جاتے۔

پی این اے کی مذاکراتی ٹیم کی بے بسی اس سے عیاں تھی کہ وہ پی این اے کونسل سے جو کچھ لکھوا کر لاتی تھی، اس سے ہٹ کر کسی پہلو پر کوئی یقین دہانی ہی نہیں کرا سکتی تھی ایک اجلاس کے بعد پروفیسر غفور احمد نے نہایت گلوگیر لہجے میں کہا...... "ہم کیا کریں؟ ہمارے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے ہیں۔ ہماری صفوں میں موجود ہارڈ لائنرز کے ہمارے ساتھ سلوک کا آپ لوگ اندازہ نہیں کر سکتے، وہ ہمیں اس طرح دیکھتے ہیں جیسے ہم آپ سے اندرون خانہ کوئی خفیہ سودے بازی کر لیں گے"۔

پی این اے کے یہ ہارڈ لائنرز سردار شیرباز مزاری، بیگم نسیم ولی خان اور اصغر خان تھے جبکہ مولانا شاہ احمد نورانی کا وزن بھی ان کے پلڑے میں تھا۔ سردار شیرباز مزاری، بیگم نسیم ولی خان اور اصغر خان سب سے زیادہ جن نکات کے تسلیم کئے جانے پر مصر تھے، ان میں اولیت بلوچستان سے فوج کی واپسی کو حاصل تھی جبکہ ان کا دوسرا مطالبہ حیدر آباد ٹریبونل کو ختم کر کے کھلی عدالت میں ولی خان اور دیگر گرفتار شدگان پر

مقدمہ چلانے کا مطالبہ تھا۔ پی این اے کے ۳۲ نکاتی چارٹر آف ڈیمانڈ میں یہ سب سے حساس ترین نکات تھے اور انہی دو مطالبات کی آڑ میں جرنیلوں نے شطرنج کی بساط پر اپنے مہرے ترتیب دیئے ہوئے تھے۔

چیف آف آرمی سٹاف جنرل ضیاء الحق سمیت بیشتر کور کمانڈرز حیدر آباد ٹریبونل ختم کرنے یا بلوچستان سے فوج کی واپسی کے سخت مخالف تھے۔ وہ کسی صورت بھی ان دو مطالبات کے سلسلے میں وزیر اعظم کی زبان سے یہ بات سننے پر آمادہ نہ تھے کہ وہ ان مطالبات کو تسلیم کر لیں گے۔

یہ تھا وزیر اعظم بھٹو پر اصل دباؤ! ادھر پی این اے کے ہارڈ لائنرز کا سارا اصرار بھی اس پر تھا کہ سب سے پہلے یہ دو باتیں بھٹو سے منوائی جائیں۔ چنانچہ جب پروفیسر غفور احمد نے گلوگیر لہجے میں اپنی اس پوزیشن سے ہمیں آگاہ کیا تو مسٹر بھٹو نے انہیں کہا کہ وہ سردار شیرباز مزاری اور بیگم نسیم ولی خان کو ان کا یہ پیغام پہنچائیں کہ وزیر اعظم ان سے تنہائی میں ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔ غالباً مسٹر بھٹو انہیں علیحدگی میں یہ یقین دہانی کرانا چاہتے تھے کہ وہ ایک مرتبہ پی این اے اور حکومت کے درمیان سمجھوتے پر دستخط ہو جانے دیں تاکہ ان پر سے جرنیلوں کا پریشر کم ہو سکے جو ایک طرف تو سیاسی مصالحت کیلئے زور ڈال رہے ہیں اور دوسری طرف سردار مزاری اور بیگم نسیم کے مطالبات کسی صورت بھی مسٹر بھٹو کو منظور نہیں کرنے دے رہے۔ مسٹر بھٹو کا منشاء یہ تھا کہ وہ مزاری اور بیگم ولی سے مل کر انہیں یہ باور کرائیں کہ سمجھوتے پر دستخط ہونے کے بعد ملک میں جونہی امن و امان کی فضاء بحال ہو گی وہ نہ صرف فوج بلوچستان سے واپس بلا لیں گے بلکہ حیدر آباد ٹریبونل ختم کر کے تمام اسیروں پر عام عدالت میں مقدمہ چلانے کا حکم بھی دے دیں گے۔ وہ چاہتے تھے کہ ایک مرتبہ پی این اے کے ہارڈ لائنرز ان پر سے جرنیلوں کا دباؤ ختم ہو جانے دیں۔ مسٹر بھٹو کو بڑی شدت سے اس بات کا احساس تھا کہ انہوں نے فوج کو سول انتظامیہ کی مدد کیلئے میدان میں لا کر اور جزوی مارشل لاء لگوا کر اپنے پورے دور حکومت کی سب سے فاش غلطی کی ہے۔ میں تو خیر شروع دن سے اس اقدام کے سخت خلاف تھا ہی اور میں نے اس کی بجائے ملک میں دوبارہ انتخابات کرا دینے کا مطالبہ تسلیم کرنے پر ہمیشہ زور دیا تھا حتیٰ کہ جرنیلوں کے ساتھ مختلف میٹنگوں میں بھی میں نے دوبارہ انتخابات کا مطالبہ تسلیم کرنے کی ضرورت پر زور دیا تھا جس کی جرنیلوں نے بھی مخالفت کی تھی اور حفیظ پیرزادہ نے بھی اور لطف یہ کہ اس سلسلے میں دونوں کے دلائل یکساں تھے کہ "ملک میں خون خرابہ ہو گا"۔ لیکن یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ سندھ کے وزیر اعلیٰ غلام مصطفیٰ جتوئی نے بھی کراچی اور حیدر آباد میں جزوی مارشل لاء کے نفاذ کی شدت سے مخالفت کی تھی اور اس فیصلے سے پہلے انہوں نے کابینہ کے ایک اجلاس میں وزیر اعظم کو بتایا تھا کہ سندھ میں ایجی ٹیشن دم توڑ رہا ہے۔ اس لئے مارشل لاء لگانے کی ضرورت نہیں، کیونکہ اس طرح خواہ مخواہ جرنیلوں کو سیاست میں ملوث ہونے اور سیاسی اقتدار کا ذائقہ چکھنے کا موقع ملے گا۔ لیکن اس وقت وزیر اعظم کو جرنیلوں اور خصوصاً "چیف آف آرمی سٹاف" پر مکمل بھروسہ تھا، خصوصاً اس وقت تو ان کا اعتماد دو

چند ہو جاتا جب جنرل ضیاء الحق اپنے مخصوص دھیمے بلکہ عاجزانہ انداز میں انہیں فوج کی اور اپنی وفاداری کا کامل یقین دلاتے۔ گو وزیراعظم اس جال میں پھنس چکے تھے اور خوبصورت الفاظ کا یہ تار عنکبوت ان کو پوری طرح اپنے حصار میں لئے ہوئے تھا لیکن کبھی کبھی جرنیلوں کی بدلتی ہوئی آنکھیں انہیں شک و شبہ میں بھی مبتلا کر دیتیں، لگتا تھا بتوئی کے مشورے کی اہمیت اب ان پر واضح ہو چکی تھی۔ اور اسی لئے اب وہ بیگم نسیم ولی خان اور مزاری کو یہ پیشکش تک بھجوا رہے تھے کہ ملک میں امن و امان بحال ہوتے ہی نہ صرف ان کے دونوں مطالبات تسلیم کر لئے جائیں گے بلکہ صوبہ سرحد اور بلوچستان میں ان کی توڑی ہوئی حکومتیں بھی بحال کر دی جائیں گی لیکن اب نسیم ولی یا مزاری ان سے بات تک کرنے پر آمادہ نہ تھے چنانچہ جب انہوں نے پروفیسر غفور کی پیغام رسانی سے پی این اے کی ہائی کمان کو آگاہ کیا تو اصغر خان نے انہیں سختی سے بھٹو صاحب سے ملنے سے منع کیا۔ ادھر مفتی محمود کو بھی یہی پوزیشن اختیار کرنا پڑی اور انہوں نے بھی مزاری اور بیگم نسیم کو مسٹر بھٹو سے ملنے سے روک دیا اور مسٹر بھٹو کے سامنے ان دونوں کے مطالبات کو ان سے کہیں زیادہ شدت سے پیش کر دیا کہ جب تک بلوچستان سے فوج کی واپسی اور حیدر آباد ٹریبونل کے خاتمے کے بنیادی مطالبات تسلیم نہیں کئے جاتے کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکے گا۔ یہ ۱۲ جون کے مذاکرات کا سب سے سنگین موڑ تھا۔ مذاکرات کے اختتام پر ماحول نہایت کشیدہ تھا۔ چیئرمین بھٹو نے اس روز پارٹی کے کارکنوں کو ملک بھر میں کنونشن منعقد کرنے کی ہدایات جاری کر دیں اور پارٹی کے سیکرٹری جنرل ڈاکٹر غلام حسین کو حکم دیا کہ وہ ۱۸ جون کو لاہور میں، ۲۱ کو کوئٹہ میں ۲۶ کو پشاور میں ۲۸ کو ملتان اور ۸ جولائی کو کراچی میں پارٹی کنونشنوں کی صدارت کریں۔ بھٹو اس اقدام کے ذریعے اپنی "عوامی قوت" کا مظاہرہ کر کے جرنیلوں کو متنبہ کرنا چاہتے تھے اور یہ بتانا چاہتے تھے کہ وہ عوام میں اب بھی اس قدر مقبول ہیں کہ جب چاہیں، عوامی قوت کے بل بوتے پر اپنی کرسی کی طرف دیکھنے والوں کو کچل دینے کی بھرپور صلاحیت رکھتے ہیں۔ لیکن بھٹو بھول رہے تھے کہ اب وہ ملک غلام مصطفےٰ کھر ایسے منتظم اور باصلاحیت دوست سے محروم تھے۔ جس نے تن تنہا پیپلز پارٹی کی عوامی قوت کے زور پر پولیس کی ہڑتال کی کمر توڑ کر رکھ دی تھی اور پوری بیوروکریسی کے علاوہ اقتدار کی خواہشمند دوسری قوتوں کو بھی اپنے اپنے بلوں میں سر چھپانے پر مجبور کر دیا تھا۔ پی پی پی کے دوسرے وزیروں اور لیڈروں میں ملک غلام مصطفےٰ کھر بننے کی نہ تو صلاحیت تھی اور نہ بیوروکریسی کے جال میں گھر کر بھٹو اب اس عوامی قوت کے مالک رہے تھے جو انہیں اقتدار میں لے کر آئی تھی۔ رہی پیپلز پارٹی سو بحیثیت "پارٹی" اسے کبھی منظم ہی نہ کیا گیا تھا۔ نہ کسی بھی سطح پر اس میں انتخابات کرا کے حقیقی رہنماؤں کو ابھرنے کا موقع دیا گیا تھا۔ بس نامزدگیاں ہی نامزدگیاں تھیں۔ اور نامزد لوگ کبھی کارکنوں یا عوام کی پروا نہیں کیا کرتے۔ ان کی مثال تو ان ملازمین کی سی ہوتی ہے جو اپنے مالک کے اشارے پر ناچتے ہیں اور کبھی نہیں دیکھتے کہ مالک کیلئے سرانجام دیا جانے والا کون سا کام جائز ہے اور کون سا ناجائز، کیونکہ انہیں احتساب کا خطرہ تو ہوتا نہیں۔ اس سبب سے پارٹی کے نامزد عہدیدار بھی تحریک کے مقابل غائب ہو چکے تھے اور دھاندلیوں کے ذریعے اسمبلیوں میں پہنچنے والے

"عوامی نمائندوں" کی اکثریت بھی اس قابل نہ تھی کہ اپنے حلقہ ہائے انتخابات کو قابو میں رکھ سکتی۔ پاکستان پیپلز پارٹی ہمیشہ سے ووٹرز کا ایک ہجوم رہی تھی جو مسٹر بھٹو کی پرکشش شخصیت کے سحر کا اسیر تھا۔ درحقیقت بحیثیت پارٹی اس کا کوئی وجود ہی عرصہ اقتدار میں باقی نہ رہا تھا اور اب وزیراعظم کو اس کا احساس ہو رہا تھا کہ پارٹی کو منظم کرنا کس درجہ ضروری تھا۔ دودھ دینے والے نامزد مجنوں میدان سے راہ فرار اختیار کر چکے تھے اور "مسٹر بھٹو کا اقتدار پوری طرح جرنیلوں کے رحم و کرم پر یا پی این اے کے ساتھ جلد سے جلد سمجھوتہ کر لینے پر منحصر تھا۔"

۱۴ جون کو آٹھویں اجلاس سے پہلے مسلح افواج کے سپریم کمانڈر اور وزیراعظم پاکستان ذوالفقار علی بھٹو نے پی۔ ایم۔ ہاؤس میں منعقدہ اعلیٰ فوجی حکام کا اجلاس طلب کیا ہوا تھا۔ حسب معمول میں اور حفیظ ان کے ساتھ تھے۔ پہلے تو وزیراعظم نے کور کمانڈرز سے دفتری انداز میں ان کے علاقوں کی صورت حال پر بات چیت کی اور پھر نہایت خود اعتمادی کے ساتھ انہوں نے اپنی تقریر کا آغاز کیا۔ میری یادداشتوں میں درج ان کی تقریر کی ابتدا اس جملے سے ہوئی تھی۔ COUNTRY IS AT THE CROSSROAD "کنٹری از ایٹ دی کراس روڈ (ملک اس وقت دوراہے پر کھڑا ہے)" پھر انہوں نے مختصراً جرنیلوں کے ساتھ کانفرنسوں کے جواز پر روشنی ڈالی اور انہیں یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ ان پر بھروسہ "بے دست و پا" ہو کر نہیں کیا جا رہا ہے۔ مسٹر بھٹو نے کہا تھا (اور نیچے دیا ہوا ایک ایک لفظ ان کا ہے) کہ

"میں اپنے اختیارات کو خوب جانتا ہوں اور یاد رکھیں کہ میں آرمی کو آرڈر کر سکتا ہوں۔ میں نے ریفرنڈم کے سلسلے میں آپ سے مشورہ کیا، لیکن صرف اس لئے کہ اگر آپ کسی حل کو مناسب نہیں سمجھتے تو میں اسے مسلط نہیں کرنا چاہتا کیونکہ اس طرح صحیح نتائج پیدا نہیں ہوں گے۔ میں قومی CONSENSUS چاہتا ہوں اور آپ بھی قوم کا حصہ ہیں۔ دوسرے مجھے اپنے بارے میں کوئی کامپلیکس نہیں، مجھے آرمی جرنیلوں سے بات کرتے ہوئے اس لئے جھجک محسوس نہیں ہوتی کہ میں پچھلے دس سال سے آپ لوگوں کو جانتا ہوں۔ مجھے آپ سے مشورہ کرتے ہوئے کوئی الجھن نہیں ہوتی جب میں نے ریفرنڈم کے سلسلے میں آپ حضرات سے بات کی تو ممکن ہے آپ لوگوں کو یہ خیال پیدا ہوا ہو کہ میں اور طاقتور بن کر ابھروں گا۔ آپ لوگوں نے سیاسی تصفیہ چاہا، میں نے کہا .... آل رائٹ .... آپ میں سے ہر ایک مذاکرات کے لئے پرجوش تھا، چنانچہ میں نے مفتی کے ساتھ بات چیت کے پہلے ہی روز واضح کر دیا کہ کسی غیر ملکی وفد سے بات نہیں کر رہا، آپ لوگ ہمارے بزرگ اور بھائی ہیں میں انتہا پسند نہیں، لبرل ہوں، مجھے ان کی باتیں ماننے میں ایک منٹ نہیں لگا، میں نے ہر مطالبہ مان لیا، اب چاہے مجھے اس کی کتنی ہی بڑی قیمت کیوں نہ ادا کرنی پڑے۔ میں 'نتائج' پیدا کرنے پر قادر نہیں۔ آنے والے الیکشن کے نتیجے میں جو مذاکرات کی کامیابی کے بعد ہوں گے 'تضادات ضرور پیدا ہوں گے۔ امن میں عدم استحکام آئے

گا۔ لیکن ایک بات طے ہے الیکشن کے بعد آرمی کی مداخلت کوئی بھی پسند نہیں کرے گا۔ کیونکہ ان کے پاس تازہ مینڈیٹ ہو گا اور وہ اتنی جلد ایکس پوز بھی نہ ہوں گے گو وہ "جنتا" کی طرح آپس میں لڑیں گے اور یہ ملک کے لئے بہت برا ہو گا۔ مگر آرمی کچھ نہ کر سکے گی' مگر ایک راستہ یہ ہے کہ آرمی اب ٹیک اوور کرلے لیکن یہ کوئی "بیڈ آف روز" BED OF ROSES (پھولوں کی سیج) نہیں ہے' جب یحیٰی نے ٹیک اوور کیا اور میں اس سے ملا' تو میں نے اس پر واضح کیا تھا کہ تم خطرناک پوزیشن میں ہو' اس نے کہا "پالیٹکس کیا ہے؟ کامن سینس! اور بیورو کریسی کہتی ہے کہ آپ میں سیاسی بصیرت ہے' آپ کامن سینس کے مالک ہیں' اس لئے حکومت چلا سکتے ہیں" .... لیکن وہ ۱۹۶۹ء تھا اب ۱۹۷۷ء ہے۔ میں نے اس وقت بھی کہا تھا کہ دوسرا مارشل لاء پہلے سے کمزور تر ہوتا ہے۔ .... اور تیسرا اس سے بھی کمزور ہو گا۔ کمزور ان معنوں میں کہ اول تو آپ کسی کو شش نہ کر سکیں گے اور اگر کریں گے تو سمجھ لیں کہ یہ بد ترین کمزوری ہے۔ آج دنیا بھر میں بیداری ہے۔ یہ بھی کہا جائے گا کہ پنجابی آرمی حکومت کر رہی ہے۔ دوسرے صوبے کٹ جائیں گے۔ کشمیر کی سیز فائر لائن کے لئے آپ پر دباؤ ہو گا۔ ایٹمی ری پراسیسنگ پلانٹ کے مسئلے پر آپ مصیبت میں ہوں گے۔ ان معاملات سے صرف سیاسی حکومت نمٹ سکتی ہے۔ آرمی نہیں! بڑی طاقتیں یہ سوال بھی اٹھائیں گی کہ آبادی کے تناسب کے لحاظ سے پاکستان میں انڈیا کے مقابل "ریشو آف فورسز" (افواج کا تناسب) اتنا زیادہ کیوں ہے؟ لیکن میں یہ نہیں کہہ رہا کہ میں اکیلا ہی سارے مسائل کا حل ہوں .... نہیں .... میں اپوزیشن سے بات کر کے ایک باعزت حل ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ اس میں کامیاب ہو جاؤں گا۔"

وزیر اعظم کی اس تقریر کے ایک ایک لفظ سے ایک تجربہ کار ڈپلومیٹ کا طرز گفتگو جھلک رہا تھا۔ انہوں نے بڑی کامیابی سے اپنا مافی الضمیر جرنیلوں کے ذہنوں میں اتارا تھا اور میں نے دیکھا کہ جرنیل ان کی تقریر کے بعد گنگ سے تھے۔ چند لمحے کے سکوت کو چیف آف آرمی سٹاف جنرل ضیاالحق کے الفاظ نے توڑا۔ ....

"سر! آپ نے آرمی کے لئے سب سے زیادہ کام کیا ہے' آرمی کوئی تھرڈ پارٹی نہیں۔ ہمارا ایسا کوئی ذہن نہیں۔ آپ نے تو دیکھا ہے کہ ہم نے اپوزیشن کیمپ میں "بیڈ نیم" (BAD NAME) حاصل کیا ہے' یہ ہمارا کریڈٹ ہے' اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہم حکومت کے ساتھ ہیں"

ان کے خاموش ہوتے ہی لاہور کے کور کمانڈر جنرل اقبال بولے۔ "فوج مذاکرات کی کامیابی کے لئے دعا مانگ رہی ہے' ایجی ٹیشن وقتی طور پر رک گیا ہے لیکن اگر مذاکرات ناکام ہوئے تو یہ پھر شروع ہو گا' بم بلاسٹ ہوں گے' فائرنگ ہو گی' ڈیمو کریٹک یوتھ فورس اصغر خان سے ہدایات لے رہی ہے' فوج کو لاہور میں دوبارہ تعین کرنا ممکن نہ ہو گا' لوگ اسے قبول نہ کریں گے۔ ایکس ٹرنل تھریٹ EXTERNAL THREAT بھی ہوں گے۔ انڈین آرمی ہماری سرحدوں میں آ سکتی ہے۔ ادھر ہمارے یونٹ شہر کے

اندر مصروف ہوں گے" ہم نے آرمی کو شوٹنگ کے لئے کہا تو اس میں کریکس CRACKS آ نکلے اور یہ بھی عجب نہ ہو گا کہ آرمی میں باہمی محاذ آرائی شروع ہو جائے۔ اپوزیشن کافی عرصہ سے اس سلسلے میں کام کر رہی ہے۔ ریٹائرڈ فوجی افسر ایجی ٹیشن میں شریک ہیں۔ پھر فوجیوں کے رشتہ دار ہیں۔ انتخابی مہم بھی جونیئر سطح پر اثر انداز ہوئی ہے' فائر ان دی ایئر (FIRE IN THE AIR) آرمی میں نہیں ہوتا' لیکن ہمارے ہاں احکامات کے باوجود ہوا۔ اس لئے ہم دل و جان سے مذاکرات کی کامیابی چاہتے ہیں۔"

جنرل اقبال خاموش ہوئے تو کراچی کے کور کمانڈر جنرل ارباب جہان زیب بولے۔ "ہر شخص مذاکرات کی کامیابی چاہتا ہے۔ چاہے وہ کسی صورت میں بھی ہو ہماری حالت اس وقت یہ ہے کہ بالکل نچلی سطح پر ہمارا اب کوئی اثر نہیں رہا۔

جونیئر افسر جو ہیں THEY WILL OBEY US BUT UNWILLINGLY

سینئر سٹاف' کوئی پرابلم نہیں ہے' مگر سیاسی تصفیہ وہ بھی چاہتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوا تو آرمی گلیوں میں نہ جا سکے گی۔ دونوں طرف کے لوگ مسلح ہیں۔ اگر ڈیڈ لاک ہوتا ہے تو دونوں کو DIS ENGAGE کرنے کی ضرورت ہو گی۔ ایرانی سائیڈ تو ہم نہیں دیکھ سکتے' لیکن بلوچستان میں کوئی TROUBLE نہیں ہو گی۔ سندھ میں اگر ایجی ٹیشن میں رورل RURAL ایریا شامل ہو گیا تو بہت مشکل پیدا ہو گی۔ مذاکرات میں کامیابی آپ کسی بھی طرح حاصل کریں۔ لیکن حیدر آباد کے قیدی رہا نہیں ہونے چاہئیں۔ کیونکہ وہ لوگ مسلمہ وطن دشمن اور غدار ہیں۔"

جنرل جہان زیب کے خاموش ہونے پر جنرل غلام حسن گویا ہوئے۔ "مذاکرات کی کامیابی کے لئے بھی دعا کر رہے ہیں INVOLVEMENT PROLONG آرمی کی INTEGRITY کے خلاف ہے۔ اب ایجی ٹیشن شروع ہوا تو زیادہ شدید ہو گا اور ایکس ٹرنل تھریٹ اس کے علاوہ ہے۔"

آخر میں گفتگو کو سمیٹتے ہوئے مسٹر بھٹو نے کہا .... "گویا یہ بات اب واضح ہو گئی کہ آپ اکارڈ ACCORD چاہتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ ہم سیاسی حل نکال لیں گے' آپ لوگ بھی دعا کریں۔"

شام پانچ بجے مذاکرات شروع ہونا تھے۔ مفتی محمود نے بتایا کہ پی۔ این۔ اے کے نزدیک انتخابات ۱۴ اگست سے قبل ہو جانا چاہئیں اور کل ہم آپ کو اس کی حتمی تاریخ سے بھی آگاہ کر دیں گے۔ از سر نو انتخابات کے سلسلے میں دونوں فریقوں کے درمیان اتفاق رائے تھا' اختلاف صرف تاریخ اور وقت کے تعین پر تھا۔ یہ امر طے پا گیا کہ تمام گرفتار شدگان سمجھوتے کے ساتھ ہی رہا کر دیئے جائیں گے۔ ہم نے تجویز پیش کی کہ انتخابات کی تاریخ رمضان المبارک کے بعد رکھی جائے۔

پی۔ این۔ اے کی مذاکراتی ٹیم کو ساری روداد ہائی کمان کے سامنے رکھنا تھی' چنانچہ اجلاس اگلے

روز شام تک ملتوی ہو گیا۔

رات کو سعودی سفیر شیخ ریاض الخطیب نے وزیر اعظم بھٹو سے ملاقات کی اور مذاکرات میں مثبت پیش رفت پر اطمینان کا اظہار کیا۔

مفتی محمود صحافیوں کے گھیرے میں آ گئے اور انہیں کہنا پڑا کہ ہم انتخابات کا انعقاد ۱۴ اگست سے پہلے چاہتے ہیں 'انتخابات کی تاریخ کے بارے میں آج فیصلہ کر کے کل حکومت کو آگاہ کریں گے' تاہم ابھی کوئی حتمی سمجھوتہ نہیں ہوا ہے۔

○ ...... ○ ...... ○ ...... ○

ڈیڈ لاک ہوتا ہے۔

۱۵ جون بدھ کا اجلاس ہر اعتبار سے اطمینان بخش تھا۔ جس کے اختتام پر پی ایم ہاؤس کے آڈیٹوریم میں پروفیسر غفور احمد کی معیت میں میں نے پریس بریفنگ کے دوران وہ تفصیلات بتائیں جن کے نتیجے میں بحران کے حل کیلئے حکومت اور قومی اتحاد کے درمیان سمجھوتہ طے پا گیا تھا۔ سمجھوتے کی مختصر تفصیلات بتاتے ہوئے میں نے کہا کہ عام انتخابات اکتوبر میں ہوں گے اور اس سلسلے میں فنی توضیحات کے تعین کیلئے حفیظ پیرزادہ اور پروفیسر غفور پر مشتمل ایک کمیٹی قائم کر دی گئی ہے۔ سمجھوتے پر عملدر آمد ایک دس رکنی کونسل کرائے گی جس میں پی این اے اور پیپلز پارٹی کے پانچ پانچ نمائندے ہوں گے۔ اگر کونسل کے درمیان اختلاف رائے پیدا ہو گیا تو فیصلہ سپریم کورٹ کے تین ججوں کا پینل کرے گا۔ صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات قومی اسمبلی کے انتخاب کے بعد ہوں گے۔ سمجھوتے پر دستخط کے دن سے ہنگامی حالت ختم ہو جائے گی خصوصی ٹریبونل ختم کر دیئے جائیں گے (حیدر آباد ٹریبونل ان میں شامل تھا) بلوچستان سے فوج واپس بلالی جائے گی' بنیادی حقوق کے منافی آئینی ترامیم بھی غیر مؤثر ہو جائیں گی۔ تمام سیاسی قیدی رہا کر دیئے جائیں گے۔ اخبارات کو مکمل آزادی حاصل ہوگی ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر فریقین کو مساوی وقت دیا جائے گا۔ سمجھوتہ پر ۲۰ جون تک دستخط ہو جائیں گے۔ پیرزادہ اور پروفیسر غفور اپنے چار چار قانونی ماہرین کی مدد سے سمجھوتے کا مسودہ تیار کریں گے اور سمجھوتے پر مسٹر بھٹو اور مولانا مفتی محمود کے دستخط ہوں گے۔ میں نے یہ بھی بتایا کہ سب کمیٹی کا پہلا اجلاس کل ۱۶ جون کو گیارہ بجے اسلام آباد میں ہو گا۔

جب میں یہ تفصیلات بتا چکا تو ایک صحافی نے سوال کیا۔

"کیا آزاد کشمیر کے بارے میں بھی کوئی فیصلہ ہوا"؟۔

"جی ہاں" ...... پروفیسر غفور احمد نے جواب دیا

"اس بارے میں سردار عبدالقیوم سے عنقریب بات چیت شروع کر دی جائے گی"۔ ...... میں نے مزید وضاحت کی۔

"کیا انتخابات کی تاریخ طے پا گئی ہے؟"۔ ایک اور صحافی نے سوال کیا

"جب سمجھوتہ طے پا گیا تو سب کچھ ہو گیا"۔ میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"کیا آپ سمجھوتے سے مطمئن ہیں؟ سوال پروفیسر غفور سے تھا۔

"اگر مطمئن نہ ہوتے تو سمجھوتہ کس طرح ہوتا؟" ۔ انہوں نے جواب دیا

"آپ کا کیا خیال ہے، سمجھوتہ ان سے زبردستی کرایا گیا ہے؟" ۔ میں نے سوال کرنے والے سے ہنستے ہوئے سوال کیا۔ پروفیسر غفور بولے ۔ "آپ اخبار والے بھی حد کرتے ہیں۔ آج ایک اخبار نے لکھا ہے کہ ہم اٹھ کر جا رہے تھے۔ یہ بات بالکل غلط ہے" ۔ میں نے بھی اس کی تردید کی اور کہا کہ ایسا کبھی نہیں ہوا۔ پروفیسر غفور سے ایک اور صحافی نے پوچھا:

"کیا آپ نے حکومت کی تجاویز قبول کر لی ہیں؟" ۔

انہوں نے زیادہ تفصیلات ظاہر کرنا مناسب نہ سمجھتے ہوئے کہا "یار! آج زیادہ سوالات نہ کریں"

"ہم اپنے لئے نہیں سات کروڑ عوام کیلئے یہ سوال کر رہے ہیں ۔ جو جاننا چاہتے ہیں کہ آخر آپ لوگ کیا کر رہے ہیں؟" صحافی نے اصرار کیا۔

"لیکن تمام تفصیلات طے ہونے سے پہلے ہم کوئی اعلان نہیں کریں گے" ۔ ...... پروفیسر غفور احمد بھی اڑ گئے۔

"کیا انتخابات سال کے آخر میں ہوں گے؟" گھما پھرا کر سوال پھر کیا گیا۔

"کیا عبوری حکومت کا معاملہ ختم ہو گیا۔" "جی ہاں" ...... میں نے مختصر جواب دیا

"جی ہاں ختم ہو گیا"...... پروفیسر غفور احمد نے بھی اختصار کے ساتھ جواب دیا۔

"کیا انتخابات کا تعین ہو چکا ہے" ۔ ایک اور صحافی نے پھر وہی سوال کیا۔

"ہاں بھئی ہو چکا ہے" ۔ پروفیسر غفور قدرے بیزاری کے ساتھ بولے ...... اور اس کے ساتھ میں نے صحافی دوستوں سے اجازت طلب کی۔

ہم آج کی ساری کارروائی سے بے حد مطمئن تھے کیونکہ تمام معاملات بہ حسن و خوبی انجام پا چکے تھے اور یہ ہمارے لئے انتہائی مسرت کا مقام تھا کہ قوم کو ایک بڑے بحران سے نکالنے میں ہماری حقیر کوششیں بار آور ہونے کو تھیں۔

ادھر ہم مطمئن و مسرور تھے، ادھر اصغر خان نے اسی شام موجودہ رکن قومی اسمبلی ملک محبوب حسین کی رہائش گاہ پر ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے معاہدہ پر اپنے مخصوص انداز میں تبصرہ کیا۔ انہوں نے کہا کہ وہ اس سمجھوتے پر خوش نہیں ہیں۔ عوام کو تفصیلات بتائے بغیر سمجھوتے کی کوئی حیثیت نہیں کیونکہ تفصیلات طے ہونے میں مشکلات پیدا ہو سکتی ہیں۔

یوں لگتا تھا جیسے آئندہ پیدا کرنے کیلئے مشکلات کا تعین بھی انہوں نے کر لیا ہو۔

ادھر پاکستان کے مخلص دوست سعودی عرب کے سفیر شیخ ریاض الخطیب کا انداز ملاحظہ ہو۔ جن سے ہمارا کوئی رشتہ نہ وطن کے حوالے سے تھا نہ رنگ و نسل کے حوالے سے ...... سوائے اس کے کہ وہ

ہمارے مسلمان بھائی اور پاکستان کیلئے دل درد مند رکھنے والے مخلص تھے۔ انہوں نے سمجھوتہ طے پانے کے بعد کہا...... "میں اتنا خوش ہوں کہ اس خوشی کے اظہار کیلئے مجھے الفاظ نہیں مل رہے یہ میری سفارتی زندگی کا سب سے اہم اور مقدس ترین مشن تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ دونوں فریقوں نے شاہ خالد کی بزرگی کا لحاظ کیا ہے اور ان کی تجاویز کو قبول کر لیا ہے" ۔

رات کو مفتی محمود کے اعزاز میں ملک محبوب حسین نے عشائیہ دیا تھا جس سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے بھی اعلان کیا کہ سمجھوتے پر دو تین دن میں دستخط ہو جائیں گے۔

اعصاب پر تو ہم سب ہی کے یکساں بوجھ تھا۔ لیکن وزیر اعظم بھٹو تمام معاملات کے بخیر و خوبی انجام تک پہنچ جانے کے بعد جیسے اچانک ہی ٹوٹ سے گئے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اسی شام مفتی محمود کو بتایا تھا کہ اب وہ تین چار روز تک تھکن اتارنے کیلئے لاڑکانہ جا کر آرام کریں گے اور یہ بات ہماری موجودگی ہی میں ہوئی جس پر مفتی محمود نے ان سے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے کہا تھا کہ انہیں ضرور آرام کرنا چاہئے کیونکہ مسودے کی ڈرافٹنگ میں تین چار دن ویسے بھی لگ جائیں گے۔

جمعرات ۱۶ جون کو سٹیٹ بنک بلڈنگ میں پیرزادہ اور پروفیسر غفور کے ساتھ چار چار قانونی ماہرین کی سب کمیٹی کا دو گھنٹے طویل اجلاس ہوا جس میں سمجھوتے کو تحریری شکل دینے سے متعلق تمام ابتدائی تفصیلات طے کر لی گئیں، مفتی محمود اس روز بنوں چلے گئے تھے جہاں انہوں نے مسجد جعفر خان میں ایک بڑے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے قوم سے اپیل کی کہ غیر ذمہ دارانہ باتوں سے پرہیز کیا جائے، ورنہ ملک بڑے سنگین بحران سے دوچار ہو جائے گا لیکن عین اسی روز صوابی میں ایک بڑے جلسہ عام سے این ڈی پی کے صدر سردار شیرباز مزاری نے بھی خطاب کیا اور کہا کہ ۳۲ نکات کی منظوری سے کم پر سمجھوتہ نہیں ہو سکتا۔ مجھے نہیں معلوم کہ سمجھوتے کے بعد اس طرح کی باتیں کرنے سے ان کا کیا مقصد تھا البتہ پروفیسر غفور احمد ہمیں بتایا کرتے تھے کہ تحریک استقلال کے اصغر خان این ڈی پی کی بیگم نسیم ولی خان اور کسی حد تک جے یو پی کے مولانا شاہ احمد نورانی کا موقف یہ ہے کہ پیپلز پارٹی کی حکومت سے کوئی معاہدہ کرنے کی بجائے ملک میں مارشل لاء لگوانے کی کوشش کی جائے۔ پروفیسر غفور نے تو اصغر خان سے یہ بات تک منسوب کی تھی کہ وہ فوجی حکام کے ذریعے مارشل لاء کے بعد نوے دن کے اندر انتخابات کرانے کے دعوے کر رہے ہیں اور کسی قیمت پر پیپلز پارٹی کی حکومت کے ساتھ کوئی سمجھوتہ نہیں کرنا چاہتے۔ اب جبکہ ان تمام حضرات کی آراء کے علی الرغم سمجھوتہ ہو گیا تھا تو پروفیسر غفور کی باتوں کی روشنی میں مجھے یوں محسوس ہوا، جیسے پی این اے کی صفوں میں کچھ لیڈر واقعی ایسے ہیں جن کے جرنیلوں سے تعلقات ہیں اور وہ لوگ تقریباً وہی بات جلسہ عام میں کرتے ہیں جو جرنیل صاحبان گفتگوؤں میں مسٹر بھٹو کے سامنے رکھتے ہیں۔ جرنیلوں کے عزائم کم از کم میں ضرور محسوس کر چکا تھا اور میں نے وزیر اعظم کو بھی اپنے محسوسات سے آگاہ کر دیا تھا، ادھر پی این اے کے رہنماؤں کے بارے میں خود پی این اے کے جنرل سیکرٹری یہ بتا چکے تھے کہ وہ بھی مارشل لاء کا راستہ ہموار

کر رہے ہیں خود اپنی صفوں میں مذاکراتی ٹیم کے رکن حفیظ پیرزادہ کا رویہ مجھے بے حد تشویش ناک لگتا تھا۔ میرے خیال کے مطابق مذاکراتی ٹیم میں اگر وزیر اعظم پیرزادہ کی جگہ رفیع رضا کو اپنے ساتھ رکھتے تو وہ ان کی قانونی معاونت بھی بہتر طور پر کر سکتے تھے۔ اور ان کا رویہ بھی بے حد متین اور سنجیدہ ہوتا' وہ پیرزادہ کی طرح رومانی فکر کے مالک نہ تھے اور بھٹو صاحب کیلئے بے حد مخلص بھی تھے۔ بدقسمتی یہ تھی کہ وزیر اعظم نا معلوم وجوہ کی بناء پر ان سے کچھ بدظن سے نظر آنے لگے تھے حتیٰ کہ کئی مرتبہ انہوں نے واضح طور پر یہ تک کہہ دیا تھا کہ رفیع رضا سی آئی اے کے ایجنٹ ہیں اور پاکستان کے ایٹمی پروگرام سے متعلق امریکہ کو انہوں نے آگاہ کیا تھا۔ میرے نزدیک رفیع رضا ایسے محب وطن انسان سے اس اقدام کو منسوب کرنا ایک نہایت سچے' اچھے اور مخلص دوست سے کوئی مناسب سلوک نہ تھا۔

مفتی محمود اور دیگر لوگوں کے علم میں یہی تھا کہ مسٹر بھٹو تھکن اتارنے کیلئے لاڑکانہ جانا چاہتے ہیں لیکن اچانک جمعرات ۱۶ جون کو انہوں نے اعلان کیا کہ وہ ۱۷ جون کو پانچ مسلم ممالک کے دورے پر ان کے سربراہوں کا شکریہ ادا کرنے جا رہے ہیں۔ ان کا یہ دورہ کئی اعتبار سے کثیر المقاصد تھا۔ ایک طرف جہاں وہ ان دوست سربراہوں کا شکریہ ادا کرنا چاہتے تھے جنہوں نے پاکستان کے سیاسی بحران کے حل کے سلسلے میں دلچسپی لی۔ وہاں دوسری طرف وہ امریکہ کو بھی یہ باور کرانا چاہتے تھے کہ داخلی محاذ پر جنگ انہوں نے جیت لی ہے اور اب وہ امریکہ کی جانب سے ایٹمی پروگرام کے سلسلے میں حائل کردہ تمام رکاوٹوں کو ایک ہی ٹھوکر سے گرانے والے ہیں اور فنڈز اکٹھا کرنے چلے ہیں۔ انہیں قطعاً پروا نہیں کہ امریکہ اس سلسلے میں کیا اقدامات کر رہا ہے۔ تیسری طرف وہ جرنیلوں کو بھی یہ سمجھانا چاہتے تھے کہ عالمی سطح پر اپنے ذاتی تعلقات کی بنا پر وہ خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ جرنیل اگر اپنے دماغ میں کوئی غلط خیال رکھتے ہیں تو اس اہمیت کو مدنظر رکھیں۔ جو انہیں بعد ازاں بے حد دشواریوں سے دوچار کر سکتی ہے۔

چوتھی جانب وہ پی این اے کے رہنماؤں کو یہ باور کرانا چاہتے تھے کہ ان ایسی سطح کے آدمی نے پی این اے کے "کنوئیں کے مینڈکوں" کو کتنی حیثیت دی ہے۔ اس سے زیادہ کی طلب انہیں نہیں کرنی چاہیے۔

اس حقیر کے حال پر ان کے کرم کا یہ عالم تھا کہ جب انہوں نے اپنے بیرون ملک جانے کا اعلان کیا تو اسی پریس کانفرنس میں بطور خاص اس بات کا ذکر کیا کہ "کوثر نیازی نے ترجمانی کا حق ادا کر دیا ہے' میں ان کی صلاحیتوں کا مداح ہوں" انہوں نے پروفیسر غفور کے رویئے کی بھی تعریف کی۔

ادھر ملک غلام مصطفےٰ کھر نے اسی روز وزیر اعظم کے خصوصی معاون برائے سیاسی امور کا عہدہ سنبھال لیا' جس سے پی این اے کے رہنما تشویش میں مبتلا ہو گئے۔ چیف آف آرمی سٹاف جنرل ضیاء الحق بھی اسی روز ایک دن کے دورے پر کراچی پہنچے جہاں لیفٹیننٹ جنرل ارباب جہانزیب نے ان کا استقبال کیا۔ وہ اسی شام واپس راولپنڈی چلے آئے۔ ان کے ساتھ اس دورے میں میجر جنرل ایس ایم عباسی بھی تھے۔

اگلے روز جمعہ ۱۷ جون کو وزیر اعظم بھٹو جرنیلوں اور قومی اتحاد کے رہنماؤں کو ان کے حال پر چھوڑ کر سعودی عرب' لیبیا' کویت' ابو ظہبی اور ایران کے پانچ روزہ دورے پر نکل کھڑے ہوئے پی این اے کے مطالبات میں ایک حصہ آزاد کشمیر سے متعلق بھی تھا کہ وہاں بھی از سر نو انتخابات کرائے جائیں۔ چنانچہ وزیر اعظم بھٹو نے اس سلسلے میں فیصلہ کیا تھا کہ میں سردار عبد القیوم کے ساتھ میٹنگ کر کے ان کے مطالبات سنوں اور جو فیصلہ مناسب سمجھوں کر لوں۔ میں نے اس معاملے میں کسی تاخیر کے بغیر سردار قیوم کو دعوت دی کہ وہ میری رہائش گاہ پر مجھ سے مل لیں۔ چنانچہ سردار قیوم جمعہ ۱۷ جون کو ہی سردار سکندر حیات سمیت تشریف لے آئے اور صرف ڈیڑھ ہی گھنٹہ میں مختلف امور پر اتفاق رائے پیدا کر کے اٹھے۔ آزاد کشمیر میں بھی نئے انتخابات اکتوبر ہی میں ہونا طے پا گئے سردار قیوم آزاد کشمیر ایکٹ میں چند ترامیم چاہتے تھے جن پر وزیر اعظم ہی فیصلہ لے سکتے تھے چنانچہ میں نے ان سے ترامیم کا مسودہ لے کر رکھ لیا تاکہ مسٹر بھٹو کی واپسی پر ان سے اس پر تبادلہ خیال ہو سکے۔ اس وجہ سے ان کے ساتھ ایک اجلاس کا ہونا اور طے پایا۔

ادھر پیرزادہ اور پروفیسر غفور پر مشتمل سب کمیٹی کے اجلاس میں ایک نیا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا جس پر حفیظ نے کوئی فیصلہ کن قدم اٹھانے سے انکار کر دیا اور پروفیسر غفور پر واضح کر دیا کہ وہ ان کے اس "نئے مطالبے" کو تسلیم نہیں کر سکتے۔ "نیا مطالبہ" فقط اتنا تھا کہ پی این اے اس سمجھوتے کا آئینی تحفظ چاہتی تھی اور اس کیلئے آئین میں ایک عبوری شق کا اضافہ چاہتی تھی۔ ہوا یہ کہ جب مذاکراتی ٹیم نے سمجھوتے کا مسودہ پی این اے کی ہائی کمان اور لیگل ایڈوائزرز کے سامنے رکھا تو اس پر سب سے بڑا اعتراض یہ کیا گیا کہ اس سمجھوتے کی کوئی آئینی حیثیت نہیں ہے اور اگر مسٹر بھٹو کل کلاں اس سے منحرف ہو جاتے ہیں تو کوئی ان کا کیا بگاڑ لے گا۔ دوسرا اعتراض یہ تھا کہ سمجھوتے میں جو کچھ طے پایا اگر اس کی آئینی حیثیت کو سپریم کورٹ میں چیلنج کر دیا جاتا ہے تو اس کا مستقبل کیا ہو گا؟۔ چنانچہ طے پایا کہ اس مقصد کے حصول کیلئے حکومت سے سمجھوتے کیلئے آئینی تحفظ کا مطالبہ کیا جائے۔

حفیظ پیرزادہ نے ان مطالبات پر سخت رویہ اختیار کیا اور پروفیسر غفور کو صاف جواب دے دیا کہ اس بات کو تسلیم کرنا ان کے دائرہ اختیار سے باہر ہے۔ آخری لمحات میں مسٹر بھٹو کی بیرون ملک روانگی کے بعد پیدا ہونے والا یہ وہ "ڈیڈ لاک" تھا جس نے سارے کئے دھرے پر پانی پھیر دیا۔ اگر پی این اے کے قانونی مشیر سمجھوتے کے سلسلے میں آئینی تحفظ مانگتے تھے تو یہ کوئی ایسی بری بات نہ تھی جب ساری باتیں خلوص نیت سے طے پا گئیں تو اس میں بھی کوئی حرج نہ تھا کہ سمجھوتے کو آئینی تحفظ فراہم کر دیا جاتا۔ پیرزادہ کے انکار نے مسٹر بھٹو پر پی این اے کے اعتماد کو ختم کر کے رکھ دیا چنانچہ جمعہ ۱۷ جون ہی کو پروفیسر غفور نے اعلان کر دیا کہ یہ معاملہ اعلیٰ سطحی اجلاس میں پیش کیا جائے گا۔ انہوں نے مسٹر بھٹو کے بیرون ملک جانے پر بھی تنقید کی۔ ان کا اور پی این اے کے دیگر رہنماؤں کا خیال یہ تھا کہ بھٹو سمجھوتے کے سلسلے میں مخلص نہیں ہیں اس لئے وہ حفیظ پیرزادہ کو یہ فرض سونپ گئے ہیں کہ وہ سمجھوتے کو سبوتاژ کر دیں۔

ہفتہ ۱۸ جون کو مسٹر بھٹو نے ریاض پہنچ کر شاہ خالد سے ملاقات کی اور اسی روز طرابلس روانہ ہو گئے۔ ادھر میرے اور سردار عبدالقیوم کے درمیان مذاکرات میں آزاد کشمیر ایکٹ پر غور ہوا۔ اجلاس میں آزاد کشمیر کے چیف سیکرٹری اور سیکرٹری قانون بھی موجود تھے۔ یہ مذاکرات ایک گھنٹہ تک جاری رہے اور طے پایا کہ متعلقہ افسروں کو سردار قیوم کے مطالبات کو قانونی شکل دینے کیلئے کچھ وقت دیا جائے اور پھر منگل کو ہمارے درمیان مذاکرات ہوں۔ آزاد کشمیر پیپلز پارٹی کے رہنماؤں کا مطالبہ تھا کہ ان مذاکرات کے سلسلے میں ان کی رائے بھی سنی جائے۔ ورنہ ان کی حیثیت آزاد کشمیر میں سخت متاثر ہوگی۔ چنانچہ میں نے شام کو پیر علی جان شاہ سے بھی ملاقات کی اور انہیں یقین دلایا کہ وہ پریشان نہ ہوں 'اگر انہوں نے عوام کیلئے خدمات سرانجام دی ہیں تو لوگ انہیں فراموش نہیں کریں گے وہ نئے انتخابات کی تیاری کریں۔

حفیظ پیرزادہ نے اسی روز جلتی پر اور تیل چھڑک دیا۔ انہوں نے لاہور میں پارٹی کے کنونشن سے خطاب کیا جس میں پی این اے کو مشتعل ہونے کا ایک اور موقع مل گیا۔ حفیظ نے کہا "ہم نے گورنروں کی تقرری ان کے مشورے سے کرنے کا مطالبہ مسترد کر دیا ہے" ۔ اب کیا مان لیا ہے؟ اور کیا مسترد کر دیا ہے ؟ قسم کی باتیں کرنے کا وقت نہ تھا لیکن کچھ سمجھ نہیں آسکا کہ آخر حفیظ ایسی باتیں کیوں کر رہے تھے ؟۔ سردار قیوم نے اس امر پر اپنی تشویش کا اظہار بھی کیا تھا۔

سردار صاحب کا خیال تھا کہ اگر پیرزادہ صاحب ہمارے چند مطالبات مسترد کرنے کا اعلان کر سکتے ہیں تو ہم بھی عوام کو یہ بتانے کے لئے آزاد ہیں کہ وہ مسٹر بھٹو جو اسمبلیاں توڑنے کی بات سننا گوارا نہیں کرتے تھے 'ان سے ہم نے سب کچھ چھین لیا ہے۔ پارٹی کا وہ کنونشن زبردست ہنگامہ آرائی کا شکار ہو گیا تھا اور ایک طالب علم رہنما ذوالفقار زلفی کو بھی اس میں بے حد زدوکوب کیا گیا۔

اتوار ۱۹ جون کو مسٹر بھٹو طرابلس پہنچے اور صدر قذافی سے ملنے کے بعد اسی روز ابوظہبی پہنچ گئے لیکن یہاں پروفیسر غفور احمد نے پشاور پہنچ کر بیان دے دیا کہ حکومت کے رویے نے فضا خراب کر دی ہے۔ نیز یہ کہ اب غیر معینہ عرصہ تک سمجھوتے پر اختلافات برداشت نہیں کئے جائیں گے۔ ادھر نوابزادہ نصر اللہ خان نے لاہور میں پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے اعلان کیا کہ گورنر کی تقرری ہمارے مشورے سے کرنے کا فیصلہ ہوا تھا۔ سمجھوتے کے بارے میں غیر یقینی فضا پیدا کی جا رہی ہے۔ اصغر خان نے کہا کہ عوام کے مطالبات تسلیم ہوئے بغیر حکومت سے سمجھوتہ نہیں ہو سکتا۔ حکومت ویسے بھی تاخیری حربے اختیار کر رہی ہے۔ سردار عبدالقیوم نے کھل کر حفیظ پیرزادہ پر تنقید کی اور الزام عائد کیا کہ وہ "خفیہ اشاروں" پر سمجھوتے کو سبوتاژ کرنا چاہتے ہیں لیکن ہم عوامی تحریک کو سبوتاژ نہیں ہونے دیں گے۔

سوموار ۲۰ جون کو شام ۶ بجے پیرزادہ اور پروفیسر غفور پر مشتمل سب کمیٹی کا اجلاس جس ماحول میں ہوا ہو گا ' ان بیانات کی روشنی میں قارئین خود ہی اس کا اندازہ لگا سکتے ہیں پروفیسر غفور کو بجا طور پر پیر

زادہ سے شکایت تھی کہ ان کے رویے اور بیانات سے پی۔ این۔ اے ہائی کمان کے سامنے پی۔ این۔ اے کی مذاکراتی ٹیم کی پوزیشن مجروح ہوئی ہے۔

پیرزادہ نے جواباً مزید جارحانہ انداز اختیار کیا جس سے چڑ کر پروفیسر غفور یہ کہتے ہوئے اجلاس سے اٹھ گئے کہ "اب آپ سے کوئی بات نہیں ہو سکتی 'مسٹر بھٹو آئیں گے تو انہیں سے بات ہوگی۔ " سردار عبدالقیوم اور میرے درمیان آزاد کشمیر کے سلسلے میں جو سمجھوتہ ہوا تھا ' وہ بھی حفیظ پیرزادہ کے درشت رویے کی نذر ہو گیا اور سردار عبدالقیوم نے پریس کانفرنس میں اعلان کر دیا کہ حفیظ پیرزادہ جان بوجھ کر مذاکرات کو سبوتاژ کر رہے ہیں اور اگر پی۔ این۔ اے اور حکومت پاکستان کے درمیان سمجھوتہ نہیں ہوتا تو ہم آزاد کشمیر کے سلسلے میں بھی کسی سمجھوتے کو تسلیم نہیں کریں گے۔ انہوں نے اسی روز راولپنڈی میں طلباء کے ایک استقبالیہ سے خطاب کرتے ہوئے یہ سنسنی خیز بیان بھی دیا کہ حکومت نے پی۔ این۔ اے کے بعض رہنماؤں کو قتل کرانے کی سازش کی ہے جن میں اصغر خان 'شاہ احمد نورانی اور شیرباز خان مزاری شامل ہیں۔ اسلام آباد میں مفتی محمود نے کہا کہ اتحاد سے مشورے کے بغیر بھٹو کو باہر نہیں جانا چاہئے تھا اور ویسے بھی مجھ سے انہوں نے لاڑکانہ تک جانے کی بات کی تھی۔ سمجھوتے کے بارے میں اب پیرزادہ سے کوئی بات نہیں ہو سکتی۔ انہوں نے عوام سے اپیل کی کہ اگر جمعہ تک سمجھوتے پر دستخط نہیں ہوتے تو جمعہ کو ملک بھر میں یوم احتجاج منایا جائے۔

بھٹو اس روز متحدہ عرب امارات سے کویت پہنچے تھے۔ انہوں نے ابوظہبی ٹیلی ویژن کو ایک طویل انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ حکومت اور اتحاد کے مابین اکتوبر میں انتخابات کا سمجھوتہ ہو چکا ہے 'نیز پاکستان ہر قیمت پر ایٹمی ری پراسیسنگ پلانٹ حاصل کر کے رہے گا۔ انہوں نے تیسری اسلامی سربراہ کانفرنس بلانے کی تجویز بھی پیش کی اور شیخ زید بن سلطان کے ساتھ اپنی بات چیت کو بے حد مفید قرار دیا۔

مجھ سے اسی روز آزاد کشمیر کے صدر سردار ابراہیم سپیکر منشا خان ' پیپلز پارٹی کے صدر پیر علی جان شاہ ' اور ممتاز راٹھور نے وفد کی صورت میں ملاقات کی اور شکایت کی کہ سردار قیوم کے ساتھ سمجھوتے کے بعد ان کا کیا بنے گا؟ میں نے انہیں تسلی دی اور کہا کہ سمجھوتے میں آپ کی آراء مدنظر رکھی جائیں گی۔ چوہدری نور حسین اور عبدالحمید خان نے بھی مجھ سے الگ الگ ملاقاتیں کیں۔ ان کا مطالبہ بھی یہی تھا کہ سمجھوتہ صرف سردار قیوم کی آراء اور مطالبات کی روشنی میں نہ کیا جائے۔

مجھے اس صورت حال کے پیدا ہو جانے کا ملال تھا جس کا باعث حفیظ پیرزادہ بنے تھے اور جس کے سبب ملک میں تلخی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی تھی چنانچہ میں نے پریس کے ذریعے اتحاد کے رہنماؤں سے اپیل کی کہ سمجھوتے کے سلسلے میں بیان بازی کے اس افسوس ناک سلسلے کو بند کر دیں۔ میں نے کہا کہ یہ کسی فریق کی شکست یا دوسرے کی فتح نہ تھی بلکہ درحقیقت جمہوریت کی فتح تھی۔ میں نے اتحاد کے رہنماؤں کو یقین دلایا کہ سمجھوتے سے انحراف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور اگر سمجھوتہ سبوتاژ ہوا تو یہ ملک و قوم کے لئے نیک فال نہ ہوگی .... میرا یہ بیان ریکارڈ پر موجود ہے۔

شام کو میرے اور سردار قیوم کے درمیان مذاکرات کا آخری دور ہوا جس میں یہ طے پا گیا کہ آزاد کشمیر میں انتخابات ۱۰ اکتوبر کو ہوں گے' تاہم پی۔ این۔ اے کا مطالبہ جو انہوں نے ذرا نکھری ہوئی شکل میں میرے سامنے پیش کیا' یہ تھا کہ دس رکنی عمل در آمد کونسل کی آئینی حیثیت کا تعین کیا جائے چونکہ براہ راست اس معاملے کا نہ تو آزاد کشمیر سے کوئی تعلق تھا اور نہ اسے تسلیم کرنا میرے دائرہ کار میں شامل تھا' اس لئے میں نے ان سے درخواست کی کہ اس معاملہ کو وہ مسٹر بھٹو کے لئے چھوڑ دیں' کیونکہ حفیظ پیرزادہ جنہیں اس قسم کے آئینی معاملات پر فیصلے کرنا تھے' ان سے تو پی۔ این۔ اے نے بات ہی ختم کر دی ہے چنانچہ اس فیصلے کے بعد ہمارے درمیان مذاکرات ختم ہو گئے۔

منگل ۲۱ جون کو مسٹر بھٹو نے تہران میں سابق شاہ ایران سے ملاقات کی اور ایک پریس کانفرنس سے بھی خطاب کیا جس کے بعد وہ کابل روانہ ہو گئے انہوں نے امیر کویت سے ملاقات کے بعد کویت ہی میں یاسر عرفات سے بھی ملاقات کی تھی اور امریکہ و اسرائیل کی بعض دکھتی رگوں کو چھیڑا تھا۔ ادھر پروفیسر غفور احمد نے بھی اسی صبح اسلام آباد میں کویت کے سفیر سے ملاقات کی اور انہیں تعطل کے اسباب اور صورت حال سے آگاہ کیا۔ سفیر موصوف نے انہیں تسلی دی کہ یہ معمولی مسئلہ ہے۔ جسے مسٹر بھٹو کی وطن واپسی پر آسانی سے طے کر لیا جائے گا۔

۲۳ جون جمعرات کو وزیر اعظم بھٹو اپنے چھ روزہ غیر ملکی دورے کے بعد کابل سے اسلام آباد پہنچے تو ایئرپورٹ ہی پر انہوں نے حفیظ پیرزادہ سے پوچھا کہ ان کے پیچھے یہ کیا ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوا ہے۔ حفیظ نے کچھ وضاحت کرنا چاہی لیکن اس دوران مسٹر بھٹو کو صحافیوں نے آلیا جن میں غیر ملکی صحافیوں کی کثیر تعداد بھی شامل تھی۔ صحافیوں کا پہلا سوال ہی ان سے سمجھوتے کے بارے میں تھا.......... جس پر مسٹر بھٹو نے بڑی لاچاری کے سے عالم میں انہیں جواب دیا..........

"اب میں کیا بتاؤں؟ میں تو جب گیا تھا ، سمجھوتہ ہو چکا تھا' مجھے نہیں معلوم کہ میرے پیچھے کیا ہو گیا ہے۔ صورت حال کا جائزہ لے کر ہی کچھ بتا سکوں گا۔ "

ان کی واپسی کے فوراً بعد پی۔ ایم۔ ہاؤس میں مفتی محمود' نواب زادہ نصر اللہ خان اور پروفیسر غفور پر مشتمل پی۔ این اے کی مذاکراتی ٹیم اور ہمارے مابین بات چیت شروع ہو گئی جو تقریباً پونے دو گھنٹے تک جاری رہی۔

اس بات چیت میں پی۔ این۔ اے کی ٹیم نے سمجھوتے کا ایک اور ہی مسودہ حکومت کے سامنے رکھ دیا جس میں عمل در آمد کونسل کی تشکیل' اس کے اختیارات' اس کی حیثیت کا آئینی تعین اور اسمبلیاں توڑنے کی تاریخ کے تعین کی بات کی گئی تھی۔ مسٹر بھٹو نے یہ مسودہ دیکھنے کے بعد جو قانونی موشگافیوں کا ایک شاہکار تھا' اپنا سر پکڑ لیا اور مفتی محمود سے جواب دینے کے لئے اگلے روز کی مہلت طلب کی۔ مذاکرات کے اختتام پر میں نے صحافیوں کو بتایا کہ حتمی سمجھوتہ جلد ہو جائے گا اور اسے تحریری شکل بھی دے دی جائے

گی۔ میں نے کہا کہ سمجھوتہ نہ ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے۔

قومی اتحاد کے نئے مسودے میں وہ سب کچھ شامل تھا جس کی طرف شاید انہیں حفیظ پیرزادہ ہی نے اپنی تقاریر اور بیانات کے ذریعے خیال دلایا تھا۔ مثلاً ان کا مطالبہ تھا کہ چاروں صوبوں میں حکومتیں توڑ کر فوری طور پر گورنر راج قائم کیا جائے اور گورنروں کا تقرر پی۔ این۔ اے کے مشورہ سے ہو۔

۲۱ جون جمعہ کو شیخ ریاض الخطیب نے ڈیڈلاک کی اس صورت حال پر مفتی محمود' نواب زادہ نصر اللہ خان اور پروفیسر غفور کے ساتھ تقریباً ۲ گھنٹے تک گفتگو کی اور انہیں یقین دلایا کہ مسٹر بھٹو سمجھوتے کے بارے میں سنجیدہ ہیں۔ وہ مسٹر بھٹو کے دورہ سعودی عرب کے موقع پر سعودی عرب گئے تھے۔ اور اگلے ہی روز پاکستان واپسی کے بعد انہوں نے رابطوں کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ جب کہ ۲۵ جون کو حکومت اور پی۔ این۔ اے کی ٹیموں کے درمیان مذاکرات کا گیارھواں اجلاس ہونا تھا۔

فیصلہ کن موڑ سنسنی خیز لمحات

۲۵ جون ہفتہ کی صبح وزیراعظم نے اپنے دفتر میں چیف آف آرمی سٹاف سمیت جملہ کور کمانڈرز کا اجلاس طلب کیا جس میں حفیظ پیرزادہ ' میں اور جنرل ٹکا خان بھی موجود تھے۔ مسٹر بھٹو نے پی۔ این۔ اے کا تازہ مسودہ جرنیلوں کے سامنے رکھا اور ان سے اس پر رائے طلب کی۔

ایک جنرل نے مسودے پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔

" یہ تو بالکل اس طرح ہے جیسے جنرل اروڑہ نے جنرل نیازی سے سرنڈر کی دستاویزات پر دستخط کرنے کو کہا ہو۔ "

ایک اور جنرل نے شق وار مسودے کا مطالعہ کرنے کے بعد کہا..........

" یہ تو سپر گورنمنٹ کی تشکیل کے لئے کیا جارہا ہے۔ "

ایک جنرل کا فرمان تھا..........

WE HAVE SERIOUS OBJECTIONS
ON SOME CLAUSES

وزیراعظم نے کہا..........

" دیکھئے ' ہمیں حیدر آباد ٹریبونل بھی ختم کرنا ہوگا اور بلوچستان سے فوج بھی واپس بلانا پڑے گی۔ "

اس پر جنرل ضیاالحق پر جوش لہجے میں بولے..........

" یہ نہیں ہو سکتا سر! آپ مجھے موقع دیجئے کہ اس مسئلے پر وہ میری بات سنیں۔ "

مسٹر بھٹو نے کہا..........

" ٹھیک ہے ہم آپ کو بلوائیں گے آپ انہیں آرمی کا نقطہ نظر سنائیں ' کہ اس میں کیا مشکلات ہیں ' دفاع اور ملکی سالمیت کے کون کون سے پہلو اس سے متاثر ہوتے ہیں۔ " .... وہ جنرل ضیاالحق کی اس پیشکش پر خاصے خوش نظر آتے تھے۔

جنرل ٹکا خان نے اس میٹنگ کے دوران اپنی وہ احمقانہ تجویز پیش کی تھی جس کا ذکر جنرل ضیاء الحق

نے متعدد مواقع پر کیا ہے' ان کا فرمان تھا..........

" سر! ہم تو بولنا کہ ان کا پانچ چھ ہزار آدمی صاف کرا دیتے ہیں.......... یہ لوگ ٹھنڈا ہو کر گھر بیٹھ جائے گا۔ " جنرل ضیاالحق کے بقول یہیں سے ان کے ذہن میں بھٹو حکومت کے خاتمے کا خیال پیدا ہوا تھا کیونکہ بھٹو حکومت ملک میں خون خرابہ کرانے پر تلی ہوئی تھی ' حالانکہ میٹنگ میں مسٹر بھٹو سمیت حکومت کے کسی اور رکن نے ٹکا خان کے خیالات کی تائید نہیں کی تھی۔

مسٹر بھٹو نے جرنیلوں کو آخر میں بتایا کہ ہم نے بھی اپنا کارڈ تیار کیا ہے اور ہماری کوشش یہی ہوگی کہ پی۔ این۔ اے اور اپنے کارڈ کو سامنے رکھ کر کوئی مشترکہ فارمولا وضع کیا جائے ' انہوں نے کہا کہ شام کے اجلاس میں وہ بھی اپنا کارڈ پی۔ این۔ اے کے سامنے رکھیں گے۔ اس کے بعد میٹنگ ختم ہو گئی۔

سوا دو گھنٹے جاری رہنے والے اس گیارہویں اجلاس میں مسٹر بھٹو نے سمجھوتے کے لئے اپنا دوسرا ترمیم شدہ مسودہ پیش کر دیا۔ دونوں مسودوں کو سامنے رکھ کر تفصیل سے شق وار گفتگو ہوئی اور متفقہ شقوں کو متنازعہ شقوں سے الگ کر لیا گیا۔ بحث کا زیادہ حصہ عمل در آمد کونسل کی ہیت حاکمہ پر صرف ہوا تھا۔ مسٹر بھٹو نے مفتی محمود کو بتایا کہ ان کے مسودے کی بعض شقوں پر آرمی معترض ہے اور اس سلسلے میں چیف آف آرمی سٹاف ان کے سامنے " آرمی کا نقطہ نظر " بیان کرنا چاہتے ہیں۔

۲۶ جون اتوار کا دن اس اعتبار سے اہم تھا کہ مفتی محمود نے ایک باقاعدہ پریس کانفرنس کی صورت میں حکومت کو انتباہ دیا کہ آئینی تحفظات کے بغیر انتخابات کا بائیکاٹ کیا جائے گا اور ہم اپنے موقف کی وضاحت کے لئے دوست عرب ممالک میں اپنے خصوصی ایلچی بھیجیں گے۔

پروفیسر غفور احمد کے لہجے میں اس سے زیادہ تلخی تھی ' ان کا کہنا تھا کہ

" اتحاد کا حتمی مسودہ آج حکومت کو پیش کر دیا جائے گا ' چاہے وہ اسے قبول کرے یا نہ کرے ' ہم اب مزید انتظار نہیں کر سکتے ' عمل در آمد کونسل کے سلسلے میں ہمارا موقف تبدیل نہیں ہوگا اور اب اگر مذاکرات ناکام ہوتے ہیں تو ہم ایک مرتبہ پھر جیل جانے کے لئے تیار ہیں ' ہماری آج کی دستاویز حکومت کے لئے آخری الٹی میٹم ہوگی۔ ہم تمام مسودے دو تین دن میں اشاعت کے لئے اخبارات کو جاری کر دیں گے اور مرکزی رہنما اپنے اپنے شہروں کو روانہ ہو جائیں گے۔ "

لاہور میں مسجد شہدا کے باہر بیگم نسیم ولی خان اور سردار شیر باز مزاری نے بھی ایک جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے حکومت کی نیت پر بڑے جذباتی حملے کئے جس کے نتیجے میں سنت نگر میں اتحاد اور پیپلز پارٹی کے کارکنوں کے مابین مسلح تصادم ہو گیا جس میں ۸ افراد زخمی ہوئے۔ صورت حال ایک بار پھر وہی نظر آنے لگی تھی۔ جہاں ۱۲ مارچ ۱۹۷۷ء کو پی۔ این۔ اے کی تحریک کے وقت تھی۔

۲۷ جون سوموار کو حفیظ پیرزادہ نے پروفیسر غفور سے ملاقات کر کے پی۔ این اے کا حتمی مسودہ وصول کرنے سے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ میں الٹی میٹم یا دھمکی کے تحت مسودہ وصول نہیں کروں

گا۔ ان کا اصرار تھا کہ اتحاد اپنا الٹی میٹم واپس لے' ورنہ مذاکرات نہیں ہو سکتے۔ مفتی محمود نے ان کے اس بیان کے بعد کہا۔

" پیرزادہ کا بیان حکومت کی طرف سے مذاکرات کی ناکامی کا اعلان ہے "۔

اصغر خان نے بھی پیرزادہ پر کڑی نکتہ چینی کرتے ہوئے ان کے بیان کو افسوس ناک قرار دیا۔

ماحول سخت کشیدہ ہو چکا تھا۔

۲۸ جون منگل کو وزیر اعظم نے اسمبلی چیمبرز میں ایک ہنگامی پریس کانفرنس سے خطاب کیا اور اپنے مؤقف کا اعلان کرتے ہوئے کہا۔ ....

"میں سپر گورنمنٹ قبول نہیں کروں گا"......... یہ وہی ترکیب تھی جو ۲۵ جون کی میٹنگ میں ایک جنرل نے استعمال کی تھی۔ پی۔ این۔ اے نگران عمل در آمد کونسل کو حکومت سے زیادہ اختیارات دینا چاہتی ہے' سمجھوتہ اگر ہو گا تو آئینی تقاضوں کے مطابق' ورنہ نہیں ہو گا' تعطل بڑھے گا تو بات تمام ہی سیاستدانوں کے ہاتھ سے نکل جائے گی' پی۔ این۔ اے کو حکومت میں شامل کرنے کا مطالبہ میں تسلیم نہیں کروں گا۔ " مجھے حکومت کی کوئی پروا نہیں .... میں ہر وقت لاڑکانہ جانے کے لئے تیار ہوں' پھر چاہے فرشتے آئیں .... یا کوئی راسپوٹین! اور سرمایہ داروں کی تو ایسی چمڑی ادھیڑوں گا کہ ان کی آنے والی نسلیں تک یاد رکھیں گی۔ "

مجھے یاد ہے ان کی اس پریس کانفرنس کے بعد شیخ ریاض الخطیب نے ان سے ملاقات کر کے انہیں جذباتی نہ ہونے کا مشورہ دیا تھا۔

اصغر خان نے مسٹر بھٹو کی تمام باتوں کا جواب اُسی روز ٹیکسلا میں ایک بڑے جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے دیا اور آخر میں یہ دھمکی بھی دی کہ

"اب ہمارا مطالبہ وزیر اعظم کا استعفیٰ ہو گا۔ "

ادھر پیپلز پارٹی کا حال یہ تھا کہ وزیر اعظم کے ایما پر بلائے جانے والے ملتان کنونشن میں کارکنوں نے ایک دوسرے پر ہی کرسیاں اور چاقو چلائے۔ ناصر علی رضوی اور ڈاکٹر غلام حسین جو پارٹی کے ڈپٹی سیکرٹری اور سیکرٹری جنرل تھے بیٹھے ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہے' پارٹی کے کارکنوں اور رہنماؤں کو صورت حال کی سنگینی کا ذرا بھی احساس نہ تھا کہ وہ کس منہ زور سیلاب کے دھارے کی راہ میں کھڑے ہیں اور کوئی دم جاتا ہے کہ پانی ان کے سروں سے گزر جائے گا۔ وہاں اب بھی ایک دوسرے پر الزام تراشیاں گالی گلوچ اور شکوک و شبہات کے اظہار کا سلسلہ جاری تھا۔

شیخ ریاض الخطیب کی ملاقاتوں کا اس دن یہ مثبت نتیجہ نکلا کہ مسٹر بھٹو نے ٹیلی فون پر مفتی محمود سے بات چیت کی اور انہیں اگلے روز یعنی بدھ ۲۹ جون کو ملاقات کی دعوت دی۔ بھٹو صاحب نے مفتی

صاحب کو یہ یقین دہانی بھی کرائی کہ اتحاد کے کسی رہنما کو گرفتار نہیں کیا جائے گا اور کل انشاءاللہ سمجھوتہ ہو جائے گا۔

قومی اتحاد کے رہنماؤں کا مرکز جناب ارشد چوہدری کی قیام گاہ تھی ہی۔ آئی۔ ڈی نے اطلاع دی .وہاں یہ فیصلہ ہوا ہے کہ قومی اتحاد کے رہنما اسلام آباد سے اپنے اپنے شہروں کو لوٹ جائیں گے مگر جناب ریاض الخطیب کی کوششوں سے ان کی یہ روانگی رُک گئی اور ۲۹ جون کو پرائم منسٹر ہاؤس میں مسٹر بھٹو اور مفتی محمود کے درمیان ایک گھنٹہ تک مذاکرات ہوئے ، جن میں کوئی معاون شریک نہ تھا' ان مذاکرات میں طے پایا کہ پیرزادہ اور پروفیسر غفور پر مشتمل سب کمیٹی اتحاد کے مسودے پر غور کرے گی اور اپنی اپنی تجاویز مذاکراتی ٹیموں کے اجلاس میں پیش کرے گی۔ سب کمیٹی کا اجلاس ۳۰ جون جمعرات تک جاری رہا اور پیرزادہ اور پروفیسر غفور نے بغیر کسی اتفاق رائے کے اپنی اپنی تجاویز اور اعتراضات کے نوٹس بنا لئے جو اگلے روز یکم جولائی کو مذاکراتی ٹیموں کے آخری اجلاس میں پیش ہونا تھے۔ مسٹر بھٹو مفتی محمود کے ساتھ اپنی ملاقات میں انہیں قائل کر چکے تھے کہ وہ بعض امور پر آرمی کا نقطہ نظر بھی کل سن لیں جس کے بعد وہ خود فیصلہ کریں کہ کون سا مطالبہ ملک و قوم کے حق میں مفید ہے اور کون سا غیر مناسب۔

یکم جولائی کو مذاکرات پی۔ ایم ہاؤس کے کیبنٹ روم میں صبح ساڑھے دس بجے شروع ہوئے۔ آرمی کا نقطہ نظر پیش کرنے کے لئے مسلح افواج کے سربراہوں کی آمد گیارہ بج کر دس منٹ پر شروع ہوئی۔ اس سے پیشتر مسٹر بھٹو اتحاد کے مسودے کا مطالعہ کر کے مفتی محمود اور ان کے دونوں معاونین کو بتاتے رہے کہ بعض شقوں پر آرمی معترض ہے اور ہمیں آرمی سے مصالحانہ انداز اختیار کرنا ہو گا۔

تقریباً سوا بارہ بجے جنرل ضیاالحق میٹنگ روم میں داخل ہوئے۔ جنرل ضیاالحق کے ہمراہ ایک نوجوان اور بھی تھا جس نے بغل میں کچھ نقشے دبا رکھے تھے۔ جنہیں اس نے نہایت احتیاط کے ساتھ دیوار پر لٹکا دیا۔ یہ نوجوان خالد محمود عارف تھے۔ متین' سنجیدہ اور خاموش طبع عارف پورے اجلاس کے دوران ایک مرتبہ بھی نہیں بولے اور خاموشی سے مختلف چہروں کا جائزہ لیتے رہے۔ ہم نے انہیں جنرل ضیاالحق کے ساتھ پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ خالد محمود عارف مجھے فوجی جرنیل کم' دانشور اور فلاسفر زیادہ نظر آتے تھے۔ اس امر کا باقاعدہ انکشاف بہت عرصہ بعد ہوا کہ وہ شعر بھی کہتے ہیں اور سچ مچ اچھے شعر کہتے ہیں۔

جنرل ضیاالحق نے اپنی اسٹک سنبھالی اور اس کی نوک نقشے کے مختلف مقامات پر رکھ کر پاکستانی فوج اور سرحدوں سے باہر غیر ملکی نرغے کے بارے میں بتانے لگے۔ فوجی نقطہ نظر سمجھاتے سمجھاتے اچانک جنرل ضیاالحق نے ملکی سیاسی بحران اور اس کے اثرات و مضمرات پر لیکچر دینا شروع کر دیا اور سیاسی مفاہمت کی ضرورت پر زور دیا جس پر نواب زادہ نصراللہ خان برافروختہ ہو کر بولے

"ہمیں آپ سے سیاسی وعظ نہیں سننا' ہم سیاست کو خوب سمجھتے ہیں' اگر آپ اپنا یا آرمی کا فوجی نقطہ نظر بیان کر چکے ہیں تو یہ کافی ہے۔ "

ان کی برافروختگی دیکھ کر جنرل ضیاالحق ششدر سے ہو گئے ماحول کشیدہ سا ہو چلا تھا مگر بھٹو صاحب نے اپنی ڈپلومیٹک مہارت سے اسے ٹھنڈا کر دیا تھوڑی دیر کے بعد جرنیل بھی اجلاس سے چلے گئے اور اجلاس آٹھ بجے رات پر ملتوی ہو گیا۔

مجھے اسی سہ پہر راولپنڈی میں اقلیتوں کی ایک ریلی سے خطاب کرنا تھا مجھے یہ خبر مل چکی تھی کہ لاہور کے مختلف علاقوں میں پی۔ این۔ اے اور پیپلز پارٹی کے کارکنوں کے درمیان کئی جگہ تصادم ہوا ہے اور پیپلز پارٹی کے جھنڈے اتحاد کے کارکنوں نے نذر آتش کئے ہیں اُدھر قومی اتحاد نے اسی روز راولپنڈی میں بھی ایک زبردست جلوس نکالا تھا اور عہد کیا تھا کہ اب تحریک مزید شدت سے چلائی جائے گی۔ جب میں اقلیتوں کی ریلی سے راولپنڈی پریس کلب میں خطاب کر رہا تھا تو میرا دل صورت حال کی سنگینی اور لوگوں کی جانب سے اس کے عدم ادراک کے باعث خون کے آنسو رو رہا تھا .... میں نے اپنی تقریر کا اختتام حضرت قتیل شفائی کے ان اشعار پر کیا جو اس سارے ماحول کی حقیقی عکاسی کر رہے تھے جس سے پورا ملک دو چار تھا۔

رشتہ دیوار و در تیرا بھی ہے' میرا بھی ہے
مت جلا اس کو' یہ گھر تیرا بھی ہے میرا بھی ہے

کھا گئی کل ناگہاں جن کو سیاست کی صلیب
ان میں اک نورِ نظر تیرا بھی ہے' میرا بھی ہے

کیوں لڑیں آپس میں ہم ایک ایک سنگ میل پر
اس میں نقصان سفر تیرا بھی ہے' میرا بھی ہے

کاش! اس وقت متذکرہ اشعار کے پس پشت کار فرما احساس دردمندی کا ادراک کیا جا سکتا!

یکم جولائی کی شب ۸ بجے مذاکرات کا دوسرا اور فیصلہ کن دور شروع ہوا۔ ایک ایک شق پر مرحلہ وار پروفیسر غفور نے اپنا نقطہ نظر اور پیرزادہ نے اپنے اعتراضات پیش کئے۔ درمیان میں وزیر اعظم بھی نوٹس لیتے رہے اور مفتی محمود صاحب سے زیر بحث نکتہ پر بحث بھی کرتے رہے۔ کہیں مفتی محمود اور ان کے ہمراہی قائل ہو گئے' کہیں مسٹر بھٹو کو سرنڈر کرنا پڑا۔ مذاکرات طویل ہوتے چلے جا رہے تھے۔ جن نکات پر اتفاق رائے ہو رہا تھا' انہیں علیحدہ نوٹ کیا جاتا رہا اور جب تک اتفاق رائے نہ ہوا' دونوں جانب سے اس پر دلائل دیئے جاتے رہے۔ بالآخر ساڑھے تیرہ گھنٹے طویل اجلاس صبح ساڑھے چھ بجے ختم ہوا'

جب ۲ جولائی کا سورج طلوع ہوا تو تمام امور پر سمجھوتہ ہو چکا تھا۔ اتحاد کے حتمی مسودے میں تبدیلیاں عمل میں آ گئی تھیں۔ مفتی محمود نے یہ کہہ کر اجلاس کو لپیٹا کہ آج ۲ جولائی کو ہم پی۔ این اے کی مرکزی کونسل میں اس سمجھوتے کو رکھیں گے اور اگر کونسل نے منظوری دے دی تو معاہدے پر دستخط ہو جائیں گے۔

اس روز قومی اتحاد کی ہائی کمان کا اجلاس تحریک استقلال کے رہنما کرنل (ریٹائرڈ) تصدق حسین کی رہائش پر سارا دن جاری رہا۔ مسودے پر گرما گرم بحث ہوئی اور اصغر خان نے مفتی محمود اور پروفیسر غفور کو آڑے ہاتھوں لیا' تھکن سے نڈھال پروفیسر غفور اور مفتی محمود نے اصغر خان سے پوچھا کہ "آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟ ہم لوگ کیا کرتے؟"

انہوں نے اپنے مخصوص لہجے میں گرجتے برستے ہوئے جواب دیا۔

"آپ اجلاس سے اٹھ کر چلے آتے۔ کس گدھے نے آپ کو رات بھر جاگ کر مذاکرات کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ یہ تو بھٹو کی پرانی اور مخصوص چال ہے۔ وہ اس طرح تو جگا جگا کر مارتا ہے۔ یہ اکارڈ سراسر الفاظ کی ہیرا پھیری ہے جسے سمجھنے کی آپ لوگوں کو توفیق ہی نہیں ہو سکتی۔ میں اس سمجھوتے پر لعنت بھیجتا ہوں' اور اگر آپ لوگوں نے اس پر دستخط کئے تو یاد رکھیں کہ میں آپ کے خلاف بھی تحریک چلاؤں گا اور عوام کو بتاؤں گا کہ آپ لوگوں نے شہیدوں کے خون سے غداری کی ہے۔"

اصغر خان کی تلخ و ترش باتوں کو سردار شیرباز مزاری اور بیگم نسیم ولی خان کے غصے نے اور مہمیز کیا' تاہم مولانا نورانی کے سمجھانے بجھانے پر اصغر خان قدرے پر سکون ہوئے مولانا شاہ احمد نورانی نے استفسار کیا کہ اب کیا کرنا چاہئے۔

اصغر خان نے بھڑک کر کہا .... "اب آپ لوگ درمیان سے ہٹ جائیں' میں خود تمام معاملات کو ہینڈل کروں گا اور فوج کی طرف سے یہ گارنٹی بھی میں دینے کو تیار ہوں کہ مارشل لاء لگنے کے بعد نوے دن کے اندر اندر فوج الیکشن کرا دے گی۔"

ان کی اس بات پر اجلاس میں سناٹا چھا گیا۔ مفتی محمود نے کافی دیر کی خاموشی کے بعد کہا..........

"آپ جانتے ہیں آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ فوج آئی تو بھٹو کا خاتمہ تو کرے گی ہی ہاتھ ہمارے بھی کچھ نہ آئے گا۔"

اصغر خان نے ان کی بات کا جواب تحقیر آمیز انداز میں "ہوں" کہہ کر دیا اور اجلاس سے نکل گئے۔

پیر پگارا نے معاملات کو دوبارہ ٹھیک کرنے اور پی۔ این۔ اے کو باہمی انتشار سے بچانے کے لئے مسودہ قانونی مشیروں کے حوالے کیا اور انہیں کہا کہ

"آپ اس پر اپنے اعتراضات ڈرافٹ کر دیں کل ۳ جولائی کو مذاکراتی ٹیم وہ اعتراضات بھٹو

کے پاس لے جائے گی اور اگر اس نے اتفاق کیا تو سمجھوتہ ہو جائے گا' ورنہ نہیں ہو گا۔ "

۳ جولائی کی صبح سردار عبدالقیوم مجھ سے ملنے کے لئے آئے اور بیٹھتے ہی کہنے لگے ....

" ہمارے بعض لیڈروں کا آرمی سے رابطہ ہے اور خطرہ ہے کہ آرمی ٹیک اوور نہ کر لے' آپ مسٹر بھٹو سے کہیں کہ سمجھوتے پر دستخط کرنے میں تاخیر نہ کریں' بلکہ بہتر ہو گا کہ آپ مجھے اور مفتی صاحب کو بھٹو صاحب سے ملوا بھی دیں۔ "

میں کابینہ کے اجلاس سے لیٹ ہو رہا تھا لیکن سردار عبدالقیوم کے سنسنی خیز انکشاف کے بعد میں نے اپنے بیڈ روم میں آ کر گرین فون پر وزیر اعظم سے براہ راست رابطہ کیا اور انہیں سردار صاحب کے انتباہ سے آگاہ کیا۔

وزیر اعظم غالباً ناشتہ کر رہے تھے .... ساری بات سن کر بولے ....

" یار انہیں چھوڑو یہ لوگ فقط مجھ سے انٹرویو لینے کے بہانے تلاش کر رہے ہیں۔ "

یا خدا! میں ان کی بات سن کر ہکا بکا رہ گیا۔ ان انتہائی نازک لمحات میں بھی انہیں کس شدت سے یہ احساس تھا کہ ان سے ملنا کتنا اہم ہے۔ میں نے انہیں بتایا کہ چونکہ سردار صاحب میرے پاس بیٹھے ہیں اس لئے میں میٹنگ میں ذرا تاخیر سے پہنچوں گا۔ جواب ملا ....

" ٹھیک ہے' تم انہیں بھگتا کر آ جانا " ....

میں نے سردار عبدالقیوم سے معذرت کی اور بتایا کہ اس وقت تو بہت ضروری اجلاس میں جا رہا ہوں واپسی پر ہی انہیں بتا سکوں گا کہ وزیر اعظم سے ان کی ملاقات کب ہو سکتی ہے۔

میں بھیانک سوچوں کے سمندر میں غرق کابینہ کے اجلاس میں شرکت کے لئے پی۔ ایم ۔ ہاؤس پہنچا۔ تقریباً پون گھنٹہ پہلے اجلاس شروع ہو چکا تھا۔ جونہی میں کیبنٹ روم کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا' میری نظر جنرل ضیاالحق پر پڑی جو وزیر اعظم کے بالمقابل بیٹھے ہوئے تھے .... مجھے دیکھتے ہی مسٹر بھٹو مسکراتے ہوئے بولے ....

" لو وہ آ گئے! اب خود ہی سردار صاحب سے ہونے والی بات بتائیں گے۔ "

غالباً یہی موضوع اس وقت زیر بحث تھا .... میں نے اختصار کے ساتھ سردار عبدالقیوم سے ہونے والی گفتگو سے کابینہ کو آگاہ کیا۔ جنرل ضیاء الحق شاید پہلے ہی سردار عبدالقیوم کے خدشات کو مسترد کر چکے تھے۔ وزیر اعظم نے دیگر وزراء کو اس پر اظہار خیال کی دعوت دی تو سب سے پہلے حفیظ پیرزادہ نے اسے پی۔ این۔ اے کا " نیا شوشہ " قرار دیا اور پھر میں نے دیکھا کہ اکثر وزراء ان کے ہم خیال تھے اور وزیر اعظم بھٹو کی مدح سرائی میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کر رہے تھے۔

سندھ کے وزیر اعلیٰ غلام مصطفیٰ جتوئی بھی خصوصی دعوت پر کابینہ کے اجلاس میں موجود تھے ان کی خاموشی اس بات کی دلیل تھی کہ وہ سردار عبدالقیوم کی اطلاع کو میری ہی طرح مبنی بر حقیقت محسوس کر رہے ہیں۔

انیسواں باب

کچھ متفرق باتیں

مذاکرات کی کہانی' ایک دو اہم موڑ کاٹتے ہوئے اختتام کو پہنچنے والی ہے مگر مجھے لگتا ہے' بیچ میں کہیں کہیں کچھ باتیں چھوٹ گئی ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے' اختتامیہ تک پہنچنے سے پہلے پہلے انہیں بھی ریکارڈ کر لیا جائے پھر ایک دو سوال ایسے ہیں جو ہر کہ ومہ کی زبان پر ہیں کچھ تھوڑا ان سے بھی تعرض ہو جائے تاکہ قارئین اس تاریخی دستاویز میں کسی طور کوئی کمی محسوس نہ کریں۔

.... مذاکراتی ٹیموں کا تذکرہ ہو چکا' پی۔ این۔ اے کی طرف سے اس میں حضرت مولانا مفتی محمود' مرحوم نوابزادہ نصر اللہ خان اور پروفیسر عبدالغفور احمد شریک تھے' یہ تاثر پایا جاتا ہے' جیسے ان کے نام بھی خود بھٹو صاحب نے تجویز کئے تھے' یہ صحیح نہیں' مذاکراتی ٹیم کا انتخاب تمام و کمال حضرت مفتی محمود نے اپنے ساتھیوں کے مشورے سے کیا تھا یہ بات بھی صحیح نہیں کہ وہ اصغر خان کو اپنی ٹیم میں شامل کرنا چاہتے تھے لیکن بھٹو صاحب نہیں مانے۔

مذاکرات کے سبھی اجلاس کیبنٹ روم میں ہوئے جو وزیر اعظم کے دفتر کے ساتھ ملحقہ کمرہ تھا اور جہاں کابینہ کے اجلاس ہوا کرتے تھے' ہم میز پر آمنے سامنے بیٹھا کرتے تھے' دائیں ہاتھ پی۔ این۔ اے والے' بائیں ہاتھ ہم۔ نشستوں کی ترتیب یوں تھی کہ مفتی محمود صاحب کے دائیں ہاتھ پر نوابزادہ نصر اللہ خان صاحب اور بائیں ہاتھ پروفیسر صاحب اور بھٹو صاحب کے داہنے ہاتھ پیرزادہ اور بائیں طرف میں' اکثر ایسا ہوتا کہ ہم دونوں میٹنگ میں آنے سے پہلے وزیر اعظم کے ہاں پہنچتے وہاں چائے پر آنے والے اجلاس کے بارے میں مشورہ کرتے اور پھر اکٹھے ہی اجلاس میں آتے' ہم دونوں کو جو کچھ کہنا ہوتا وہ اجلاس سے پہلے ہی بھٹو صاحب کے گوش گزار کر دیتے' مذاکرات میں ہم بہت کم بولتے ہماری طرف سے بھٹو صاحب ہی اکثر بات کرتے' اجلاس کے بعد کارروائی پر پھر باہمی تبصرہ ہوتا' بھٹو صاحب ڈسپلن اور رکھ رکھاؤ کے سخت پابند تھے انہیں بہت برا لگتا اگر ان کی ٹیم میں مذاکرات کے دوران پی۔ این۔ اے والوں کے سامنے کوئی اختلاف پیدا ہو جاتا یہ سارا اہتمام اسی مقصد کے لئے تھا۔

پی۔ این۔ اے کی ٹیم میں بھی یقیناً اجلاس میں آنے سے پہلے مشورہ ہوتا ہو گا۔ مگر وہ پھر بھی نسبتاً اظہار خیال میں آزاد تھے' مفتی محمود صاحب قبلہ اصلاً تو درس و تدریس کے آدمی تھے مگر ان میں مولویانہ تنگ

نظری اور ضد نام کو نہ تھی' کھلے ذہن کے آدمی تھے' جہاں معقول بات سامنے آئی اور وہ مان گئے۔
مفتی صاحب کے ساتھ تو میری پرانی یاد اللہ تھی' ۱۹۶۰ء میں گیارہ دینی جماعتوں کے بننے والے اسلامی محاذ کے وہ صدر تھے اور میں سیکرٹری جنرل' ہم نے ایک ساتھ کئی مرتبہ سفر بھی کیا تھا اور جلسوں میں بھی شرکت کی تھی ان کی خوش گوار عادات اور وسیع الفطرتی سے تو میں بخوبی آگاہ تھا لیکن نواب زادہ نصر اللہ خان کو میں پہلی مرتبہ قریب سے دیکھ رہا تھا ان کو ملا اور مذاکرات میں ان کی اصول پرستی' جمہوریت دوستی اور کارگزاری دیکھی تو بار بار یہ شعر یاد آتا رہا کہ ؎

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

پروفیسر غفور جماعت اسلامی میں ہمارے پرانے ساتھی تھے گو ہمارے زمانے میں ان کا شمار ابھی اکابر میں نہ ہوا تھا' بے حد محنتی اور سلیقے کے آدمی ہیں' مزاج کے اعتبار سے جماعت کے آدمی نہیں لگتے' اختلاف کے باوجود عزت کرنا بھی جانتے ہیں اور عزت کرانا بھی' متعلقہ کاغذات کا پلندہ ہمیشہ انہی کے ہاتھوں میں ہوتا' اپنی مذاکراتی ٹیم میں لکھنے پڑھنے کا زیادہ تر کام انہیں ہی کرنا پڑتا۔
ہماری ٹیم میں بھٹو صاحب کی "مذاکراتی مہارت" تو عالم آشکارا تھی بڑے بڑے بین الاقوامی معرکے انہوں نے سر کئے تھے' مشکل سے مشکل اور جذباتی سے جذباتی مسئلے میں بھی وہ فضا کو تلخ اور بوجھل نہیں رہنے دیتے تھے' کبھی کبھی ہلکے پھلکے مزاح کی پھلجھڑی بھی چھوڑ دیتے' وہ ایک ماہر سوداگر کی طرح بارگین (BARGAIN) کرتے۔
ہمارے دوست حفیظ پیرزادہ بے حد ذہین تھے اور محنت کرنے پر آتے تو اس میں بھی کمی نہ کرتے۔ البتہ مزاجاً اور طبعاً حقیقت پسند نہ تھے کبھی جذباتی ہو جاتے تو کبھی ضرورت سے زیادہ پر امید۔
میں اجلاس کے دوران اکثر نوٹ لیتا رہتا' مجھے جو کچھ کہنا ہوتا تھا' میں بھٹو صاحب سے اجلاس سے پہلے یا بعد میں ہی کہہ لیا کرتا۔
اجلاس کے دوران کی ایک بات خاص طور پر یاد رہے گی۔
مفتی صاحب مستقلاً پان خور نہ تھے مگر کبھی کبھی موڈ میں آتے تو پان سے بھی شوق فرمایا کرتے وہ اپنے پان کسی دکان سے خرید کر ساتھ ہی لے آیا کرتے تھے' حضرت مولانا شاہ احمد نورانی کی طرح پان کی ڈبیہ ان کے پاس نہ ہوتی' اب کیبنٹ روم میں اگالدان کہاں' مفتی محمود صاحب پان خوری کے ایسے ماہر بھی نہ تھے کہ پیک تھوکنے کی انہیں ضرورت ہی محسوس نہ ہو مذاکرات کی ٹیبل پر پڑے ہوئے ایش ٹریز میں پیک ڈالتے رہتے' سنگ مرمر سے بنے ہوئے یہ خوبصورت ایش ٹرے' لال لال رنگ کی پیک سے بعض اوقات لبالب بھر جاتے اجلاس کے بعد بھٹو صاحب خوش گوار موڈ میں ہوتے تو کہا کرتے یہ ہیں مستقبل

نہیں معلوم کہ آداب مجلس کیا ہوتے ہیں۔
کے متبادل پرائم منسٹر جنہیں یہ ~~~ مفتی محمود صاحب
دوبار وقت بہت زیادہ ہو جانے کی وجہ سے ہم نے کھانا بھی ایک ساتھ کھایا' ~~~
شوگر کے مریض تھے لیکن اس کے باوجود میٹھا انہیں بے حد مرغوب تھا' بھٹو صاحب نے خاص طور پر سویٹ ڈشز بنوائیں' کھانے کی میز پر خوب خوب فقرے بازی ہوئی' مفتی صاحب کا کہنا تھا کہ پروفیسر اور میں بعد میں اپنی بریفنگ کے دوران اخبار نویسوں کو یہ نہ بتائیں کہ ہم نے پرائم منسٹر کا کھانا کھایا' "لوگ کہیں گے ہم مر رہے ہیں اور ہمارے لیڈر ضیافتیں اڑا رہے ہیں۔"
شروع کے دو تین اجلاسوں میں گرفتار شدگان اور نظر بندوں کی رہائی پر پی۔ این۔ اے کے لیڈروں نے بہت زیادہ زور دیا' مفتی صاحب خاص طور پر اپنے حلقہ انتخاب ڈیرہ اسماعیل خان کے بعض افراد کا ذکر کرتے' میری ڈائری میں شروع کی اس طرح کی ایک میٹنگ میں ہونے والی بات چیت من و عن یوں ہے۔

مفتی صاحب......... ڈی آئی خان میں شیخ عزیز الرحمٰن گلشیر' محمد عظیم اور مولانا عبدالسلام کو ابھی تک رہا نہیں کیا گیا۔
بھٹو......... مفتی صاحب! بنیادی بات پر آئیں ورنہ خواہ مخواہ تاخیر ہوگی۔
مفتی صاحب......... پھر مین پوائنٹ تو نئے الیکشن اور اس کے کرانے کے انتظامات اور دوسرے متعلقہ امور ہیں۔
بھٹو......... کیا سیٹوں پر مصالحت نہیں ہو سکتی؟
مفتی صاحب......... ہم نے تحریک عوام کو حق دلانے کے لئے چلائی ہے سیٹوں کے لئے نہیں۔
بھٹو......... تو بات ختم' پیر صاحب نے کہا تھا "ری پولنگ کو رول آوٹ نہ کرو" جیسا کہ پروفیسر غفور نے بھی کہا تھا۔
پروفیسر غفور......... ہاں! اور دوسرے بھی اس سے متفق تھے۔
نواب زادہ......... ری پولنگ؟
بھٹو......... جیسے سات تاریخ پھر آ رہی ہے' سب پر مقابلہ ہوگا۔
پروفیسر غفور......... پھر ٹھیک ہے۔
بھٹو......... پھر 'ہل' کا نشان میں واپس لے لوں گا۔
مفتی صاحب......... یہ بعد کی بات ہے۔
نواب زادہ......... کیا کمپیئن نہیں ہوگی؟
بھٹو......... ہاں۔
نواب زادہ......... بلوچستان میں کیا ہوگا جہاں ہم نے الیکشن نہیں لڑا۔

بھٹ.........اس پر فوج کے کچھ خیالات ہیں' وہ کہتے ہیں کہ ہم فوراً وہاں سے ہٹ نہیں سکتے' ہمیں وہاں سے ہٹنے میں چھ ماہ لگیں گے۔

پروفیسر غفور.........اگر وہ آپریشن بند کر دیں تو کافی ہے۔

بھٹو.........وہ کہتے ہیں " پہل ادھر سے ہوئی ہے۔"

مفتی صاحب.........انڈر سٹینڈنگ ہو گی تو پہل کیوں ہو گی؟

پروفیسر غفور.........آپ کا بیان کافی ہو گا' اب سچوایشن نارمل ہے' فوج سے کنٹرول لے لیا گیا ہے۔

بھٹو.........مگر وہ کہتے ہیں نارمل ہونے میں چھ ماہ لگیں گے' خیر "کولنگ آف پیریڈ" تو ہمیں چاہئے ہو گا' ہم اپنی حکومت کی مدت میں اگست ۱۹۷۸ء تک ایک سال بڑھا سکتے تھے۔

پیرزادہ.........اکتوبر ۱۹۷۸ء تک۔

پروفیسر غفور.........الیکشن کمیشن کو پورے اختیارات ملنے چاہئیں۔

بھٹو.........وہ کوئی پرابلم نہیں۔

اجلاس کے پہلے روز ہی بھٹو صاحب نے پی۔ این۔ اے کے لیڈروں کو ان سیٹوں کی پیش کش کی جن پر ان کے نزدیک دھاندلی ہوئی تھی۔ ہم ان نشستوں پر کامیاب ہونے والے امیدواروں سے استعفےٰ لے لیتے ہیں اور ری پولنگ میں اپنے آدمی کھڑے نہیں کرتے مگر پی۔ این۔ اے کی ٹیم نے اس آفر کو قبول نہیں کیا۔

قومی حکومت بنانے کی تجویز بھی زیر غور آئی' بھٹو صاحب ہی اس کے مجوز تھے' ان کا کہنا تھا کہ وہ کابینہ میں پی۔ این۔ اے کے چار وزیر لینے کو تیار ہیں مگر ان کے محکموں کا انتخاب وہ خود کریں گے' پی۔ این۔ اے کی ٹیم آدھے وزیر چاہتی تھی مگر بھٹو صاحب چار کی تعداد سے آگے نہیں بڑھ رہے تھے' اگلے روز میں نے دوران مذاکرات پانچ وزارتوں کی پیش کش کر دی میرا خیال تھا کہ شاید پی۔ این۔ اے والے مان جائیں گے اور مذاکرات کے آغاز ہی میں قومی یک جہتی کی کوئی صورت نکل آئے' ویسے بھی میں جانتا تھا کہ بھٹو صاحب کی کابینہ میں آکر پی۔ این۔ اے کے وزراء بھٹو صاحب ہی کا ساتھ دیں گے پی۔ این۔ اے عوام میں اپنی ساکھ کھو بیٹھے گی لوگ کہیں گے کہاں تو وزیر اعظم سے استعفےٰ کے مطالبے کئے جا رہے تھے اور کہاں اب اس کو وزیر اعظم بنا کر پی۔ این۔ اے حکومت میں شریک ہو گئی ہے' میں نے پانچ وزارتوں کی بات کی تو بھٹو صاحب خفا ہو گئے تاہم ان کی ٹیم کے ایک رکن نے یہ پیش کش کی تھی اب وہ اس سے انکار بھی نہیں کر سکتے تھے۔ مگر افسوس کہ پی۔ این۔ اے وزارتوں کی نصف تعداد لینے پر بضد تھی' پانچ وزارتیں بھی اسے مطمئن نہ کر سکیں۔

ایک سوال عوامی حلقوں میں یہ بھی زیر بحث رہتا ہے کہ کیا یہ صحیح ہے کہ بھٹو صاحب' جنرل ضیاالحق

کو ہٹانے والے تھے انہوں نے ڈیفنس کے سیکرٹری جنرل غلام اسحٰق خان (حالیہ چیئرمین سینٹ) سے بات کی تو انہوں نے آگے جنرل ضیاء الحق کو بتا دیا وہ الرٹ ہو گئے اور انہوں نے بھٹو صاحب کے وار سے پہلے خود ان پر وار کر دیا۔ اسی صلے میں غلام اسحٰق خان کو مارشل لاء کے دور میں یہ اہمیت ملی کہ وہ سینیئر منسٹر بن گئے اور اب تک جنرل ضیاالحق کے نفس ناطقہ چلے آتے ہیں۔

جہاں تک جنرل ضیاالحق کو ہٹانے کا تعلق ہے' بھٹو صاحب یقیناً یہ فیصلہ کر چکے تھے' اس کا اشارہ وہ جنرل عبداللہ ملک کو بھی دے چکے تھے بلکہ بعض قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ وہ جنرل عبداللہ ملک ہی کو جنرل ضیاالحق کی جگہ مقرر کرنے والے تھے اس کے لئے وہ مناسب موقع کے منتظر تھے' سیاسی تصفیہ ہو جاتا اور ملک میں امن و امان قائم ہو جاتا اقتدار پر ان کی کامل گرفت ہو جاتی تو تب وہ یہ اقدام کرتے مگر ابھی تو وہ مرحلہ ہی نہیں آیا تھا کہ اس کا ذکر وہ کسی سے کرتے' راز داری اور دل کی بات دل میں رکھنے کا انہیں حیرت انگیز ملکہ تھا اور پھر اگر وہ یہ بات کرتے بھی تو ٹکا خان سے تو کر سکتے تھے غلام اسحٰق خان سے تو کسی صورت وہ ایسی راز کی بات نہ کرتے۔

غلام اسحاق خان سے بھٹو صاحب کی کبھی نہیں بنی' مجھے وہ اجلاس یاد ہے جس میں دیر کے لوگوں کے خلاف آرمی ایکشن پر غور و خوض ہوا' صوبوں کے گورنر بھی تھے اور کابینہ کے اراکین بھی' جنرل فضل حق علاقے کے کور کمانڈر تھے' اس وقت بھی دبنگ آدمی تھے انہوں نے بریفنگ دی' سب نے باری باری اظہار خیال کیا' غلام اسحاق خان کی باری آئی تو انہوں نے کہا میں اس سے اتفاق نہیں کرتا' آرمی ایکشن غلط ہے' یہ صورت حال سول حکام کی مس ہینڈلنگ کا نتیجہ ہے' جنگلات کی کمائی پر ہی دیر کے عوام کی زندگی کا انحصار تھا آپ نے ان سے یہ حقوق چھین لئے وہ یہ بتانے کے لئے لانگ مارچ کرنا چاہتے تھے۔

"یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے کشمیر میں قربانیاں دی تھیں اب یہ پاکستان سے کس طرح ایسے منحرف ہو سکتے ہیں کہ اس کے خلاف بغاوت کر دیں"

بھٹو صاحب کو حکومت کے ایک سیکرٹری کی طرف سے کھلم کھلا اس طرح کا اختلاف اچھا نہ لگا انھوں نے کہا۔

"جو لوگ حکومت کی پالیسی سے اتفاق نہیں کرتے وہ حکومت میں نہ رہیں"۔

اگلے دن یہ خبر گرم تھی کہ غلام اسحاق خان استعفیٰ دے رہے ہیں پرائم منسٹر نے انہیں بلایا اور کہا۔

"میں آپ کی قدر کرتا ہوں مگر میں جرنیلوں کی موجودگی میں یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ آپ کہیں یہ حکومت اور فوج کی غلطی ہے آپ استعفیٰ نہ دیں' کل پریڈ ہے آپ میرے ساتھ ہیلی کاپٹر میں کاکول چلیں تاکہ کل کا تاثر ختم ہو جائے۔"

اسی طرح کا ایک واقعہ ۱۹۷۷ء کے الیکشن کے بعد ہوا' بھٹو صاحب نے آرمڈ فورسز کے

سربراہوں سے اپنے حق میں ایک مشترکہ بیان جاری کرایا جس میں انہوں نے اعلان کیا تھا کہ ہم حکومت کے ساتھ ہیں نیز یہ بھی کہا تھا کہ الیکشن فیئر ہوئے ہیں' جنرل ضیا یہ بیان جاری کرنے کے بعد غلام اسحاق خان سے کسی کام کے سلسلے میں ملے تو خان صاحب نے ان سے کہا۔

"آپ سے یہ بیان جاری کرنے کو کس نے کہا تھا؟"

"اس میں کیا حرج ہے؟" جنرل ضیا بولے۔

"یہ تو صحیح ہے کہ آپ حکومت کے ساتھ ہیں" غلام اسحاق خان نے کہا۔

"مگر آپ نے یہ کیسے کہہ دیا کہ الیکشن فیئر ہوئے ہیں۔ یہ سرٹیفکیٹ آپ نے کس تحقیقات کے نتیجے میں جاری کیا"

اب معلوم نہیں جہاں خان صاحب بات کر رہے تھے وہاں ایسے آلات لگے ہوئے تھے یا کسی اور ذریعے سے بھٹو صاحب کو اس کی اطلاع مل گئی' وہ خان صاحب کی اس صاف بیانی پر بہت برہم ہوئے۔

جس سیکرٹری سے بھٹو صاحب کے اس طرح کے تعلقات ہوں اس کو اعتماد میں لے کر وہ جنرل ضیا کو ہٹانے کا راز کیسے بتا سکتے تھے؟

ایک سوال یہ بھی پوچھا جاتا ہے کہ بھٹو صاحب مذاکرات کے نتیجے میں طے پا جانے والے سمجھوتے کو بیچ ہی میں چھوڑ کر اس پر دستخط کئے بغیر' بیرون ملک کیسے روانہ ہو گئے؟ اس سفر کے مختلف پہلوؤں پر پچھلے ابواب میں کافی روشنی ڈالی جا چکی ہے' صرف اس نکتے کا اور اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ ہمیں انہوں نے یہ بتایا تھا کہ چونکہ اب نئے انتخابات ناگزیر ہیں' پی۔ این۔ اے سے ان کی تاریخ بھی طے پا گئی ہے اس لئے اب میں بیرون ملک بعض ان سربراہان مملکت سے جو میرے ذاتی دوست بھی ہیں' پیپلز پارٹی کے لئے فنڈز حاصل کرنا چاہتا ہوں' اندرون ملک تو اب سرمایہ دار اور صنعت کار ہمیں کچھ دینے سے رہے۔

بعض لوگوں نے یہ بھی کہا ہے کہ وہ کرنل قذافی سے یہ بات کرنے گئے تھے کہ میں روس کو گوادر کی بندرگاہ دینے کو تیار ہوں' میرے علم میں اس طرح کی کوئی بات نہیں آئی' جو لوگ سفر میں ان کے ہمراہ تھے ان میں آغا شاہی کا معتبر نام بھی شامل ہے' میں نے ان سے پوچھا تو انہوں نے بھی اس طرح کی کسی موو (MOVE) سے لاعلمی کا اظہار کیا' البتہ یہ ضرور ہے کہ قذافی سے بھٹو صاحب کی ان ملاقاتوں میں وفد کا کوئی رکن شریک نہ تھا' وہ دونوں تخلیہ ہی میں مذاکرات کرتے رہے۔

اسی کتاب میں میں نے ایئر مارشل (ریٹائرڈ) محمد اصغر خان کے اس خط کا بھی ذکر کیا ہے جو انہوں نے افواج پاکستان کے آفیسروں کے نام لکھا تھا۔ اس خط کا مکمل متن اردو میں دیا جا رہا ہے۔

۲۵ر اپریل ۱۹۷۷ء

میرا یہ پیغام ڈیفنس سروسز آف پاکستان کے چیف آف سٹاف اور افسروں کے نام ہے۔ آپ کا یہ فرض ہے کہ پاکستان کی علاقائی سالمیت کا دفاع کریں اور خود پر متعین اعلیٰ افسران کے قانونی احکامات کی بجا آوری کریں۔ قانونی اور غیر قانونی احکامات میں تمیز کرنا ہر افسر کا فرض ہے۔ آپ میں سے ہر ایک کو خود سے یہ پوچھنا چاہئے کہ فوج ان دنوں جن سرگرمیوں میں مصروف ہے کیا وہ قانونی ہے؟ اگر آپ کا ضمیر یہ جواب دے کہ یہ سرگرمیاں قانونی نہیں اور پھر بھی انہیں جاری رکھیں تو پھر " آپ اخلاقی طور پر دیوالیہ اور اپنے ملک و قوم کے خلاف سنگین جرائم کے مرتکب ثابت ہوں گے"۔

اب تک آپ یہ جان چکے ہوں گے کہ مشرقی پاکستان میں فوجی ایکشن ایک سازش تھی جس میں موجودہ وزیر اعظم نے شاطرانہ کردار ادا کیا تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ کن حالات میں بلوچستان میں فوجی ایکشن کیا گیا اور یہ ایکشن کتنا غیر ضروری تھا۔ آپ شاید گذشتہ سال دیر صوبہ سرحد میں کئے گئے فوجی ایکشن سے بھی آگاہ ہوں گے۔ اگر آپ کو قومی مفاد سے کوئی دلچسپی ہے تو آپ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ موجودہ الیکشن مہم میں عوام نے موجودہ حکومت کو زبردست طریقے سے مسترد اور نامنظور کر دیا ہے۔ عوام کی طرف سے موجودہ حکومت مسترد کر دینے کے باوجود آپ موجودہ الیکشن کے نتائج پر حیران ہوئے ہوں گے کہ پاکستان قومی اتحاد جسے عوام کی زبردست تائید حاصل ہے صوبہ پنجاب ایک سو سولہ نشستوں میں سے صرف آٹھ نشستیں جیت سکا۔ آپ یقیناً یہ بھی جانتے ہوں گے کہ متعدد لوگوں کو اپنے کاغذات نامزدگی داخل کرنے کا موقع بھی نہیں دیا گیا۔ کیا آپ اسے ایک اتفاقی امر کہیں گے کہ وزیر اعظم اور چاروں صوبوں کے وزراء اعلیٰ کے خلاف کسی شخص نے کاغذات نامزدگی داخل ہی نہیں کئے' جن لوگوں نے کاغذات داخل کرنے کی کوشش کی انہیں چند راتیں پولیس کی حراست میں رہنا پڑا جن میں سے ایک کا ابھی تک سراغ نہیں مل سکا۔

"آپ میں سے جن لوگوں کی ڈیوٹی ۷ر مارچ کے الیکشن کے سلسلے میں متعین کی گئی تھی وہ جانتے ہوں گے کہ دھاندلی کتنے وسیع پیمانے پر ہوئی ہے"۔ قومی اتحاد کے امیدواروں کے لاکھوں بیلٹ پیپروں کو بیلٹ بکسوں میں سے نکال لیا گیا جو ۷ر مارچ کے انتخابات کے بعد پاکستان کی گلیوں اور کھیتوں میں پائے گئے صوبائی انتخابات کے موقع پر ۱۰ر مارچ کو جب قومی اتحاد نے صوبائی انتخابات کے بائیکاٹ کی اپیل کی تھی تو آپ نے ویران اور سحر زدہ پولنگ اسٹیشن دیکھے ہوں گے' اس کے باوجود حکومت کے ذرائع نے اعلان

کیا کہ ووٹ بھاری تعداد میں ڈالے گئے ہیں اور یہ ڈالے گئے ووٹ کل تعداد کا ساٹھ فیصد سے زائد تھے اور پھر آپ نے اس تحریک کا بھی ۔۔۔ کیا ہو گا جو بھٹو کے استعفیٰ اور عام انتخابات کے دوبارہ انعقاد کے لئے چلائی گئی تھی۔

ہاتھوں میں بچے اٹھائے ۔۔۔ عورتوں کا جلوس گلیوں میں نکل آنا ایسا منظر تھا جسے کبھی بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ یہ وہ ۔۔۔ تھیں جن کے متعلق بھٹو کا دعویٰ تھا کہ انہوں نے اسے ووٹ دیئے تھے۔ اس تحریک نے چند دنوں میں یہ بات ثابت کر دی کہ عوام نے بھٹو اور اس کی حکومت کو مسترد کر دیا ہے۔ ہمارے ہزاروں نوجوانوں کی موت' ماؤں اور بہنوں پر تشدد کے واقعات نے آپ کے سر شرم اور غم سے جھکا دیئے ہوں گے۔ کیا آپ نے سوچا کہ لوگوں نے خود کو اتنی مصیبت میں کیوں ڈالا۔ مائیں گود میں بچے لئے گولیوں کا سامنا کرنے کیوں آئیں' والدین نے اپنے بچوں کو پولیس کی گولیوں اور لاٹھیوں کا سامنا کرنے کی اجازت کیوں دی یقیناً اس لئے کہ انہوں نے محسوس کیا کہ ان کے ساتھ دھوکہ اور فراڈ کیا گیا ہے۔ ان کے حکمرانوں نے انہیں قبول کرنے یا مسترد کرنے کا بنیادی حق دینے سے انکار کر دیا ہے۔ جب ہم نے عوام کو سمجھایا تو وہ سمجھ گئے کہ آپ نے مسلح افواج کے افسر ہونے کی حیثیت سے جس آئین کا دفاع کرنے کا حلف اٹھایا ہے اس آئین کی خلاف ورزی کی گئی' اسلامی جمہوریہ پاکستان کے آئین کے آرٹیکل ۲۱۸ (۳) کے مطابق کسی انتخابات کے سلسلے میں تشکیل کردہ الیکشن کمیشن کا فرض ہے کہ وہ الیکشن کے سلسلہ میں ایسے انتظامات کرے جن کے نتیجہ میں ایماندارانہ منصفانہ' آزادانہ اور قانون کے مطابق انتخابات ممکن ہو سکیں' جبکہ وہ اس سلسلے میں بدعنوانیوں کو ختم کرے۔

میرے "دوستو یہ منصفانہ اور آزادانہ انتخابات نہیں تھے" بھٹو نے آئین کی خلاف ورزی کی ہے اور وہ عوام کے خلاف سنگین جرائم کا مرتکب ہوا ہے۔ آپ پر یہ فرض نہیں کہ آپ ایک غیر قانونی حکومت کی حفاظت کریں اور نہ ہی آپ کو ملک کے عوام کو قتل کرنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔ تاکہ بھٹو اپنی حکومت کچھ عرصہ اور برقرار رکھ سکے' کسی کو یہ کہنے کا موقع نہ دیجئے کہ "پاکستان کی مسلح افواج ایک ایسی دیوالیہ پولیس فورس ہے" جن کا کام صرف غیر مسلح شہریوں کو ہلاک کرنا ہے' آپ اس معصوم بچے کو گولی مار کر ہلاک کر دیئے جانے کی کس طرح وضاحت کر سکتے ہیں' جس نے لاہور میں فوج کو V کا نشان دکھایا تھا۔ ہمیں اپنے نوجوانوں میں بزدلی سے زیادہ خود اعتمادی پیدا کرنے کی ضرورت ہے' اور یہ منحوس حادثہ پاک فوج کے نام ایک ایسا دھبہ ہے جس کو صاف کرنا بہت مشکل ہو گا۔

اسی طرح کراچی میں غیر مسلح افراد پر فوج کی فائرنگ بھی ناقابل معافی ہے۔ "کیا آپ یہ نہیں سمجھتے کہ اپنی تاریخ کے تیس بدترین سالوں کے دوران پاکستان بھر کے عوام نے اپنی افواج کیلئے محبت اور خلوص کا جذبہ ظاہر کیا ہے' جب آپ نے مشرقی پاکستان میں ہتھیار ڈالے تو عوام خون کے آنسو روئے۔ انہوں نے ہمیشہ آپ کی عزت کی دعائیں مانگی" انہوں نے خود کو بھوکا رکھا اور اپنے بچوں کو بھوکا مارا کہ آپ کو

پیٹ بھر کر کھانے کو ملے اور آپ کے جنرل اور اعلیٰ آفیسر ایسی زندگی گزار سکیں' جو برطانوی اور امریکی جرنیلوں کو نصیب نہیں۔ مجھے یہ کہتے ہوئے دکھ ہو رہا ہے۔ ۔۔۔ محبت دم توڑ چکی ہے' اب خدارا اسے نفرت میں مت بدلنے دیجئے۔ اگر ایسا ہو گیا' تو یہ ہماری تاریخ کا ایسا سانحہ ہو گا' جس کا تدارک ہم اپنی زندگی میں نہیں کر سکیں گے۔

ایک باوقار شخص کی حیثیت سے آپ کا فرض ہے کہ آپ اپنے فرائض کو انجام دیں۔ موجودہ حالات میں فرائض کا مطلب غیر قانونی احکامات کی اندھا دھند بجا آوری نہیں ہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ قوم کا ہر شخص خود سے یہ پوچھے کہ وہ صحیح کر رہا ہے یا غلط' آپ کے لئے یہ وقت آ گیا ہے' اس اپیل کا ایمانداری سے جواب دیں اور پاکستان کو بچائیں' خدا آپ کی حفاظت کرے۔

محمد اصغر خان

بیسواں باب

بھٹو مودودی ملاقات

پیپلز پارٹی کی عوامی تحریک بالخصوص انتخابات کے دوران بھٹو صاحب کی جماعت اسلامی سے ٹھنی رہی، یوں تو مذہبی محاذ پر "اسلامی سوشلزم" کی اصطلاح کو کفر ٹھہرانے والے علماء کی کمی نہ تھی۔ حضرت مولانا احتشام الحق تھانوی مرحوم ان کے سرخیل تھے۔ کفر کے مشہور فتوے پر علمائے کرام کی دستخطی مہم بھی انہی کی کوششوں کی مرہون منت تھی مگر بھٹو صاحب اس میدان میں اصل حریف جماعت ہی کو سمجھتے تھے۔ اس لئے جہاں انتخابات میں ان کی تنقید کا اصل ہدف جماعت اور مولانا مودودی کی مخالفت کا زور کم کیا جائے۔ شروع شروع میں ان کی سوچ یہ تھی کہ اسے خلاف قانون قرار دے دیا جائے۔ اس کے لئے قدرتاً مجھ سے مشورہ کرنا ضروری تھا، میں نے اس کی مخالفت کی۔ انہیں بتایا کہ جماعت ایک نظریاتی تنظیم ہے اور نظریئے کو کسی بھی طاقت سے ختم نہیں کیا جاسکتا۔ جماعت کو یہ بھی حق حاصل ہے کہ وہ کسی بھی دوسرے نام سے دوبارہ کام شروع کر سکتی ہے، اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ حکومت کی ملکی اور بین الاقوامی سطح پر بدنامی تو ہو جائے گی مگر وہ اس اقدام سے فائدہ کچھ بھی حاصل نہیں کر سکے گی۔ بات ان کی سمجھ میں آگئی اور بعد کے تمام مراحل میں انہوں نے پھر ان خطوط پر سوچنا چھوڑ دیا۔ البتہ اب ان کی خواہش یہ تھی کہ جماعت کو کمیونزم اور سوشلزم کا خطرہ دکھا کر کسی نہ کسی طرح پیپلز پارٹی سے درپردہ تعاون یا کم سے کم اس کی مخالفت ترک کرنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس مقصد کیلئے بعض دوسری تدابیر اختیار کرنے کے علاوہ انہوں نے ایک شریف اور دھیمے مزاج کے بیوروکریٹ افضل سعید خان کی خدمات حاصل کیں جو مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کے قریبی عزیز تھے اور گھریلو تعلقات کی وجہ سے ان سے بروقت رابطہ کرنے کی پوزیشن میں تھے۔

اپنے زمانہ حکومت میں مولانا مرحوم سے بھٹو صاحب نے کس کس موقع پر کیسے رابطہ قائم کیا، ان دونوں کی باہمی ملاقات کیسی رہی، اس وقت یہ تفصیل تو ہمارے موضوع سے خارج ہے البتہ انتخابات کے بعد پیپلز پارٹی کے خلاف ہونے والے ایجی ٹیشن کے دوران حضرت مولانا سے بھٹو صاحب کی ملاقات کے تذکرے کے بغیر یہ کتاب نامکمل رہے گی، میں نے اس کی تفصیلات کی تصدیق حضرت مولانا کے ذہین صاحبزادے عزیزی سید محمد فاروق مودودی سے بھی کر لی ہے جو اس واقعہ کے عینی شاہد ہیں۔

تحریک کے دنوں میں افضل سعید خان مولانا مودودی سے ملتے رہے اور انہیں اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتے رہے کہ وہ بھٹو صاحب سے ملاقات کر لیں لیکن حالات اتنے خراب تھے اور عوام میں بدگمانیاں پھیلنے کا اتنا قوی خدشہ تھا کہ مولانا اس پر آمادہ نہیں ہوئے، بعد میں راؤ رشید نے اپنے دیرینہ تعلقات کو بروئے کار لاتے ہوئے اس وقت کے امیر جماعت اسلامی پنجاب پیر محمد اشرف کو رابطے کا ذریعہ بنایا، پیر صاحب ایک مجلس آراء شخصیت ہیں اور پھر انہیں اس زمانے میں مولانا مودودی کے مزاج میں بھی کافی دخل تھا تو وہ ایک دن راؤ صاحب کے ہمراہ مولانا کی خدمت میں پہنچے اور انہیں منا کر ہی چھوڑا۔ ۱۴ مئی کو ۹ بجے رات ملاقات کا وقت طے ہو گیا۔

۱۴ مئی کا دن ہنگاموں کا دن تھا، لاہور کی پیلی بلڈنگ سے مسلسل فائرنگ ہو رہی تھی۔ ہجوم نے اسے آگ لگا دی۔ شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگے، لاہور سے صوبائی اسمبلی کے رکن اور پی پی پی کے ایک دبنگ رہنما طارق وحید بٹ کی قیادت میں ایک بہت بڑا جلوس نکالا گیا جس سے فضا میں کھچاؤ اور بڑھ گیا، مرنجاں مرنج چوہدری عید محمد کے رتن سینما کو قومی اتحاد والوں نے آگ لگا دی، اسی فضا میں بھٹو صاحب لاہور پہنچے تاکہ وہ مولانا مودودی کو بیچ میں ڈال کر اپوزیشن کو تحریک بند کرنے پر آمادہ کر سکیں۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے لاہور آنے سے پہلے انہوں نے کابینہ کے کسی وزیر سے اس سلسلے میں مشورہ نہیں کیا تھا، اگر ہم سے پوچھتے تو ہم انہیں بتاتے کہ ان کی یہ کوشش کتنی بعد از وقت ہے اتنی کہ اب اگر خود پی این اے بھی تحریک کو ختم کرنا چاہے تو اسے اس میں کامیابی نہیں ہوگی۔

شام کے چھ بجے بریگیڈیئر بشیر سفید کپڑوں میں ۵۔ اے ذیلدار پارک اچھرہ لاہور پہنچے جہاں مولانا مودودی بڑی سادگی لیکن بڑی نفاست سے قیام پذیر تھے مولانا کے صاحبزادے سید محمد فاروق مودودی مولانا کے اے ڈی سی کا درجہ رکھتے تھے، وہ ان سے ملے اور انہیں بتایا کہ بھٹو صاحب ٹھیک نو بجے یہاں پہنچ جائیں گے، ساڑھے آٹھ بجے تو پنجاب پولیس کے آئی جی اور ڈی آئی جی آگئے وہ اس کمرے کا معائنہ کرنا چاہتے تھے جہاں یہ ملاقات ہونے والی تھی ان کا مقصد سکیورٹی کے نقطہ نظر سے تمام انتظامات کا جائزہ لینا تھا۔ فاروق نے یہ کہہ کر ان کی خواہش پوری کرنے سے انکار کر دیا کہ سکیورٹی ہماری ذمہ داری ہے۔ آپ کو "دخل در معقولات" دینے کی ضرورت نہیں، دس منٹ بعد دوبارہ یہ حضرات آگئے اب کے وہ یہ اطلاع دینے آئے تھے کہ بھٹو صاحب سے پہلے راؤ صاحب آئیں گے از راہ کرم انہیں بٹھا دیا جائے، نو بجنے میں تین منٹ تھے کہ پیر اشرف کے جلو میں راؤ صاحب بھی تشریف لے آئے، مولانا کے کمرے سے باہر کے برآمدے میں انہیں بٹھا دیا گیا، فاروق مودودی گرم اور نوجوان خون رکھتے ہیں یوں بھی اس زمانے میں وہ پی این اے کے زبردست موید تھے، پیر صاحب سے الجھ پڑے، پیر صاحب کو چپتے ہی بنی،

ٹھیک نو بج کر دو منٹ پر بھٹو صاحب اپنے ملٹری سیکرٹری جنرل امتیاز کے ہمراہ مولانا کی قیام گاہ پر پہنچے، ایک ڈاکٹر بھی ان کے ہمراہ تھا، فاروق نے آگے بڑھ کر استقبال کیا، راؤ صاحب نے تعارف کرایا تو

بھٹو صاحب نے پوچھا "کیا تعلیم حاصل کر رہے ہو؟"

"کچھ نہیں" فاروق نے جواب دیا۔

"تو کیا کوئی کاروبار کرتے ہو" بھٹو صاحب نے دوبارہ پوچھا

"جی نہ میں پڑھتا ہوں نہ کاروبار کرتا ہوں' پوری قوم آج کل جلسہ جلوس کر رہی ہے میں بھی یہی کام کرتا ہوں" فاروق نے کھردرے انداز میں جواب دیا "پوری قوم آپ کا استعفیٰ مانگ رہی ہے' میں بھی یہی چاہتا ہوں' آپ استعفیٰ کب دے رہے ہیں؟"

بھٹو صاحب کا اس شاندار استقبال پر خون تو کھول اٹھا ہو گا مگر وہ موقع محل دیکھ کر غصہ پی گئے 'ابھی وہ کچھ کہنے کے لئے سوچ ہی رہے ہوں گے کہ فاروق نے نہلے پر دہلا مارا "خیر' آپ مجھ سے تو کیا بات کریں گے آپ تو ایک بہت ہی شریف آدمی سے بات کرنے آئے ہیں۔ چلئے میں آپ کو ان کے پاس لئے چلتا ہوں۔"

مولانا ان دنوں بیمار تھے 'انہیں بخار بھی آ رہا تھا اور جوڑوں میں بھی درد تھا' بھٹو صاحب ان کے ڈرائنگ روم میں جا کر بیٹھے تو پانچ منٹ کے بعد وہ بھی تشریف لے آئے' بھٹو صاحب نے کھڑے ہو کر بڑے ادب سے ان کے ساتھ مصافحہ کیا اور ان کی خیریت دریافت کی' رسمیات کے تبادلے کے بعد دونوں اصحاب بیٹھ گئے 'فاروق ساتھ والے کمرے میں چلے گئے' اب یہ دونوں اکیلے تھے مگر ان کی بات چیت ساتھ کے کمرے میں سنائی دے رہی تھی۔ ملازم سیون اپ لایا تو بھٹو صاحب نے اسے چکھا اور گلاس رکھ دیا' بیس منٹ بعد چائے آئی اس کے ساتھ دوسرے لوازمات بھی تھے لیکن بھٹو صاحب باتیں ہی کرتے رہے۔ انہوں نے کھانے پینے سے احتراز کیا' اب فاروق ان کی آواز سن رہا تھا۔

"میں سفید کاغذ پر دستخط کر کے دینے کو تیار ہوں' آپ اس پر جو لکھنا چاہیں میرے لئے قبول ہو گا" بھٹو صاحب کہہ رہے تھے۔ "میں نے آج سے دو ماہ پہلے کچھ نکات آپ کے سامنے رکھے تھے" مولانا نے فرمایا "وہ وقت تھا اگر آپ اُس وقت انہیں تسلیم کر لیتے تو آپ کا اقتدار بچ سکتا تھا مگر وہ وقت آپ نے ضائع کر دیا۔ آج پیپلز پارٹی کے کارکنوں کو سڑکوں پر لا کر عوام سے ان کا مسلح تصادم کرایا گیا ہے' قوم خانہ جنگی کی صورت حال سے دوچار ہے' اب صرف ایک ہی صورت ہے کہ آپ فوراً استعفیٰ دے دیں ورنہ آپ کی زندگی خطرے میں ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ نے استعفیٰ دے دیا تو میں آپ کی جان بچانے کی کوشش کروں گا"

بھٹو صاحب نے یہ سنا تو انہوں نے ایک طویل تقریر کی' بین الاقوامی صورت حال' امریکہ کا رول' سرحدوں کی نزاکت' یہ سارے موضوعات ان کی تقریر میں شامل تھے۔ پچپن منٹ کی ملاقات میں ان کی یہ تقریر تقریباً پینتالیس منٹ پر پھیلی ہوئی تھی۔ اس دوران مولانا مودودی دس منٹ بولے ہوں گے ان کے آخری جملے بھی وہی تھے جو انہوں نے شروع میں کہے' بھٹو صاحب نے اس کے جواب میں صرف اتنا کہا

"مولانا! میں آپ کی عزت کرتا ہوں' آپ کی ہر بات مان سکتا ہوں مگر استعفیٰ نہیں دے سکتا۔"

ملاقات ختم ہوئی تو مولانا مودودی بھی بھٹو صاحب کے ساتھ باہر نکلے انہیں کار میں بٹھایا اور اندر تشریف لے گئے' باہر موڑ پر ایک ہجوم جمع ہو گیا تھا بھٹو صاحب کی آمد کتنی ہی خفیہ کیوں نہ رکھی جاتی یہ اتنا معمولی واقعہ نہ تھا کہ لوگوں کو اس کی خبر نہ ہوتی۔ مولانا نے پہلے ہی فاروق کے ذریعے باہر جمع ہونے والے لوگوں کو کہہ دیا تھا کہ بھٹو صاحب ان کے مہمان ہیں ان کے خلاف کوئی نعرہ نہ لگنے پائے 'اسلامی جمعیت طلبہ کے جوشیلے کارکنوں سے خطرہ تھا کہ کہیں وہ اس موقع پر کوئی بدمزگی نہ پیدا کر دیں 'ان کا مرکزی دفتر اسی گلی میں کوٹھی نمبر ایک میں واقع تھا' جماعت کے ایک پرانے ہمہ وقتی عہدیدار عبدالوحید خان صاحب کے ذریعے ان کی ڈیوٹی لگا دی گئی کہ وہ مجمع کو ہٹائیں' گلی میں کوئی آدمی نہ رہے' بھٹو صاحب کے کمانڈوز بھی سفید کپڑوں میں گلی میں گھوم پھر رہے تھے لیکن مولانا مودودی کی شرافت سے بعید تھا کہ وہ گھر آئے ہوئے ایک معزز مہمان کی عزت و تکریم میں کسی طرح کا بھی کوئی فرق آنے دیں۔ سو انہوں نے یہ فرق نہیں آنے دیا۔

ادھر یہ ملاقات جاری تھی ادھر منٹوں سیکنڈوں میں ہوا کے دوش پر یہ خبر لاہور کے گلی کوچوں میں پھیل گئی' پندرہ بیس منٹ کے بعد چالیس کے قریب اخباری نمائندے مولانا کی قیام گاہ پر پہنچ چکے تھے' مولانا نے ایک مختصر سا تحریری بیان پڑھا یہ ان کے صاحبزادے کے ہاتھ کی تحریر تھی جس میں صرف اتنا بتایا گیا تھا کہ مولانا مودودی نے بھٹو صاحب کو استعفیٰ دینے کا مشورہ دیا ہے' سوالات کی ایک بوچھاڑ تھی لیکن ان سب سوالوں کے جواب میں مولانا نے صرف اتنا کہا۔

"میں معذرت چاہتا ہوں' میری صحت اس قابل نہیں ہے کہ آپ کے سوالوں کے جواب دے سکوں۔"

اور............لائن کٹ گئی

۳ جولائی اتوار کو کراچی میں ہولناک بارشوں سے ہلاک ہونے والے افراد کی تعداد ساڑھے تین سو تک پہنچ چکی تھی۔ کاروبار زندگی معطل تھا۔ چند روز پہلے تک جو فوجی جوان اپنے جرنیلوں کے حکم پر عوام پر گولیاں برسا رہے تھے' وہی کشتیوں اور دوسرے ساز و سامان کے ذریعے عوام کو محفوظ مقامات تک پہنچانے اور ان کی بھرپور مدد کرنے میں مصروف تھے جس پر لوگ انہیں ہاتھ اٹھا اٹھا کر دعائیں دے رہے تھے۔

ادھر اسلام آباد میں ملک و قوم کی قسمت کے فیصلے کرنے والے ذہن برفباری کی زد میں تھے اور یوں لگتا تھا جیسے سب کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں منجمد ہو کر رہ گئی ہوں۔ بعد دوپہر مفتی محمود نے وزیر اعظم بھٹو کو فون کیا اور کہا کہ وہ اعلیٰ سطحی اجلاس کے لئے اپنے معاونین کے ہمراہ ان سے ملنے آ رہے ہیں چنانچہ وہ بھی اپنے معاونین کو بلالیں مسٹر بھٹو نے انہیں رات کے کھانے کے بعد آنے کے لئے کہا۔ تقریباً دس بجے رات مسٹر بھٹو کے ہمراہ میں اور حفیظ پیرزادہ ایک بار پھر مفتی محمود' نوابزادہ نصر اللہ خان اور پروفیسر غفور احمد کے سامنے بیٹھے تھے۔ مفتی محمود نے بات شروع کی اور بتایا کہ جس شکل میں مسودہ ڈرافٹ کیا گیا تھا پی۔ این۔ اے کی مرکزی کونسل نے اس شکل میں اس کی منظوری نہیں دی۔ مفتی محمود خاصے افسردہ نظر آتے تھے۔

اس موقع پر پروفیسر غفور احمد نے مداخلت کی اور اظہار معذرت کے بعد کہا............

"ہم لوگ بڑی مشکل میں ہیں' یوں لگتا ہے جیسے ہماری صفوں میں کچھ لوگوں کا رابطہ آرمی کے جنرلز کے ساتھ ہو وہ مارشل لاء لگوانے کی دھمکی دیتے ہیں۔"

نوابزادہ نصر اللہ خان بولے............

"آپ ہمارے ہاتھ مضبوط کریں۔ ہم کچھ تکنیکی نوعیت کے نکات لائے ہیں' جو اضافے کا درجہ نہیں رکھتے بلکہ صرف سمجھوتے کو مستند بنانے کے لئے ان کی ضرورت ہے۔"

پروفیسر غفور پھر گویا ہوئے۔ "ہمارے بعض ساتھی کہتے ہیں کہ عمل درآمد کونسل کی آخر آئینی حیثیت کیا ہے' یہ ایک وعدہ ہے' جو وفا ہوا' نہ ہوا۔ وہ کونسل میں آپ کی چیئرمین شپ تسلیم کرنے

پر بھی ہمیں مطعون کرتے ہیں۔"

مفتی محمود کو اپنے معاونین کی جانب سے بھرپور سہارا ملا تو وہ سیدھے ہو کر بیٹھے اور بولے۔

"آپ یوں کریں کہ اس کے لئے آئین میں ایک عبوری شق INTERM CLAUSE کا اضافہ کر دیں جس کے تحت عمل درآمد کونسل کو آئینی تحفظ مل جائے۔"

وزیر اعظم بھٹو نے کہا:

"آپ حضرات جو نکات لائے ہیں مجھے دے دیں۔ میں ابھی اپنے ساتھیوں سے مشورہ کر کے آپ کو اپنے ردِ عمل سے آگاہ کر دیتا ہوں......."

مفتی محمود نے چند کاغذات ان کی طرف بڑھا دیئے اور مسٹر بھٹو اٹھ کر کھڑے ہوئے۔ ان کے ساتھ میں اور حفیظ بھی کیبنٹ روم سے ملحقہ ان کے دفتر میں چلے گئے۔

مسٹر بھٹو نے ایک نظر ان کاغذات پر ڈالی' ہمیں بھی وہ نکات پڑھ کر سنائے اور پھر بولے.........."

"اب تم دونوں کی کیا رائے ہے؟"

"ان نکات میں کوئی نئی بات تو ہے نہیں۔" میں نے جواب دیا.......... "نہ ان سے معاہدے کی شقوں میں اضافہ ہو گا۔ محض تکنیکی نوعیت کے چند سوال ہیں' میرے خیال میں تو ہمیں ان کو قبول کر لینا چاہئے تاکہ آج ہی اکارڈ پر دستخط ہو جائیں اور پھر کوئی ڈیڈ لاک پیدا نہ ہو سکے۔"

وزیر اعظم نے حفیظ کی طرف دیکھا وہ بولے۔

"سر اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ انہیں جھکنے دیجئے۔ یہ بکواس کرتے ہیں کہ ان کے ساتھیوں کے جرنیلوں سے رابطے ہیں.......... کوئی رابطہ نہیں.......... جرنیل آپ کے ساتھ ہیں۔ دراصل ان کے اپنے غبارے سے ہوا نکل چکی ہے' اس لئے یہ ایسی باتیں کر رہے ہیں' انہیں کرنے دیں۔"

میں نے دوبارہ سمجھوتے پر اسی روز دستخط کی ضرورت پر زور دیا تو وزیر اعظم بھٹو بولے..........

"یار گھبراتے کیوں ہو۔ یہ باتیں ہم مان لیں گے' لیکن اتنی بھی کیا جلدی ہے۔ اگر ہم فوری طور پر مان گئے تو یہ لوگ سمجھیں گے ہم کمزور پڑ گئے ہیں۔ انہیں تھوڑا سا انتظار کرانا چاہئے۔"

ان کا فیصلہ سن کر مجھے یکلخت کمرے کا درجہ حرارت نقطہ انجماد سے گرتا ہوا محسوس ہوا۔ میں خاموش ہو گیا۔ وزیر اعظم واپس کیبنٹ روم میں آئے اور اپنی نشست پر بیٹھتے ہی مفتی محمود سے بولے:

"ہمیں مزید مشورے کی ضرورت ہے' اس کے بعد ہی کوئی جواب دے سکیں گے۔"

ان کی بات سن کر مفتی محمود' نوابزادہ نصر اللہ خان اور پروفیسر غفور بے چینی سے پہلو بدل کر رہ گئے۔ تینوں خاموشی سے اٹھے اور انتہائی مایوسی کے عالم میں ہاتھ ملا کر رخصت ہو گئے۔

یہ قومی اتحاد کی مذاکراتی ٹیم سے ہماری آخری میٹنگ تھی جس کے بعد تقریباً نصف شب کے وقت پی۔ ایم ہاؤس کے آڈیٹوریم میں وزیر اعظم بھٹو نے صحافیوں کو خود بریفنگ دی .... ان کا کہنا تھا۔

"طے شدہ سمجھوتے میں اب کوئی تبدیلی نہیں ہوگی' اتحاد نے نئے سرے سے مسائل کھڑے کر کے قوم کو مشکل میں ڈال دیا ہے میں معاملات کو طے کرنے کے لئے ایک حد تک ہی جا سکتا ہوں۔ اتحاد کی مذاکراتی ٹیم نے سمجھوتہ تسلیم کر لیا تھا۔ اب میں وفاقی کابینہ کے اجلاس کے بعد ہی اتحاد کو جواب دوں گا۔"

رات کے تقریباً ساڑھے ۱۲ بجے میں جب پی۔ ایم ہاؤس سے گھر واپس پہنچا تو مجھے بخار کی سی کیفیت محسوس ہو رہی تھی۔ گھر پہنچتے ہی گوجر خان سے رکن قومی اسمبلی راجہ عبدالعزیز بھٹی کا فون موصول ہوا۔ وہ جاننا چاہتے تھے کہ مذاکرات کا ڈول اب کہاں ڈول رہا ہے۔

میں نے انہیں مختصر جواب دیا۔

"آج کی رات بچیں گے تو سحر دیکھیں گے۔"

عزیز بھٹی کے مزید استفسار پر میں نے انہیں بتایا کہ "صورت حال غیر تسلی بخش ہے اور کسی بھی وقت ٹیک اوور کر سکتے ہیں۔"

اسی رات ایک بجے امریکی سفیر آرتھر ڈبلیو ہیمل نے وزیر اعظم بھٹو سے دوبارہ ملاقات کی تھی' جو ہمارے آنے کے بعد ہوئی۔ یہ ایک سربستہ راز ہے کہ اس ملاقات میں امریکی سفیر نے مسٹر بھٹو سے کیا کہا تھا۔ تاہم سننے میں آیا تھا کہ امریکی سفیر نے "ٹیک اوور" کے امکانات ظاہر کئے تھے جس پر مسٹر بھٹو نے اس بات کو بھی امریکہ کی تازہ "دھمکی" سمجھتے ہوئے مسترد کر دیا تھا اگرچہ دل میں انہیں بھی اس کا یقین ہو چلا تھا۔

۴ جولائی کی شام کابینہ کا اجلاس تھا جس میں اتحاد کے پیش کردہ نکات زیر بحث آئے میں نے اس اجلاس میں بھی سمجھوتے پر فوری دستخطوں کے حق میں دلائل دیئے۔ جنرل ضیاالحق بھی اجلاس میں موجود تھے' بھٹو سنجیدہ تھے۔ اجلاس ختم ہوا تو ہم دو چار لوگ کیبنٹ روم کے باہر کھڑے ہو کر گفتگو کرنے لگے۔ مسٹر بھٹو اپنے کمرے میں جا چکے تھے اور جنرل ضیاالحق ان کے ہمراہ تھے۔ وہ تقریباً دس منٹ تک مسٹر بھٹو کے ساتھ رہے میرا خیال ہے مسٹر بھٹو اپنے کمرے میں جنرل صاحب سے امریکی سفیر کی اطلاع کے حوالے سے بات کر رہے تھے۔ جنرل ضیاالحق کمرے سے باہر نکلے تو ان کے چہرے کا رنگ بدلا ہوا تھا اور وہ بے حد عجلت میں نظر آتے تھے۔ ان کی عادت تھی کہ کسی سے ہاتھ ملاتے وقت ایک ہاتھ سے مقابل فریق کا ہاتھ کلائی سے پکڑ کر بڑی گرمجوشی سے مصافحہ کرتے تھے اور کافی دیر ہاتھ تھامے رکھتے تھے۔ اس رات یوں لگا جیسے وہ .... ہاتھ ملا نہ رہے ہوں .... ہاتھ چھڑا رہے ہوں۔ صرف چند انگلیاں ہاتھ سے مس کر کے .... یہ جا .... وہ جا! میں سخت متعجب ہوا مگر سمجھ گیا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔

میں اور میر افضل خان اپنے گھر جانے کے لئے روانہ ہوئے تو غلام مصطفیٰ جتوئی پی۔ ایم ہاؤس ہی میں تھے۔ طبیعت بوجھل ہونے کے سبب میں نے آپریٹر کو بتایا کہ اگر کوئی بہت ہی ضروری کال ہو تو مجھے جگایا جائے ورنہ بتا دیا جائے کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں اور میں سو رہا ہوں۔ تقریباً نو بجے رات وزیر اعظم کے اے۔ ڈی۔ سی کا فون آیا جس پر آپریٹر نے بتا دیا کہ میں طبیعت خراب ہونے کے باعث سو گیا ہوں۔ اگر ناگزیر ہو تو مجھے جگا دیا جائے۔ اے۔ ڈی سی نے وزیر اعظم کو بتایا تو انہوں نے کہا کہ اگر وہ سو گیا ہے تو اسے نہ جگایا جائے۔

نو بج کر بیس منٹ پر غلام مصطفیٰ جتوئی سندھ ہاؤس میں سونے کی تیاری کر رہے تھے تو وزیر اعظم کا فون انہیں بھی پہنچا خاصے خوشگوار موڈ میں انہوں نے پوچھا ....

"کیا پروگرام ہے؟"

جتوئی نے جواب دیا .... "کچھ نہیں سر۔"

وزیر اعظم نے کہا .... "تو پھر یہاں آ جاؤ۔"

دس منٹ کے بعد جتوئی پی۔ ایم ہاؤس میں تھے اے ڈی۔ سی نے انہیں بتایا کہ وزیر اعظم ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرنے والے ہیں۔ پی۔ ایم ہاؤس میں صحافی اور فوٹو گرافر موجود تھے۔ بھٹو لان میں تھے' ان کے ساتھ حفیظ پیرزادہ بیٹھے تھے۔ غلام مصطفیٰ جتوئی بھی ان کے پاس جا بیٹھے۔

مسٹر بھٹو نے اے۔ ڈی۔ سی سے کھر کو ملانے کے لئے کہا لیکن باوجود تلاش کے ملک غلام مصطفیٰ کھر انہیں نہ مل سکے۔ دس بج کر پندرہ منٹ پر ممتاز بھٹو بھی پی۔ ایم ہاؤس پہنچ گئے۔ تب وزیر اعظم نے حفیظ' جتوئی اور ممتاز کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ....

"آج میں معاہدے پر دستخط کر کے اس کھیل کو ختم کرنا چاہتا ہوں۔"

"لیکن سر!" .... حفیظ حیرت زدہ ہو کر بولے "ابھی کل تو ہم نے طے کیا تھا کہ جلدی نہیں کریں گے۔"

"حفیظ شٹ اپ" .... بھٹو نے نہایت سنگین لہجے میں کہا ....

"یہ کافی ہے' میں اسے ختم کرنا چاہتا ہوں"

"ENOUGH IS ENOUGH I WANT TO FINISH IT"

حفیظ نے پھر کہا .... "SIR WHAT WILL HAPPEN THEN?

THESE PEOPLE ARE UNRELIABLE THEY MIGHT RAISE ANOTHER ISSUE WE HAVE TAKEN THE WINDS OUT OF THEIR SAILS THEIR AGITATION HAS PETERED OUT PEOPLE ARE SICK AND TIRED OF THEM THEY CAN NOT RE-START BEFORE THREE OR FOUR MONTHS IF THEY COME OUT AGAIN. THERE IS THE POSSIBILITY OF MARTIAL LAW BUT WE WILL HAVE ENOUGH TIME TO LEVEL SCORE WITH THEM

حفیظ نے پھر کہا

"سر پھر کیا ہو گا؟ یہ لوگ ناقابل اعتبار ہیں۔ یہ کوئی اور مسئلہ کھڑا کر سکتے ہیں۔ ہم نے ان کے غباروں سے ہوا نکال دی ہے۔ ان کی تحریک (ایجی ٹیشن) ختم ہو چکی ہے۔ عوام ان سے تنگ آ چکے ہیں۔ یہ تین چار ماہ سے قبل دوبارہ تحریک شروع نہیں کر سکتے۔ اگر یہ دوبارہ باہر آتے ہیں تو مارشل لاء لگنے کا بھی امکان ہے، لیکن ان کے ساتھ حساب برابر کرنے کے لئے ہمارے پاس کافی وقت ہو گا۔"

معاہدہ پر دستخطوں سے مسٹر بھٹو کو باز رکھنے کے لئے حفیظ کے دلائل کا یہ انداز میں نے خود ان کے الفاظ میں رقم کیا ہے۔ یہ تو حفیظ پیرزادہ ہی بتا سکتے ہیں کہ معاہدے پر دستخطوں سے مسٹر بھٹو کو روکنے کے لئے پرزور بیان وہ کیوں دکھا رہے تھے۔ میری عدم موجودگی میں اس رات ہونے والی اس گفتگو کے راوی جناب غلام مصطفیٰ جتوئی ہیں، جنہوں نے حفیظ کے وہ کبھی نہ بھولنے والے مکالمے ان کے اصل لفظوں میں یاد رکھے تھے۔ مسٹر بھٹو نے حفیظ کی "تقریر دلپذیر" کے بعد جتوئی سے ان کی رائے پوچھی تو انہوں نے حفیظ سے اختلاف کرتے ہوئے کہا "اگر مذاکرات میں تعطل آیا تو پی۔ این۔ اے والے دوبارہ اپنی صفوں کو منظم کر کے عوام کو سڑکوں پر لے آئیں گے۔ حفیظ تو کہتے ہیں کہ مارشل لاء تین چار ماہ میں آئے گا لیکن میرا خیال ہے یہ تین چار ہفتے بھی نہیں لے گا۔"

وزیر اعظم نے آخر میں ممتاز کی رائے دریافت کی تو انہوں نے بھی جتوئی کے خیالات سے اتفاق کیا، جس کے بعد مسٹر بھٹو نے فیصلہ کن انداز میں کہا .... "میں پی۔ این۔ اے کے ساتھ سمجھوتے پر کل دستخط کر دوں گا آج رات کی پریس کانفرنس میں اسی کا اعلان کر رہا ہوں۔"

رات ساڑھے گیارہ بجے پریس کانفرنس شروع ہوئی اور تقریباً ایک گھنٹہ جاری رہی جس میں مسٹر بھٹو نے اعلان کیا کہ وہ سمجھوتے پر دستخط کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں اور کل صبح یہ سمجھوتہ ہو جائے گا۔ انہوں نے صحافیوں کو بتایا "اتحاد کی مذاکراتی ٹیم مزید دس نکات لے کر آئی تھی اور ان لیڈروں نے خود اس پر شرمندگی ظاہر کی کہ وہ نئے سرے سے مسائل کو چھیڑنا نہیں چاہتے تھے۔ لیکن اب مجبور ہو گئے ہیں۔ بہر حال وہ مجبور ہوں گے .... میں نہیں ہوں۔ چنانچہ کل میں سمجھوتے پر دستخط کر دوں گا۔"

جتوئی، ممتاز اور پیرزادہ رات کے تقریباً ڈیڑھ بجے پی۔ ایم۔ ہاؤس سے روانہ ہوئے تھے اور اس وقت تک انہوں نے سڑکوں پر کسی بھی جگہ ٹینک یا فوجی دستے نہیں دیکھے تھے۔ آرمی کے دستوں نے ٹھیک دو بج کر تیس منٹ پر حرکت کی شاید جرنیلوں کو پی۔ ایم ہاؤس سے غیر متعلقہ افراد کے جانے کا انتظار تھا۔ بھٹو اس وقت جاگ رہے تھے جب انہیں رات اڑھائی بجے ممتاز بھٹو کا فون آیا کہ انہوں نے سڑکوں پر آرمی کے دستے گشت کرتے دیکھے ہیں پھر کچھ ہی دیر بعد نور انے اس بات کا نوٹس لیا کہ پی۔ ایم ہاؤس میں ڈیوٹی پر متعین پولیس گارڈز اچانک غائب ہو گئے ہیں لہٰذا اس نے فوراً بھٹو صاحب کو جا کر صورت حال بتائی انہوں نے فون اٹھا کر آپریٹر سے کہا۔

"میجر جنرل امتیاز سے بات کراؤ۔"

اس وقت تک فون کا رابطہ برقرار تھا آپریٹر نے کچھ دیر بعد وزیر اعظم کو آگاہ کیا۔

"جنرل امتیاز کے گھر سے جواب ملا ہے کہ وہ جی۔ ایچ۔ کیو جا چکے ہیں۔"

مسٹر بھٹو نے پھر حکم دیا

"جنرل ضیاالحق سے بات کراؤ۔"

آرمی ہاؤس سے بھی یہی جواب ملا کہ جنرل ضیاالحق جی۔ ایچ۔ کیو میں ہیں۔

مسٹر بھٹو سمجھ گئے کہ کیا ہونے والا ہے۔ انہوں نے آپریٹر سے کہا:

"جی۔ ایچ۔ کیو میں جنرل ضیاالحق سے بات کراؤ"

کافی تاخیر سے جنرل ضیاالحق لائن پر آئے تو مسٹر بھٹو نے کہا:

"یہ کیا ہو رہا ہے؟ میں نے سنا ہے کہ آرمی حرکت میں آ چکی ہے۔ کیا یہ درست ہے؟"

جنرل ضیاالحق نے بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا:

"آپ نے درست سنا ہے سر! مجھے افسوس ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا"

تھوڑی دیر تک صورت حال واضح کرنے کے بعد جنرل ضیاالحق نے مسٹر بھٹو سے دریافت کیا۔

"سر آپ کہاں جانا پسند کریں گے؟ مری، لاڑکانہ یا کراچی؟"

بھٹو نے جواب دیا

"مری" پھر انہوں نے اپنے بیوی بچوں کے بارے میں دریافت کیا تو جنرل ضیاالحق نے جواب دیا۔

"بیگم صاحبہ آپ کے ساتھ جا سکتی ہیں، لیکن بچے لاڑکانہ جائیں گے۔"

مسٹر بھٹو نے کہا ....

"بیگم صاحبہ بچوں کے ساتھ لاڑکانہ جانا چاہتی ہیں"

جنرل ضیاالحق نے جواب دیا ....

"ٹھیک ہے سر! صبح ناشتے کے بعد آپ کو مری پہنچا دیا جائے گا۔"

اس کے بعد رابطہ ختم ہو گیا۔ اس رات آخری فون جو مسٹر بھٹو نے سنا وہ ملک غلام مصطفیٰ کھر کا تھا، جنہیں وہ رات گئے تک تلاش کراتے رہے تھے۔ کھر کا فون جنرل ضیاالحق سے مسٹر بھٹو کی گفتگو کے فوراً بعد آیا۔ شاید کھر کو اپنے ذرائع سے ٹیک اوور کی اطلاع مل چکی تھی۔ وہ شہر میں کسی نامعلوم مقام سے بول رہے تھے۔ انہوں نے ابھی اتنا ہی کہا تھا ....

"سر! میں نے سنا ہے کہ ...."

اور پھر .... ٹیلیفون کی لائن کٹ گئی!

جرنیلوں کی رات کا آغاز ہو چکا تھا!!